ایک نئے مطالعے کی روشنی میں

جدید ایڈیشن اہم اضافوں اور ضروری ترمیمات کے ساتھ

مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی

واقعۂ کربلا

اور اس کا پس منظر

ایک نئے مطالعے کی روشنی میں

جدید ایڈیشن اہم اضافوں اور ضروری ترمیمات کے ساتھ

مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی

الفرقان بکڈپو ۳۱۔ نیا گاؤں مغربی نظیر آباد لکھنؤ

انتساب

والد ماجد حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے نام

جن کے

فیضِ قلب و نظر کے لئے

میری ساری زندگی ممنون ہے

اور

اسی فیض کا اثر میری نظر میں یہ کتاب بھی ہے

جو انھیں کے ارشاد کی تعمیل میں لکھی گئی۔

فہرست

واقعہ کربلا اور اس کا پس منظر

باب ہشتم - ۸

باب نہم - ۹

باب دہم - ۱۰

باب یازدہم-۱۱

باب دوازدہم-۱۲

☆☆☆

دیباچۂ طبعِ سوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن جنوری ۱۹۹۲ء میں نکلا تھا۔ مصنف کے لیے کوئی سوال اس گمان کا نہ تھا کہ چھ مہینے کے اندر ہی دوسرے ایڈیشن کی ضرورت پیش آجائے گی۔ اس لیے دوسرا ایڈیشن جولائی ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا تو اس میں نظرِ ثانی کا وہ ضروری کام بالکل نہ ہو سکا جس کے لیے کچھ مناسب مہلت درکار تھی۔ سوچ لیا گیا کہ جو کام رہ گیا ہے وہ انشاء اللہ تیسرے ایڈیشن میں ہو جائے گا جس کی ضرورت پیش آنے میں شاید زیادہ وقت نہیں لگے گا ____ مگر کتاب کی منجانب اللہ مقبولیت، کہ دوسرے ایڈیشن کے ساتھ ہی ساتھ مختلف مقامات پر ____ خاص طور سے پاکستان میں ____ لوگوں نے مصنف یا پبلشر کی اجازت کے تکلف میں پڑے بغیر ہی اپنے اپنے طور پر اس کے ایڈیشن نکال ڈالے، جن میں سے چار تو خود مصنف تک بھی پہنچے۔ اسکے بعد ظاہر ہے کہ لکھنؤ کے تیسرے ایڈیشن کی نوبت کہاں جلدی آسکتی تھی۔ تاہم اب وہ ضرورت پیش آچکی ہے اور یہ نیا ایڈیشن اب ان تمام اضافوں اور ترمیموں کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ جن کی ضرورت مصنف نے طبع اول کے بعد کتاب پڑھ کر خود محسوس کی یا بعض حضرات کے خطوط سے یہ ضرورت محسوس ہوئی۔

ترمیمات کا حصہ تو بہت معمولی سا ہے جزوی قسم کا ہے۔ البتہ اضافوں میں ایک تو مستقل ایک باب "اختتامیہ" کے عنوان سے آخر میں بڑھایا گیا ہے۔ اس کے بعد ایک مستقل انڈکس ہے جس کی کمی خاص طور پر کتاب میں دلچسپی لینے والے اہلِ علم نے محسوس کی۔ ان دو مستقل اضافوں کے علاوہ باب اول اور باب دوم میں کئی صفحات کا اضافہ ہوا ہے[1]۔ اور بعض مقامات پر حواشی

(۱ حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

بڑھائے گئے ہیں۔

انسان کا کوئی کام نقائص سے سو فی صدی خالی تو کسی منزل پر بھی نہیں ہو پاتا۔ لیکن ان اضافوں اور ترمیموں کے ذریعے کوشش کی گئی ہے کہ کتاب علمی اور تحقیقی حیثیت سے مزید بہتر معیار کو پہنچے اور اپنے موضوع پر زیادہ بہتر علمی و دینی خدمت ثابت ہو۔

کتاب کی اس پذیرائی کے پہلو بہ پہلو جس کی طرف اوپر کی سطروں میں اشارہ گزرا کچھ دوسرے قسم کے تبصرے اور تأثرات بھی سامنے آئے۔ چند الفاظ اس نئی اشاعت کے موقع پر ان کے بارے میں کہنا بھی مناسب ہوگا۔

یہ کتاب جیسا کہ اس کا نام بتا رہا ہے اس چودہ[۱۴] سو سالہ قدیم واقعے کے بارے میں دہی باتیں دہرانے کے لیے تو ظاہر ہے، نہیں لکھی گئی تھی جو باتیں مسلسل لکھی جاتی رہی ہیں اور لوگوں کو ازبر ہیں۔ نام کے اشارے کے علاوہ کتاب کے مقدمے سے اس کی ایک مختلف نوعیت کا بھرپور اظہار بھی ہوتا تھا۔ اس لیے یہ تو عین متوقع تھا کہ کتاب کا استدلال اور اس کا علمی اور تحقیقی انداز کتنا بھی مؤثر ہو جائے، پھر بھی ایک روایتی تصور پر اگر اس سے کہیں ضرب پڑے گی تو ایسے لوگ ضرور ایک تعداد میں نکلیں گے جو ایک مخالفانہ ردّعمل کا اظہار کریں، یا کم از کم کچھ چونکنے کا سا۔ چنانچہ یہ دونوں ہی باتیں سامنے آئیں۔

چونکنے کا سا اظہار کرنے والوں نے یہ تأثر دیا کہ اس میں یزید کی کچھ طرفداری نظر آتی ہے۔ یہ تأثر کتاب کی مجموعی طور پر تحسین کے ساتھ دیا گیا تھا اس لیے کچھ زیادہ ہی قابلِ توجّہ تھا۔ لیکن نظرِ ثانی

---

[۱] (حاشیہ صفحہ گذشتہ کا) باب اول میں دو باتیں خاص طور سے اضافہ طلب تھیں ایک جنگ جمل اور جنگ صفین کا مختصر ذکر آیا تھا تفصیل بالکل نہ تھی جس کی کمی محسوس کی گئی۔ دوسرے جو بعض بڑے صحابہؓ حضرت علیؓ سے بیعت کر لینے کے باوجود ان جنگوں کے سلسلے میں آپ سے متفق نہ تھے ان کے مقابلہ میں حضرت علیؓ کے موقف کی وضاحت بالکل نہ ہو سکی تھی۔ ان دونوں کوتاہیوں کو ان اضافوں کے ذریعہ دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ باب دوم میں کوفیوں کے مزاج و کردار کو کچھ تاریخی حوالوں کی روشنی سے اور زیادہ واضح کیا گیا ہے اختتامیہ میں کتاب کا خلاصہ اور کچھ وضاحتیں ہیں۔

کے لیے کتاب اول سے آخر تک بغور، بلکہ بار بار پڑھنے کے باوجود ہمیں کوئی لفظ اور کوئی عبارت ایسی نہ مل سکی جس میں اس تأثر کی تصدیق کا پہلو نظر آتا ہو اور اس لیے اس پر نظر ثانی کر لی جائے۔ تأثر دینے والے حضرات بھی کسی خاص مقام کی نشاندہی نہ فرما سکے۔ اس لیے ان کے اس تأثر کی بنیاد سوائے اس کے کچھ نہیں سمجھ میں آتی کہ یزید کے سلسلے میں دو باتیں جو روایتی اور سبئینی تصور کے خلاف کافی صراحت اور وضاحت سے آئی ہیں بس وہی ان کو یہ تأثر دے گئی ہیں۔ ۱۔ یہ کہ یزید کے خلاف حضرت حسینؓ کے موقف کے سلسلے میں جو یزید کے فسق و فجور کی بات لائی جاتی ہے اس کا کوئی ثبوت حضرت حسینؓ کی زبان سے بھی نہیں ملتا ۲۔ یہ کہ اس کا ثبوت بھی فی الواقع دستیاب نہیں کہ ابن زیاد نے کربلا میں جو رویہ حضرت حسینؓ کے خلاف اختیار کیا جس سے تاریخ میں کربلا کا المیہ ثبت ہو گیا۔ اس میں یزید کی مرضی بھی شامل تھی اور نہ اس کا کہ اس نے باقیات اہل بیت سے ان کو دمشق پہنچنے پر ناشائستہ برتاؤ بھی کیا۔ اس کی بھی روایتیں ہیں اور اس کے خلاف بھی۔

ان دونوں باتوں کے بارے میں ہم نے اپنے موقف کی ضروری وضاحت اس ایڈیشن کے آخری باب "اختتامیہ" میں کی ہے وہ انشاء اللہ قارئین کی نظر سے گزرے گی۔ یہاں البتہ اتنی بات یاد دلانی مناسب ہوگی کہ یزید کے بارے میں ایسی جو بات بھی لکھی گئی ہے جس سے اس کی روایتی شبیہ میں فرق پڑتا ہے وہ خود ہی بے دھڑک ہو کر نہیں بلکہ واقعی معنیٰ میں "ڈر ڈر کر" لکھی گئی ہے چنانچہ ایسے ایک موقع پر یہ الفاظ بھی قلم سے نکل ہی گئے ہیں کہ:

"یزید کا معاملہ اتنا نازک ہے کہ اس کے حق میں بالکل سیدھی اور معقول بات کہتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔" (ص ۱۳۱ طبع اوّل)

مگر تحقیق واقعہ کی نیت سے کیے جانے والے مطالعے میں جو بات واقعی نظر آتی ہے اسے ایک فریق کے حق میں اس لیے دبا جانا کہ شاید کچھ لوگ ناراض یا بدگمان ہو جائیں، یہ کوئی ایماندارانہ بات تو نہیں ہو سکتی۔ اس لیے "ڈرتے ڈرتے" بھی بات تو کہنی لازم ہو جاتی ہے۔ اور نہ ہی حضرت حسینؓ کی عزت اس پر موقوف ہے کہ یزید کے بارے میں ہر برائی آنکھ بند کر کے مان لی جائے۔

جن لوگوں نے مخالفانہ ردّعمل ظاہر کیا ان میں سے خاص طور سے ایک کا اظہار اس بات کا ایک مثالی نمونہ تھا کہ واقعۂ کربلا کے روایتی تصور سے محبت نے ہمارے خوب اچھے پڑھے لکھے لوگوں کو بھی تبرّائی شیعیت سے کس درجہ ہم آہنگ کر دیا ہے۔ یہ ہماری ایک نامور دینی درسگاہ میں نظامِ تعلیم کی نگرانی کا منصب رکھنے والے ایک عالم و فاضل تھے، جنہوں نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کتاب اور صاحبِ کتاب کو توجو کچھ کہا وہ اپنی جگہ رہا[1]، صاف صاف لکھا کہ واقعہ کربلا بدر کی شکست کا بدلہ تھا۔ اصلی الفاظ یہ تھے:

"..... انھوں (مصنف) نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ تاریخ کا کوئی حادثہ یا واقعہ ماضی سے جدا کر کے ایک اکائی کی شکل میں نہیں دیکھا جا سکتا، کربلا کا واقعہ بنو امیہ اور بنو ہاشم کی دیرینہ عداوتوں کا ایک منطقی نتیجہ (CONSEQUENCE) تھا، وہ عداوتیں جو ظہورِ اسلام کے بعد بہت طاقتور شکل میں ابھر کر سامنے آئیں اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ۲۳ سالہ عرصۂ نبوت میں ۲۱ سال تک بلکہ ساڑھے ۲۱ سال تک شدومد سے قائم رہیں غزوۂ بدر میں مسلمان فوج کی کامرانی نے جس طبقہ کو سب سے زیادہ برافروختہ کیا اسکے سربراہ ابوسفیان تھے اسی طرح غزوۂ احد میں ان کا اور ان کی اہلیہ جگر خوار حمزہ ہند کا کردار یہ سب وہ باتیں ہیں جن میں مؤرخین کا کوئی اختلاف نہیں ہے، فتح مکہ کے بعد یہ گروہ اسلام لایا (یا بقول سید قطب شہیدؒ کے استسلام[2] کیا) مگر اس استسلام کے بعد اچانک ایک پل میں ایسی تبدیلی ہوگئی کہ وہ بدر کا غم بھول گئے، اپنی انانیت کو بھول گئے عقلاً محال بات ہے اور صحاح کی مستند روایات سے ثابت ہے کہ ہندہ نے بیعت کے الفاظ دہراتے ہوئے بھی اپنے اندرونی کرب و غم اور غیظ و غضب کا اظہار کیا تھا۔

.... اسلام کے پورے طور پر فاتح ہو جانے کے بعد جب مقاومت کی تمام راہیں مسدود ہو گئی تھیں اس عرصۂ مختصر میں اس گروہ کی طرف سے

---

[1] اس کے ایک پہلو کا کچھ تذکرہ "اختتامیہ" میں آیا ہے وہاں آپ کی نظر سے گزریگا۔ [2] فی الواقع اسلام نہیں قبول کیا بلکہ بس شکست مانی۔

کسی واضح دشمنی کا ثبوت تاریخ میں نہیں ملتا ہے۔ مگر جس طرح انگریزوں کے دل میں صلیبی جنگوں کا غم و غصہ آج تک موجود ہے اسی طرح اس گروہ میں بدر کے انتقام کا جذبہ سینہ کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح جوش مارتا رہا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت نے البتہ اسلام کی طرف سے ان کے عناد کو ختم کیا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ان کا دل صاف نہیں ہوا۔[عہ]"

اور پھر چند سطروں میں مصنف کو صحیح طریق تحقیق کا مشورہ دیتے ہوئے ان الفاظ پر اسے ختم کیا گیا ہے:

"اس حادثہ کا سرا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد سے نہیں غزوۂ بدر کے واقعات سے مربوط کیا جائے تو تاریخی احداث کی کڑیاں ایک دوسرے سے زیادہ پیوست نظر آئیں گی۔"[۱]

اگر شیعی تبرّائیت دل و دماغ پر حاوی نہ ہو چکی ہو تو آدمی اور بھی کچھ اگر نہ سوچ سکے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں! وہ لوگ جنھیں اہل سنّت کے یہاں بلا شک و شبہ صحابہ اور صحابیات کا درجہ حاصل ہے ان کے بارے میں فتویٰ دے رہا ہوں کہ ان کے دل رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے صاف نہ تھے! کہہ رہا ہوں کہ بدر کے انتقام کی آگ ان کے سینوں میں بھڑکتی رہی تھی اور ان کے اسی جذبۂ انتقام نے کربلا کے حادثے کی شکل اختیار کرلی! (یہ کچھ بھی آدمی اگر نہ سوچے) تب بھی غزوۂ احد کا نام قلم پر آجانے کے ساتھ تو اُسے خیال آہی جانا چاہیے تھا کہ بدر کا انتقام تو اس دوسرے غزوے میں اِن لوگوں نے حالتِ کفر ہی میں لے لیا تھا اور اتنا لے لیا تھا کہ کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے!

ہم نے کتاب کے مقدمہ میں لکھا تھا کہ

"واقعۂ کربلا سے اور جو کچھ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، شیعیّت کو اپنی دوکان چمکانے اور اپنے اثرات پھیلانے کا دہ بے پناہ موقع ملا ہے کہ کچھ کہا نہیں جاتا۔ اور اسی لیے ضرورت ہے کہ نہایت ٹھنڈے دل سے پورے معاملے کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔" (مقدمہ ص۳۲)

عہ گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ [۱] تعمیر حیات۔ لکھنؤ۔ ۱۰ مارچ ۱۹۹۲ء

لیکن یہ بات کہ شیعیت کے اثرات ہماری بڑی بڑی دینی درس گاہوں تک میں اس حد تک داخل ہو گئے ہیں اس کا اندازہ مقدمہ کی اس تحریر کے وقت بھی نہ تھا۔ فالی اللہ المشتکیٰ۔

مصنف کے لیے نہایت اطمینان و مسرت کا مقام ہے کہ محترم ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب (پیرس) جیسے صاحبِ علم و فضل نے کتاب کو اپنی دلچسپی کے اظہار سے نوازا اور بعض گراں قدر مشورے بھی مصنف کو تحریر فرمائے۔

اس قابلِ مسرت بات کا ذکر بطور شکرِ نعمت یا تحدیث نعمت، طبیعت کا تقاضہ تھا۔ مگر اس کے نتیجے میں ضرور قارئین کی طبیعت کا تقاضہ ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب زید لطفہم کی تحریر بھی اُن کے سامنے آئے۔ اس لیے اس سلسلے کے دو خط بھی نذرِ قارئین ہیں۔ آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں[1]۔

عتیق الرحمٰن سنبھلی

لندن ۳۱ر اکتوبر ۱۹۹۸ء

نوٹ: گذشتہ سال بعض حلقوں میں کسی غلط فہمی سے ڈاکٹر صاحب کی خبرِ وفات شائع ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب بحمداللہ تاایں دم (۱/۶/۹۹) حیات ہیں۔ البتہ پیرانہ سالی کے عوارض کے ساتھ۔ قارئین سے دعائے خیر کی درخواست ہے۔

---

[1] ان دونوں خطوط کا بعینہٖ عکس شائع کیا جارہا ہے مگر ڈاکٹر صاحب کاغذ بیحد ہلکا اور بادامی رنگ کا استعمال فرماتے ہیں۔ نتیجے میں عکس اچھا نہ آسکا اسلئے متعدد الفاظ کو پڑھنے کے قابل بنانے کیلئے ہلکا سا ٹچ (TOUCH) بھی دینا پڑا۔ خاص طور سے پہلے خط میں اس کی خاص ضرورت پڑی ہے۔

مکاتیب گرامی

محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب (پیرس)

(۱)

باسمہ تعالیٰ حامداً و مصلیاً

4 Rue de Tournon
Paris - 6 / France

۱۲ / جمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ

مخدوم و محترم زید لطفکم

سلام مسنون و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔

چند دن ہوئے گراں قدر تحفہ "واقعہ کربلا اور اس کا پس منظر" ملا۔ سرفراز کیا۔ بعض دیگر فوری مشغولیتوں کے باعث رسید میں تاخیر ہوئی۔ معاف فرمائیں۔

ما شاء اللہ کتاب معلومات سے پُر ہے۔

دو چیزیں عرض کرتا ہوں ضروری نہیں کہ میری رائے بہتر ہو:

۱) کاش کتاب میں اشاریہ (انڈکس) بھی ہوتا تاکہ تلاش میں سہولت ہو

۲) حضرت عثمانؓ کی شہادت کے سلسلے میں ابن سبا اور اس کے ساتھیوں کی کارروائیوں کا ذکر مناسب ہوتا کہ اس کے نتائج میں سے ایک واقعہ کربلا ہے۔ خاص کر حضرت عثمانؓ کا خط مصر کے والی کے نام کہ محمد بن ابی بکرؓ وہاں پہنچیں تو ان کو قتل کر دیا جائے ([illegible]) یہ ابن سبا کا کام تھا۔

متعکم اللہ و عافاکم

خادم

محمد حمید اللہ

(۲)

بواسطہ ڈاکٹر حامد اللہ

4, Rue de Tournon

Paris-6 / France

۱۹۹۳/۸/۱۲

مخدوم و محترم مد ظلکم

سلام مسنون و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ کافی عرصہ ہوا آپ نے ازراہ کرم اپنی تالیف مجھے بھیج کر میری ممنونیت افزائی فرمائی تھی۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء۔ اب تو یہ بھی یاد نہیں کہ رسید بھیجی یا نہیں۔ میں بیمار رہا۔ تین ہفتے شفاخانے میں رہا۔ اپریشن ہوا۔ اب چند دن ہوئے ہیں کہ گھر آنے کی اجازت ملی لیکن علاج اب تک جاری ہے۔ ان حالات میں ادب سے التماس ہے کہ میرا قصور معاف فرمائیں۔ اب آہستہ آہستہ پرانے قرض ادا کر رہا ہوں۔ آپ کی اہم کتاب کو پڑھنا بھی شروع کیا ہے۔

کیا آپ میرے رسالے "جنگ جمل اور صفین میں یہودیوں کا کردار" سے واقف ہیں؟ اگر ضرورت ہو تو اس کے انگریزی یا پاکستانی ایڈیشن کا عکس تو بسہولت روانۂ خدمت کر سکوں گا۔

نیاز مند

محمد حمید اللہ

دیباچہ طبعِ دوم

یہ کتاب امسال جنوری میں شائع ہوئی تھی، مصنف کسی بنیاد پر بھی یہ توقع نہیں کرسکتا تھا کہ صرف چھ ماہ کے اندر اس کے دوسرے ایڈیشن کی نوبت آجائے گی۔ یہ محض اللہ ربّ العزت کا کرم ہے کہ جولائی میں دوبارہ پریس کو جا رہی ہے۔

ناشرین نے مجھ سے چاہا کہ اگر پہلے ایڈیشن کی طباعت میں کچھ غلطیاں رہ گئی ہوں یا کوئی ضروری ترمیم معمولی قسم کی ہو تو اس کی فہرست انھیں مہیا کر دی جائے۔ میری نظر میں جو ایسی چیزیں آئی تھیں ان کی فہرست تیار تھی، وہ ناشرین کے حوالے کی جا رہی ہے۔ امید ہے کہ یہ دوسرا ایڈیشن ان تصحیحات اور ترمیمات کے ساتھ قارئین تک پہنچے گا۔ بعض کچھ ضروری اضافے بھی ذہن میں تھے لیکن اس وقت جو عجلت ناشرین کے پیشِ نظر ہے اس کی بنا پر یہ کام آئندہ کے لیے مؤخر رہے گا۔

شکر اور اعترافِ کرم کے ساتھ اللہ ہی سے شکوہ بھی ہے کہ ایسے لوگوں کی طرف سے کتاب کے خلاف محاذ آرائی ہوئی ہے جن کے بارے میں محاذ آرائی تو کیا سادہ سی مخالفت کا اندیشہ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ چیز جہاں رنج والم کی ہے وہاں اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کتاب کی جو ضرورت اس کے مقدمے میں بتائی گئی تھی وہ نہ صرف واقعی تھی بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ بڑے اور وسیع درجے کی تھی جس درجے کی مقدمے میں ظاہر کی گئی تھی۔ انشاءاللہ اس پر مزید روشنی

کتاب کے کسی اگلے ایڈیشن میں ڈالی جا سکے گی۔

وَالسّلام !

عتیق الرحمٰن سنبھلی

یکم محرم الحرام ۱۴۱۳ھ

مطابق ۳؍ جولائی ۱۹۹۲ء

۱۱/۴۸ حوض رانی ایکسٹینشن۔ نئی دہلی ۱۷

افتتاحیہ

از والد ماجد حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

یہ کتاب، جیسا کہ آئندہ صفحات سے معلوم ہوگا، راقم مصنف کے والد ماجد حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی خواہش کا نتیجہ ہے، کتاب مکمل ہو جانے پر راقم نے گزارش کی کہ اگر مناسب خیال فرمایا جائے تو چند دعائیہ کلمات املا فرما دیئے جائیں جن سے کتاب کا آغاز ہو، ذیل کی املائی تحریر میری اسی خواہش کا نتیجہ ہے ۔۔۔ عتیق الرحمٰن سنبھلی]

باسمہٖ سبحانہٗ و تعالیٰ ۔ حمداً و سلاماً

اس عاجز (محمد منظور نعمانی) کا وطن سنبھل (مرادآباد، یوپی) ہے۔ ۱۳۲۳ھ (۱۹۰۵ء) سن پیدائش ہے۔ سنبھل مسلمانوں کی غالب اکثریت کی بستی ہے اور یہ سب سُنّی حنفی ہیں۔ صرف ایک محلے میں جو شہر کے کسی کنارے پر ہے اور جسے میں نے آج تک دیکھا بھی نہیں ہے شیعہ صاحبان کی بھی کچھ آبادی ہے۔ یوں تو ہندوستان میں کم و بیش سبھی جگہ سُنّیوں کے اندر بھی تعزیہ داری کا رواج سرایت کیے ہوئے ہے۔ لیکن میرا خیال ہے ۔۔۔ اور دوسرے لوگوں نے بھی اس کی تصدیق کی ہے ۔۔۔ کہ سنبھل کے سُنّیوں میں جس شان سے عزاداری منائی جاتی ہے اس شان کی عزاداری شاید ہی کہیں اور ہوتی ہو۔

بچپن کی باتیں

مجھے ۶۔۷ سال کی عمر سے پورا شعور ہو گیا تھا اور اُن چند برسوں کو چھوڑ کر جو تعلیم کے سلسلے میں باہر گزرے تقریباً تیس سال کی عمر تک زیادہ تر قیام وطن ہی میں رہا۔ ہمارا محلہ خالص سُنّی مسلمانوں کا محلہ ہے۔ اس کے اندر ۲۰۔۲۵ گھروں میں تعزیے رکھے جاتے تھے، جن پر محرم کی پہلی

سے دسویں تک برابر چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے۔ جن گھروں میں بچے کم زندہ رہتے تھے ان گھروں میں امام حسینؓ کا فقیر بنایا جاتا تھا اور ہرے کپڑے پہنائے جاتے تھے، ہمارا ننہال اس معاملے میں بہت آگے تھا۔ ایک قریبی رشتے کے ماموں فقرو کے نام سے مشہور تھے۔ میں بڑا ہو کر بھی ایک مدت تک یہ سمجھتا رہا کہ ان کا نام اصل میں فخرالدین یا فخرالحسن ہوگا اور فقرو کہا جانے لگا، بعد میں معلوم ہوا کہ اصل نام تو انوار حسین ہے لیکن بچپن میں امام حسینؑ کے فقیر بنا دیئے گئے تھے اسی سے فقرو کہے جاتے ہیں۔

سنبھل کے ڈھول

سنبھل کی تعزیہ داری کی دو خصوصیتیں شاید اپنا جواب نہ رکھتی ہوں گی۔ ایک تعزیوں کی اونچائی (بعض تو تقریباً چالیس فٹ اونچے ہوتے تھے) اور دوسرے ڈھولوں کا سائز۔ بعض ڈھول تو اتنے بڑے ہوتے تھے کہ ان کے لیے گائے یا بھینس کی بہت بڑی کھال تلاش کرنا پڑتی تھی۔ ان میں سے بعض کے اندر سے آدمی کھڑا نکل آتا تھا اور بچے تو تقریباً سبھی ڈھولوں کے اندر سے اسی طرح نکل جاتے تھے۔ ہمارے خاص محلے میں کئی ایسے ڈھول تھے مگر ایک ڈھول جو چوک کا ڈھول کہلاتا تھا وہ ان میں سب سے بڑا تھا اور چونکہ ہمارے نانا کا مکان چوک میں واقع تھا اس لیے اس کو ہم اپنا ڈھول سمجھتے تھے اور اس پر فخر کیا کرتے تھے۔

عشرۂ محرم کے معمولات

محرم کا مہینہ آیا اور ہر ذی استطاعت گھر میں لازم ہوگیا کہ پہلی سے دسویں تک روزانہ کوئی میٹھی چیز پکے۔ عموماً میٹھے چاول یا حلوہ یا مالیدہ۔ اور مغرب کی نماز سے کچھ پہلے یا بعد میں گھر کا کوئی آدمی گھر کے دروازے پر وہ میٹھا پکوان لے کر کھڑا ہوتا اور بچوں میں تقسیم کرتا۔ روزمرہ کے اس دس روزہ عمل سے چند ہی گھر محلے میں مستثنیٰ ہوں گے، انھیں میں سے ایک ہمارا گھر بھی تھا۔ ہمارے

گھر جو کچھ ہوتا تھا اس کا ذکر آگے آئے گا۔

محلّے کا ایک گھرانہ رافضیوں کا گھرانہ ہی کہلاتا تھا۔ اگرچہ تھے وہ سُنّی۔ ان کے یہاں امام باڑہ تھا جس میں ایک کاٹھ کا تعزیہ رہتا تھا۔ ان کے یہاں اِن دس دنوں میں رات کو مجلس ہوتی تھی، اختتامِ مجلس پر حاضرین کو قیمہ رکھی ہوئی ایک (یا دو) تندوری روٹی بطور تبرک ملتی تھی۔ دسوں دن برابر یہ سلسلہ چلتا تھا۔ اس دس روزہ مجلس کے علاوہ کم از کم ایک دن تو اس طرح کی مجلس اکثر گھروں میں ہی ہوا کرتی تھی۔ خود ہمارے گھر میں بھی یہ مجلس ۹ر اور ۱۰ر کی درمیانی شب (یعنی شبِ شہادت) میں ہوتی تھی۔

ہمارے گھر کی مجلس

والد ماجد مرحوم تعزیہ داری کے سلسلے کی چیزوں میں تو شرکت نہیں کرتے تھے بلکہ ایک حد تک اسے صحیح بھی نہیں سمجھتے تھے، مگر ۹ر محرم کو شب کی مجلس بڑے اہتمام سے کراتے تھے جیسے کہ ۱۱ر یا ۱۲ر ربیع الاول کو مجلسِ میلاد شریف اہتمام سے ہوتی تھی۔ میلاد میں تو مٹھائی (جلیبی یا لڈّو) گھر ہی پر حلوائی بلوا کر بنوائی جاتی تھی۔ بازار سے اس موقع کے لیے مٹھائی خریدنا والد ماجد پسند نہیں فرماتے تھے اور مجلسِ شہادت کے لیے ایک بکرا خود خرید کر لاتے تھے اور اس کا پلاؤ پکوایا جاتا تھا جو اہلِ مجلس میں تبرّکاً تقسیم ہوتا۔ اس ضمن میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ہمارے یہاں بکرے کے گوشت کا رواج شادیوں تک میں بھی نہ تھا، عام طور سے گائے کا گوشت ہی استعمال ہوتا تھا لیکن مجلسِ شہادت کے لیے ہمارے گھر یہ خصوصی اہتمام برتا جاتا تھا۔ ایامِ عزا کی یہ مجلسیں ہمارے حقیقی ماموں حافظ سعید احمد مرحوم (اپنی پارٹی کے ساتھ) پڑھا کرتے تھے۔ ان مجلسوں کا ایک شعر اب تک یوں یاد ہے کہ ؎

خدا کے نور سے پیدا ہوئے یہ پنجتن　　محمدؐ و علیؑ و فاطمہؑ حسینؑ و حسنؑ

کچھ اپنا رونا رُلانا

جیسا کہ اوپر عرض کر آیا ہوں، مجھے ۶، ۷ سال کی عمر میں پورا شعور آگیا تھا، مجلسوں میں جو کچھ

سنتا تھا اسے سمجھتا تھا۔ واقعۂ شہادت کو سن کر خوب رویا کرتا تھا بلکہ اتنی دلچسپی اس واقعہ سے ہو گئی تھی کہ عشرۂ محرم کے علاوہ بھی جو اس دلچسپی کا خاص موسم ہوتا ہے میں نانا کے گھر جاتا اور جس کتاب سے ماموں صاحب شہادت کے واقعات پڑھا کرتے تھے اُس کتاب کو لے کر پڑھتا اور روتا جاتا تھا۔ یہ بات ۹، ۱۰ سال کی عمر کی ہے۔

جہاں تک یاد کرتا ہوں میرا حال یہ تھا کہ حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ وغیرہ اصحاب کرام کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ دنیا کی اور اسلام کی سب سے بڑی شخصیت بس حضرت حسینؓ کو سمجھتا تھا اور سب سے بڑا خبیث یزید کو جانتا تھا۔ اس سلسلے کا ایک لطیفہ بھی ہے۔ غالباً عمر کا آٹھواں سال تھا جبکہ میں قرآن مجید ناظرہ پڑھ رہا تھا، پندرہویں پارہ میں سورۂ بنی اسرائیل کی جب وہ آیت آئی جس میں وَلَا یَزِیدُ الظّٰلِمِینَ اِلَّا خَسَارًا۔ آتا ہے تو میں نے دل میں سوچا کہ اُفوہ! یزید ایسا خبیث تھا کہ اللہ میاں نے اس کو ظالمین — یعنی بہت بڑا ظالم — کہا ہے۔ یہ بھی یاد ہے کہ اس پر دل میں یہ شبہ پیدا ہوا کہ حضرت حسین کی شہادت کا واقعہ تو بہت بعد کا ہے، قرآن مجید میں اس کا ذکر کیسے آگیا؟ اور پھر اس کا جواب بھی دل میں یہ آگیا کہ اللہ میاں تو سب کچھ جانتے ہیں، انھیں خبر تھی کہ یزید اتنا بڑا ظالم ہوگا اس لیے انہوں نے مسلمانوں کو پہلے ہی سے خبردار کر دیا۔

تبدیلی کا آغاز

میرے ایک قریبی رشتے کے نانا حضرت مولانا کریم بخش صاحب سنبھلیؒ تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے اور صاحب درس تھے۔ میری عمر جب ۱۴-۱۵ سال ہوئی تو تعلیم کے سلسلے میں مجھے ان کے سپرد کر دیا گیا اور پھر تین سال تک جہاں وہ اپنی تدریسی ذمہ داری کے سلسلے میں رہے میں ان کے ساتھ ہی رہا۔ یہ پہلی صحبت تھی جس کی بدولت مجھے دین کی کچھ سمجھ آئی اور جو باتیں ماحول کے اثر سے خواہ مخواہ دین بن کر ذہن میں جم گئی تھیں ان کی حقیقت مجھ پر ظاہر ہوئی۔ اس کے بعد تعلیم کی تکمیل کے لیے دو سال دار العلوم دیوبند میں رہنا نصیب ہوا۔ الحمد للہ کہ میری

تعلیم کے اس پانچ سالہ دور میں والد ماجد کے خیالات میں بہت کافی تبدیلی آگئی۔ اب ہمارے گھر میں رسمی مجلسِ میلاد کی جگہ بیانِ سیرتِ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس ہوتی تھی اور عاشورہ کی مجلس میں شہادت ناموں کے بجائے ہمارے بڑے بھائی مولوی محمد حسن صاحب مرحوم تاریخ ابن خلدون کے اردو ترجمے[1] سے واقعۂ کربلا کا بیان پڑھتے اور میں کچھ زبانی بیان کیا کرتا تھا ـــ لیکن واقعہ کے سلسلے میں تصوّر وہی تھا جو سنی سنائی باتوں سے قائم ہوگیا تھا۔ کبھی خود براہ راست تاریخی کتابوں کا مطالعہ کرکے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ قصے کی واقعی حقیقت کیا تھی۔

شہرتِ عام کی تاثیر

۱۳۵۳ھ (۱۹۳۴ء) میں بریلی میں قیام اختیار کرکے الفرقان جاری کیا۔ الفرقان کے ربیع الاول کے شمارہ میں اکثر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کچھ لکھا جاتا اور اس کے لیے میں سیرت اور احادیث کی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتا تھا ـــ لیکن واقعۂ کربلا کے سلسلے میں جہاں تک یاد ہے میرا سب سے بڑا ماخذ بس مولانا آزاد کا مضمون شہید کربلا تھا جو الہلال کے فائل میں میرے پاس موجود تھا۔ اس سے زیادہ تاریخی مطالعہ کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی۔ یا یوں کہیے کہ شہرت عام کے اثر سے جو ذہن اس مسئلہ میں بن گیا تھا اُس نے یہ ضرورت محسوس ہی نہ ہونے دی اور واقعہ یہ ہے کہ شہرت عام ایسی ہی طاقتور چیز ہے خواہ وہ کسی کے حق میں ہو یا کسی کے خلاف۔ اس کی ایک بہت قریبی مثال شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی (متوفی ۱۲۰۶ھ) اور ان کی جماعت کے بارے میں بہت سے نہایت قابل احترام اکابر علماءِ حق کا رویّہ ہے۔ ان میں سرفہرست

---

[1] میری یادداشت کے مطابق مترجم الٰہ آباد کے کوئی صاحب تھے اور انہوں نے لکھا تھا کہ اس واقعہ (واقعۂ کربلا) کے بیان میں اصل کتاب (تاریخ ابن خلدون) کے اندر کچھ نہ تھا بلکہ چند صفحات خالی چھوٹے ہوئے تھے اور ترجمہ میں واقعہ کا بیان جو بہت طویل تھا مترجم نے دوسری کتابوں کی مدد سے از خود لکھا ہے۔ اب مولوی عتیق الرحمٰن نے اصل کتاب دیکھ کر بتایا ہے کہ ابن خلدون نے ۶ صفحات خالی چھوڑے تھے جن کی کمی کو مترجم نے ۶۵ صفحے لکھ کر پورا کیا ہے اور مترجم کا نام حکیم احمد حسین الٰہ آبادی (مرحوم) ہے۔

ہیں کہ مکہ مکرمہ کے مشہور عالم و محدث اور محقق شیخ احمد زینی دحلانؒ۔ نیز خود ہمارے اکابر میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ــــ شرک و بدعت کے خلاف شیخ محمد ابن عبدالوہاب کے بے لاگ موحدانہ جہاد نے (نیز سیاسی میدان میں آل سعود کے لیے ان کی حمایت نے) مخالفانہ پروپیگنڈہ کا وہ طوفان اٹھایا کہ ہر بری سے بری بات ان کے حق میں لائق یقین بن گئی ــــ اس کی تفصیل کے لیے اس عاجز کی کتاب "شیخ محمد ابن عبدالوہاب کے خلاف پروپیگنڈہ اور علماء حق پر اس کے اثرات" دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ شیخ احمد زینی دحلانؒ نے اپنی کتاب "خلاصۃ الکلام" اور "الدرر السنیۃ فی رد الوہابیۃ" میں ان کی طرف ایسی باتیں منسوب کی ہیں جن کی بنیاد پر ان کو یہود و نصاریٰ وغیرہ کافروں سے بھی بدتر درجہ کا کافر قرار دینا صحیح اور برحق ہوگا۔ اور اسی طرح کی باتیں ہمارے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے رسالہ "رجوم المذنبین" میں تحریر فرمائی تھیں لیکن بعد میں حضرت مدنیؒ نے ایک اخباری بیان کے ذریعہ اعتراف فرمایا کہ انہوں نے "رجوم المذنبین" میں جو کچھ اس سلسلے میں لکھا تھا وہ عام شہرت ہی کی بنیاد پر لکھا تھا۔

الفرقان ۱۳۷۳ھ کا مضمون

الغرض واقعۂ کربلا کے سلسلے میں اپنا ذہن پرانا ذہن چلتا رہا جو اس عام اور روایتی تصور سے بہت زیادہ مختلف نہیں تھا جس کا کچھ ذکر اوپر کی سطروں میں آیا ہے حتیٰ کہ شوال یا ذیقعدہ ۱۳۷۳ھ کی بات ہے کہ میں کسی لمبے سفر پر جانے کی تیاری کر رہا تھا جبکہ اجین (مدھیہ پردیش) کے ایک صاحب کا خط آیا جو الفرقان کے بہت قدرداں تھے، انہوں نے لکھا تھا کہ محرم کا مہینہ آنے والا ہے، اس میں الٹے سیدھے شہادت نامے پڑھے جاتے ہیں اور غلط سلط روایتیں دہرائی جاتی ہیں۔ جی چاہتا ہے الفرقان میں اس موضوع پر کوئی مستند قسم کا مضمون آجائے اور ہم کوشش کریں کہ ہمارے یہاں مجلسوں میں وہی پڑھا جانے لگے۔ ـ میں یہ ذمہ داری مولوی عتیق الرحمٰن کے سپرد کر کے اپنے سفر پر روانہ ہوگیا تھا مولوی عتیق الرحمٰن نے "واقعہ کربلا" کے عنوان سے یہ مضمون لکھا اور ذی الحجہ ۱۳۷۳ھ کے الفرقان میں شائع

ہو گیا، میں سفر سے واپس آیا اور یہ مضمون پڑھا تو اس کی دو باتوں کی وجہ سے تن بدن میں آگ ہی تو
لگ گئی، غصے سے میرا دماغ کھول اٹھا۔ ان باتوں میں سے ایک یہ تھی کہ سیدنا حسینؓ کے اقدامات
کے لیے بغاوت کا لفظ اس مضمون میں استعمال کیا گیا تھا۔ دوسری بات مضمون کا یہ بیان تھا کہ
جب حضرت حسینؓ کوفے کے قریب پہنچ کر اس حقیقت سے آگاہ ہوئے کہ کوفے والے غداری کر گئے ہیں
اور پھر یزیدی لشکر کے پہنچ جانے سے آپ کے لیے واپسی کا راستہ بھی نہ رہا تو یزیدی سالار عمر بن سعد کے سامنے
آپ نے تین شکلیں رکھی تھیں کہ ان میں سے کسی کو قبول کر لیا جائے جن میں سے ایک یہ تھی کہ "انھیں
یزید کے پاس جانے دیا جائے تاکہ وہ براہ راست اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدیں۔"

میں یزید کو جتنا بڑا ظالم خبیث اور نابہنجار ساری عمر سے جانتا آرہا تھا اس کی بنا پر میرے
نزدیک یہ ناممکن بات تھی کہ حضرت حسینؓ ایسی پیش کش فرمائیں، حضرت حسینؓ کے لیے یہ بات سوچنی
بھی میرے لیے محال تھی۔ میں غصّہ میں اٹھا اور مولوی عتیق کے گھر کی طرف کو روانہ ہوا تاکہ ان سے
باز پرس کروں کہ یہ کیا لکھ دیا ہے؟

سَو قدم کے قریب چلا ہوں گا کہ لفظ بغاوت کے بارے میں یہ بات ذہن میں آئی کہ بغاوت
ہر جگہ تو معیوب نہیں ہے بلکہ اگر ایک ظالمانہ اور کافرانہ نظام کے خلاف ہو تو ایک طرح کا جہاد ہے۔
آخر ۱۸۵۷ء میں ہمارے بزرگوں نے انگریزوں کے خلاف جو کچھ کیا تھا وہ بغاوت ہی تو تھی جس پر
ہم آج بھی فخر کرتے ہیں۔ البتہ یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دینے والی بات ویسی ہی ناقابلِ قبول بنی
رہی، میں اسی حال میں مولوی عتیق کے گھر پہنچا اور بڑے غصّے کے ساتھ ان سے پوچھا کہ تم نے یہ
بات کیسے اور کہاں سے لکھ دی؟ مولوی عتیق کے پاس اس طرح کے غصّے کے کچھ خطوط پہلے
ہی آچکے تھے اور وہ اس سلسلے میں ایک دوسرے مضمون کی تیاری کر چکے تھے۔ اس کے لیے
انہوں نے تاریخ کی متعدد کتابوں سے عبارتیں اور حوالے نقل کر کے رکھے ہوئے تھے انھیں دیکھ کر
مجھے بھی ماننا پڑ گیا کہ پھر تو غلط نہیں لکھا ہے۔

یہ کتاب | اس واقعے پر تقریباً تیس سال گزر گئے تھے کہ آج سے ۷-۸ سال پہلے جب میری

کتاب "ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت" شائع ہوئی تو بعض مخلص دوستوں نے توجہ دلائی کہ جس مقصد سے یہ کتاب لکھی ہے اسی مقصد کی خدمت کے لیے یہ بھی مفید ہوگا کہ مولوی عتیق الرحمٰن صاحب کا مضمون "واقعۂ کربلا" اور اس کے بعد کا وضاحتی مضمون بابت محرم ۱۳۹۲ھ بھی کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے۔ میں نے اس رائے کو پسند کیا اور ۱۹۸۷ء میں جب مولوی عتیق الرحمٰن کا ہندوستان آنا ہوا تو میں نے ان سے کہا کہ وہ پرانی فائل سے اپنے وہ دونوں مضمون نکلوا کر ایک نظر ڈال لیں اور کتب خانہ الفرقان کے حوالے کر دیں۔ مگر ان کی رائے یہ ہوئی کہ اس مسئلہ پر تو اب بالکل از سر نو لکھا جانا چاہیئے۔

یہ کتاب جو اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے اس کی اساس تو وہی ۱۹۷۳ء اور ۱۹۷۴ء کے مضامین ہیں لیکن عزیز مصنف نے اس پر نظر ثانی میں جو نئی محنت کی ہے اس نے اسے ایک بالکل نئی چیز بنا دیا ہے۔ کتاب کے مشتملات میں سے مجھے خاص طور پر اس کے آخری باب میں آنے والے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے اقتباس کی بابت یہ عرض کرنا ہے کہ اس اقتباس نے خود مجھے بڑا اہم فائدہ پہنچایا ہے۔ حضرت مسلم بن عقیلؓ کی شہادت کی خبر پانے پر واپسی کے ارادے کے بعد بھی صرف بعض برادران مسلم بن عقیلؓ کی دلداری میں حضرت حسینؓ کے سفر جاری رکھنے پر مجھے ایک خلش تھی۔ اللہ تعالیٰ شیخ الاسلام کو اور اس کتاب کے عزیز مصنف کو جزائے خیر دے کہ شیخ الاسلام کے اس اقتباس میں اس خلش کے رفع ہونے کا سامان مل گیا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو اپنے بندوں کے لیے نافع بنائے اور اگر اس میں کوئی بات غلط آگئی ہو تو اس کے اثر سے بندوں کی حفاظت فرمائے نیز عزیز مصنف کو اس سے رجوع کی توفیق بخشے۔ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

مقدّمہ[1]

(طبعِ اوّل)

مصحفی ہم تو سمجھتے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بڑا کام رفو کا نکلا

۱۳۷۲ھ م ۱۹۵۳ء کی بات ہے۔ ماہنامہ الفرقان (لکھنؤ) کی ترتیب وادارت کی نئی نئی ذمہ داری اٹھائی تھی[2]۔ ایک اجنبی کی فرمائش آئی کہ محرّم کا مہینہ قریب آرہا ہے سانحۂ کربلا (شہادت حضرت حسین ابن علی رضؓ) کے سلسلے میں غلط سلط روایات والے شہادت نامے اس ماہ مسلمانوں میں پڑھے جاتے ہیں۔ جن سے کتنے ہی ناروا خیالات وعقائد پھیلتے ہیں۔ الفرقان میں اگر ایک مستند مضمون اس موقع پر واقعۂ کربلا کے موضوع پر آجائے تو مفید ہوگا۔ غالبًا یہ فرمائش الفرقان کے مدیرِ اعلیٰ میرے والد ماجد (مولانا محمد منظور نعمانی) کے نام آئی تھی۔ مجھے حکم ہوا کہ لکھو۔

والد ماجد کے کتب خانے ہی میں ایسی کتابوں کی جستجو شروع کی جن کی مدد سے یہ فرمائش پوری کی جاسکے۔ ایک مصری مصنّف کی کتاب ہاتھ آئی جو بہت قابلِ اعتماد اور قابلِ بھروسہ محسوس ہوئی (نام نہ اب کتاب کا یاد ہے نہ مصنّف کا) اس کتاب کی روشنی میں "واقعۂ کربلا" کے عنوان سے ایک مضمون تیار کر کے ذی الحجہ ۱۳۷۲ھ اگست ۱۹۵۳ء کے الفرقان میں دے دیا گیا۔

مضمون میں کوئی بہت خاص بات نہ تھی۔ واقعے کا سادہ سا بیان تھا اور اس معاملے میں جو فکری اور عملی بے اعتدالیاں شیعیت کے اثر سے یا اس کے ردِّ عمل کے طور پر پیدا ہوگئی ہیں اُن کے سلسلے میں اپنے

---

[1] نظرِ ثانی کے بعد۔ [2] ماہنامہ الفرقان مصنّف کے والد ماجد مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے ۱۹۳۴ء میں ہندوستان کے معروف شہر بریلی سے جاری کیا تھا۔ ۱۹۴۶ء میں اسکو لکھنؤ منتقل کر دیا اور آج بھی شائع ہوتا ہے۔

فہم کے مطابق نقطۂ اعتدال واضح کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ تاہم ایک بات نے اس کو "معرکہ انگیز" بنا دیا اور وہ ایک روایت تھی، جس کے مطابق حضرت حسینؓ نے میدانِ کربلا میں بہ صورتِ حال دیکھ کر کہ کوفہ کے جن لوگوں کی خواہش اور باصرار دعوت پر آپ نے ادھر کا سفر کیا تھا، ان میں کتنے ہی لوگ اس فوج میں تو شریک ہیں جو آپ کے خلاف کاروائی کے لیے کوفے کے یزیدی گورنر ابن زیاد نے بھیجی ہے مگر آپ کی حمایت کے لیے نکل کر آنے والا کوئی نہیں ہے، یزیدی فوج کے سردار عمر بن سعد کو تین باتوں کی پیش کش کی تھی جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ آپ کو دمشق جانے دیا جائے جہاں آپ اپنا ہاتھ یزید کے ہاتھ میں دیدیں۔"

"یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دینے والی" یہ بات بہت سے لوگوں کے لیے ناگواری کا باعث ہوئی جیسے کہ اپنی طرف سے گھڑ کر کہدی گئی ہو۔ چنانچہ بہت سے خطوط، کچھ استعجابی اور کچھ احتجاجی، اس سلسلے میں آئے۔ اور ان کی بنا پر الفرقان کی آئندہ اشاعت میں اس مسئلے پر باقاعدہ تاریخی حوالوں کے ساتھ تفصیل سے لکھنا پڑا، جس سے یہ حقیقت بالکل بے غبار ہوئی کہ حضرت حسینؓ کی پیش کش کے بیان میں کوئی ذرا سی بھی غلط بیانی یا بے احتیاطی نہیں تھی بلکہ یہ ایک حقیقت تھی جو شیعی اثرات کے ماتحت کچھ دبی ڈھکی چلی آرہی تھی۔ خطوط لکھنے والے بعض حضرات نے اس دوسرے مضمون کے بعد یہ لکھ کر اپنا اخلاقی فرض بھی ادا کیا کہ بے شک تم نے حضرت حسینؓ کی پیش کش کے بیان میں کوئی بے احتیاطی یا غلط بیانی نہیں کی تھی۔

اس قصے پر ۳۳-۳۴ برس گذر گئے تھے اور مجھے آب و دانہ نے لکھنؤ سے اٹھا کر لندن میں بسا دیا تھا، کہ ۱۹۸۶ء میں لکھنؤ جانا ہوا تو والد ماجد نے ان دونوں مضامین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہارا مضمون "واقعۂ کربلا" کتابی شکل میں چھپ جانا چاہیے، کچھ نظر ثانی کی ضرورت سمجھو تو ایک نظر ڈال لو اور کتب خانہ الفرقان کے حوالے کردو۔ مضمون پر نظر ڈالی تو محسوس ہوا کہ نئے سرے سے لکھے جانے کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ ۳۷ برس پہلے کے مقابلے میں اپنا علم اور اپنے خیالات دونوں بہت بدل چکے ہیں۔ مگر یہ لمبا کام ان دنوں ممکن نہ تھا۔ مناسب

وقت کے لیے مؤخر کرنا پڑا، حتیٰ کہ گذشتہ سال (۱۹۸۹ء میں) والد ماجد کے ضعف و اضمحلال کی اطلاعات پر لکھنؤ کے سفر کا خیال پیدا ہوا تو یہ مؤخر کردہ کام بھی یاد آیا اور مضمون کی نئے سرے سے تسوید کے لیے تاریخ طبری وغیرہ کا مطالعہ شروع کیا۔ اس مطالعے نے اس نتیجے پر پہنچایا جس کا اظہار سرنامے کے شعر میں ہوا ہے کہ اس پرانے مضمون کا معاملہ کچھ تبدیل و ترمیم کے عمل کا طالب نہیں ہے بلکہ وہ حس ضرورت کے ماتحت لکھا گیا تھا اس کا واقعی حق ادا ہونے کے لیے تاریخ کے اس حصے کے مکمل پوسٹ مارٹم کی ضرورت ہے جو حصہ واقعۂ کربلا اور اس کے پس منظر والے واقعات کی روایتوں پر مشتمل ہے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کے نتیجے میں یہ کتاب تیار ہوئی جو آپ کے ہاتھ میں ہے۔

تاریخی روایتوں کا حال اور اس کی مثال

میں نہ تاریخ کا طالب علم رہا نہ کسی اور حیثیت سے تاریخ دانی کا دعویٰ۔ بالکل ممکن ہے کہ میں نے اس مطالعے میں جو کچھ محسوس کیا اور جو نتائج نکالے وہ اہل فن کی نگاہ میں قابلِ اتفاق نہ ہوں۔ مگر میرا احساس بالکل اسی نوعیت کا احساس ہے جیسے کسی بدیہی چیز کا احساس ہوتا ہے اور اس نوعیت کے احساسات کو آدمی نہ رد کرسکتا ہے نہ خواہ مخواہ شک کی نگاہ سے دیکھ سکتا ہے۔ میرا احساس یہ ہے کہ ہماری تاریخ کا ایسا نازک حصہ جس قدر احتیاط اور جس قدر احساس ذمہ داری کے ساتھ قلمبند کیے جانے کی ضرورت تھی اسی قدر بے احتیاطی اور غیر ذمہ داری یہاں کارفرما نظر آتی ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:۔

طبری ج ۶ ص ۲۳۲ پر ایک روایت بتاتی ہے کہ حضرت حسینؓ کربلا میں اُترے تو وہ جمعرات کا دن اور محرم ۶۱ھ کی دوسری تاریخ تھی۔ پھر ص ۲۳۷ پر ایک روایت آتی ہے کہ جمعرات کا دن اور محرم کی ۹ تاریخ تھی کہ مخالف لشکر کے سالار عمر بن سعد، عبیداللہ بن زیاد کے ایک فوری حکم کے ماتحت، عصر کے بعد اپنے کیمپ سے اُٹھ کر حضرت حسینؓ پر چڑھائی کرنے کے لیے پہنچ گئے۔ مگر پھر مفاہمت ہو گئی اور

آئندہ صبح تک کے لیے کارروائی روک دی گئی۔ ظاہر ہے ہے کہ اس کے بعد آئندہ صبح جو آئے گی تو وہ جمعہ کی صبح ہوگی۔ جب ۲ محرم کو بھی جمعرات بتائی گئی پھر ۹ محرم کو بھی جمعرات ہی بتائی گئی تو ۱۰ محرم کو سوائے جمعہ کے اور کوئی دن نہیں ہوسکتا۔ مگر آگے ص۲۴۲ پر دوسری صبح کو عمر بن سعد کی کارروائی (یعنی اپنے لشکر کو حرکت میں لانے کا بیان آتا ہے تو ہمیں یہ الفاظ ملتے ہیں کہ :-

قال فلما صلی عمر بن سعد الغداۃ	راوی کہتا ہے پھر جب ہفتہ کو عمر بن سعد
یوم السبت وقد بلغنا ایضاً انہٗ	نے فجر کی نماز پڑھ لی ـــــ اور ہمیں یہ بھی روایت
کان یوم الجمعۃ وکان ذالك	ملی ہے کہ وہ جمعہ کا دن تھا۔ اور وہ دن
الیوم یوم عاشوراء خرج فیمن	عاشوراء (۱۰ محرم) کا تھا تو ابن سعد
معہ من الناس ۔	اپنے لوگوں کو لے کر نکلا ۔

فرمائیے کہ ص۲۳۲ اور ص۲۳۷ والی روایتوں کے پس منظر میں، جن میں ۲ تاریخ کو جمعرات کا دن اور پھر ۹ تاریخ کو جمعرات کا دن بتایا گیا ہے، کوئی تُک اس طور پر ص۲۴۲ کی اُس روایت کو لینے کی ہے جس میں ۱۰ تاریخ کو ہفتے کا دن بتایا گیا ہے ؟

ہمیں نہیں معلوم کہ "وقد بلغنا ایضاً" (اور ہمیں یہ بھی روایت ملی ہے کہ یہ جمعہ کا دن تھا) یہ الفاظ طبری کے ہیں، یا راوی کے۔ اگر راوی کے ہیں اور طبری نے کچھ کہا ہی نہیں، تب تو کہنا ہی کیا ؟ اور اگر راوی کے نہیں طبری کے ہیں، تب بھی ایک مؤرخ کی ذمہ داری کے لحاظ سے اس اندازِ کلام کو کوئی ذمہ دارانہ انداز نہیں کہا جاسکتا جس سے ۱۰ محرم کو جمعہ کا دن ایک مشکوک دن بن جاتا ہے۔ حالانکہ گذشتہ بیانات کی رو سے وہ قطعی جمعہ کا دن ہے، کہنے کی بات یہ تھی کہ "یہ دن ہفتے کا نہیں جمعہ کا ہونا چاہیے، اور اگر ہفتہ ہی ثابت ہے تو پھر اگلے دونوں بیانات غلط ہیں۔"

طبری کا اپنا اعتراف

یہ مثال سامنے لاکر ہم طبری کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں کہہ رہے ہیں کہ اگر

ان کی زندگی میں کہی جاتی تو شاید وہ کوئی صفائی دے سکتے۔ اُن کا خود اپنا اعتراف ہے کہ اُن کے قاری کو ایسی روایات مل سکتی ہیں جو کسی طرح صحیح نہ ہوسکتی ہوں، جو کسی طرح سمجھ میں نہ آسکتی ہوں۔ کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ :-

"میں نے اس کتاب میں جو کچھ ذکر کیا ہے اس میں میرا اعتماد اپنی اطلاعات اور راویوں کے بیانات پر رہا ہے نہ کہ عقل و فکر کے نتائج پر۔ کسی قاری کو اگر میری جمع کردہ خبروں اور روایتوں میں کوئی چیز بایں وجہ ناقابل فہم اور ناقابلِ قبول نظر آئے کہ نہ کوئی اس کی تُک بیٹھتی ہے نہ کوئی معنیٰ بنتے ہیں تو اُسے جاننا چاہیے کہ ہم نے یہ سب اپنی طرف سے نہیں لکھا ہے بلکہ اگلوں سے جو بات ہمیں جس طرح پہنچی ہے ہم نے اسی طرح نقل کر دی ہے۔" (جلد اول ص۵)

پھر کونسی بات بعید ہے؟

مؤرّخ کا دامن جب اتنا وسیع ہو کہ اتنی موٹی اور دور سے نظر آنے والی اعجوبگی کے ساتھ بھی، جیسی کہ مذکورہ بالا مثال میں پائی جاتی ہے۔ ایک روایت کو اس کے یہاں بے چون و چرا جگہ مل سکتی ہے تو پھر راویوں کی کون سی غلطی، مبالغہ آرائی یا غلط بیانی رہ جاتی ہے جس کی توقع ہمیں اپنے ان مؤرخین کی کتابوں میں نہیں کرنی چاہیئے؟ خاص کر کربلا کے جیسے واقعات میں کہ جن سے جذبات متعلق ہوتے ہیں۔ تعصّبات متعلق ہوتے ہیں اور مثبت و منفی (POSITIVE & NEGATIVE) مفادات بھی متعلق ہوجاتے ہیں[1]

---

[1] تاریخ تو پھر تاریخ ہے کہ جس میں بہت سی گنجائشیں مانی گئی ہیں، طبری کی تو تفسیر میں بھی اسی درجہ کی اعجوبہ روایتیں ایسے معاملات تک میں پائی جاتی ہیں جن میں ادنیٰ درجہ کی کی گنجائش نہیں مانی جاسکتی۔ سورۂ النجم کی تلاوت کے دوران میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر معاذ اللہ مشرکین کے بتوں کی تعریف و توثیق میں "تلك الغرانیق العُلیٰ" والے شیطانی کلمات جاری ہونے کی روایت کئی کئی سندوں سے بلا کسی نقد و نظر کے اس تفسیر میں دی گئی ہے۔

چنانچہ اس واقعے (واقعۂ کربلا) اور اس کے پس منظر کے واقعات کے سلسلے میں جہاں بظاہر صحیح اور قابل قبول روایات موجود ہیں، وہیں نہایت منکر اور ناقابلِ قبول روایات کا بھی ڈھیر لگ گیا ہے۔ اور فی الواقع یہ صورت پیدا ہو گئی ہے کہ کسی روایت کو صحیح مانتے ہوئے بھی یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ گو عقلاً صحیح نظر آتی ہے مگر ہو سکتا ہے کہ واقعہ میں یہ بھی صحیح نہ ہو۔ روایات کی اس صورت حال کا اندازہ آپ کو آگے بڑھ کر کتاب میں ہو گا۔ خاص کر کربلا کے میدان والی روایات میں۔ اور اسی لیے ہم نے اگرچہ کچھ روایات کو عقل، عادت، حالات و ماحول اور دوسرے قابلِ لحاظ پہلوؤں کی روشنی میں قابلِ قبول اور کچھ کو ناقابلِ قبول ٹھہرایا ہے۔ کچھ کو ترجیح دی ہے اور کچھ کو رد کر دیا ہے، مگر جس کو صحیح ٹھیرایا ہے اور جس کو ترجیح دی اس کو بھی فی الواقع اور سو فیصد صحیح کہنے کی ذمّہ داری ہم نہیں اٹھا سکتے۔ جھوٹ اور سچ اور من گھڑت روایات کی وہ آمیزش نظر آتی ہے کہ اللہ کی پناہ۔

کربلا کے واقعے میں غلط بیانی کے اسباب

اور اس کی وجہ وہی ہے کہ کربلا کا سانحہ (چاہے جس شکل میں ہوا ہو) اول تو بجائے خود بہت جذبات انگیز ہے اور پھر اس کے پیچھے سیاسی صف آرائی کی ایک لمبی (کم از کم ۲۵ سالہ) تاریخ ہے جو ناگزیر طور پر دو طرفہ تعصّبات کو بھی جنم دے چکی ہے اور مفادات میں دلچسپی رکھنے والے حلقے بھی بنا چکی ہے۔ مزید کوفیوں کی جس بے وفائی اور غداری نے یہ سانحہ کرایا اس کا بھی تقاضہ ہے کہ (قبائلی رقابتوں کے ماتحت) ایک دوسرے کو الزام دینے اور اپنے آپ کو اندر سے باوفا دکھلانے والی روایتیں گھڑی جائیں، خاص کر جبکہ واقعہ کے چند سال بعد ہی یزید کی وفات سے حالات نے ایک دم پلٹا کھا لیا تھا۔ پھر ان سب باتوں سے اوپر، بہت سے راویوں اور مقتل نگاروں کا وہ "شیعی" جذبہ جو اگر اس نہایت "قیمتی" موقع کو ایمانداری کی نذر کر دیتا اور شیعیت کے مفاد کے لیے حسبِ ضرورت اور حسبِ استطاعت

رنگ آمیزی اور روایت آفرینی کی خدمت انجام نہ دیتا تو یہ ایک غیر فطری بات ہوتی۔ غرض ان مختلف قسم کے محرکات وعوامل نے مل کر واقعۂ کربلا اور اس کے پس منظر سے تعلق رکھنے والے واقعات کے بیان میں وہ غضب ڈھایا ہے کہ حقیقت کی یافت مشکل بن گئی۔ نہایت بے لاگ طریقے سے روایتوں کا تجزیہ کیا جائے تبھی ممکن ہے کہ صداقت تک رسائی ہو سکے۔

کام مشکل بھی اور ضروری بھی

اس قصے میں صداقت تک رسائی اور اس کا اظہار کس قدر مشکل (یعنی پُرخطر) کام ہے، اس کا اندازہ کسی اور کو ہو یا نہ ہو، اس راقم کو تو اُس وقت سے ہے جب اس موضوع پر ۳۲سال پہلے والے مضمون میں بغیر یہ جانے ہوئے کہ کسی چھُپائی گئی صداقت کا اظہار ہو اجارہا ہے، وہ روایت نقل کردی گئی جس کے مطابق حضرت حسینؓ نے یہ آمادگی ظاہر کی تھی کہ :۔

(اوریا) میں یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدوں پھر وہ جو مناسب سمجھے میرے اور اپنے معاملے میں فیصلہ کرے [1]

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ اس بیان کی بنا پر یہ مضمون بڑا ہنگامہ خیز ہوگیا اور آئندہ ماہ کے الفرقان میں جب پانچ چھ کتابوں کے حوالے سے یہ بیان مدلل کردیا گیا تب بات قابو میں آئی۔ لیکن وہ بھی صرف سچے علم دوست اور صداقت پسند لوگوں کی حد تک۔ باقی جن لوگوں کیلئے ایک تاریخی حقیقت کے مقابلے میں یہ شاعری جزوِ ایمان بن چکی تھی کہ ع

سر داد و نداد دست در دستِ یزید

وہ اپنے بے دلیل ایمان پر اس کے بعد بھی قائم اور سرگراں رہے۔

---

[1] تاریخ طبری جز ۶ ص ۲۳۵ ۔ البدایہ والنہایہ جلد ۸ ص ۱۷۰

ایک ناگزیر ضمنی بحث

اگرچہ یہ موقع کسی بحث اور تفصیل کا نہیں ہے تاہم اس اندیشے کے پیش نظر کہ آج کی ان سطروں کو پڑھ کر بھی ایسے تمام حضرات کو گرانی لاحق ہو، اس قدر بات یہاں کہہ دینا مناسب معلوم ہوتی ہے کہ یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دینے اور فیصلا اس پر چھوڑنے کی بات طبری، ابن اثیر اور البدایہ والنہایہ وغیرہ سب کے صفحات میں اس قدر روشن حقیقت ہے کہ جو لوگ اس کے بیان پر ناراض ہوتے ہیں وہ سچائی سے ناخوش ہونے کے سوا اور کچھ نہیں کرتے۔ طبری نے اس واقعہ کی سلسلے کی سب سے پہلی روایت یہ دی ہے کہ حضرت حسینؓ نے عمر بن سعدؓ سے ملاقات کی اور کہا کہ دونوں لشکروں کو یہیں کربلا کے میدان میں چھوڑ کر ہم تم دونوں یزید کے پاس چلیں۔ مگر عمر بن سعد نے اس کو قبول کرنے سے عذر کیا، اس کے بعد طبری میں دوسری روایت ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے:۔

قال ابومخنف واما ما حدثنا به	ابو مخنف نے کہا۔ لیکن مجالد بن سعید
المجالد بن سعید والصقعب بن	اور صقعب بن زہیر وغیرہ محدثین کا قول
زھیر الازدی وغیرھما من المحدثین	وہ ہے جو محدثین کی جماعت کا قول ہے
فھو ما علیہ جماعۃ المحدثین	وہ کہتے ہیں کہ حضرت حسینؓ نے کہا تھا
قالوا انہ قال اختاروا منی خصالاً	کہ میری تین باتیں قبول کرو، یا میں
ثلاثاً اِمّا ان ارجع الی المکان الذی	اس جگہ کو لوٹ جاؤں جہاں سے آیا
اقبلت منہ واِمّا ان اضع یدی فی	ہوں، یا یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے
ید یزید بن معاویۃ فیری فیما بینی	دوں پھر وہ میرے اور اپنے بارے میں
وبینہ رأیہ واِمّا ان تسیرونی	جو سمجھے فیصلہ کرے اور یا تم مجھے مسلمانوں
الی ثغر من ثغور المسلمین شئتم	کے کسی سرحدی مقام پر جہاں بھی تم
فاکون رجلاً من اھلہ لی	چاہو، پہنچا دو، وہاں میں وہیں کا ایک

مالھم وعلیٰ ما علیھم۔[1]	آدمی ہو کر رہوں گا جیسے وہ سب ویسا ہیں۔

سب سے پہلی روایت بھی طبری نے ابومخنف ہی سے لی تھی۔ اور وہ ابومخنف نے ایک فردِ واحد، ہانی بن ثُبیت کے بیان کے طور پر دی تھی، بعدازاں یہ دوسری روایت دی جس پر وہ محدثین کا اتفاق بتاتا ہے۔ اس کے بعد اسی ابومخنف کی ایک تیسری روایت طبری میں آتی ہے، جو حضرت حسینؓ کے قافلے کے ایک باقی ماندہ فرد اور خاندانی غلام عُقبہ بن سمعان کا بیان ہے کہ میں اول سے آخر تک آپ کے ساتھ تھا۔ آپ نے کہیں کوئی اُس طرح کی بات نہیں فرمائی جو لوگ بیان کرتے ہیں۔ آپ نے تو صرف یہ فرمایا تھا کہ :-

دعونی فلأذھب فی ھٰذہ الارض	مجھے چھوڑ دو کہ کہیں بھی اس لمبی چوڑی
العریضۃ حتی ننظر ما یصیر	زمین میں نکل جاؤں حتیٰ کہ یہ بات واضح
امر الناس۔[2]	ہو کر سامنے آجائے کہ لوگ کیا فیصلہ کرتے ہیں

اور پھر چوتھی روایت اسی ابومخنف سے (دوسری روایت کی تکمیل کے طور پر) ہے کہ عمر بن سعد سے آپ کی ملاقات (جو معاملے کے سُلجھاؤ کے لیے آپ نے شروع کی تھی) تین یا چار بار ہوئی، اور اس کے نتیجے میں عمر نے ابن زیاد کو خط لکھا کہ اللہ کا شکر ہے معاملات سدھرنے کی صورت نکل آئی ہے اور حسینؓ نے پیش کش کی ہے کہ

ان یرجع الی المکان الذی منہ	یا تو وہ اسی جگہ کو لوٹ جائیں جہاں سے
اتی او ان نُسیّرہٗ الیٰ ثغر من	آئے تھے یا ہم ان کو مسلمانوں کے جس
ثغور المسلمین شئنا فیکون رجلاً	کسی سرحدی مقام پر چاہیں بھیج دیں اور
من المسلمین لہٗ ما لھم وعلیہ	وہاں وہ ایک عام مسلمان کی طرح رہیں
ما علیھم او ان یأتی یزید	گے اور یا پھر وہ امیر المومنین یزید کے
	پاس چلے جائیں اور اپنا ہاتھ ان کے

---

[1] جزو ۶ صفحہ ۲۳۵۔ [2] ایضاً

امیرالمؤمنین فیضع یدہٗ فی	ہاتھ میں دے دیں۔ پھر وہ ان
یدہٖ فیریٰ فیما بینہٗ و بینہٗ	کے اور اپنے معاملے میں جو مناسب
رأیہٗ ۔ [1]	سمجھیں کریں۔

عُقبہ بن سمعان کا بیان اگر اس معاملے میں مان لیا جاتا تو اس سے قضیے کی ایک بڑی گتھی حل ہو سکتی تھی۔ جو عقبہ کے بیان کے برخلاف یہ دوسرا بیان ماننے سے پیدا ہوتی ہے کہ حضرت حسینؓ نے تین باتوں کی پیش کش کی تھی، جن میں سے ایک یہ تھی کہ وہ یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دینے کو تیار ہیں۔ اس بیان کو ماننے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ابن زیاد کو کیا مصیبت آئی تھی کہ خود اپنے ہاتھ میں ہاتھ دینے کا مطالبہ کر کے بے ضرورت قتال کی صورت پیدا کی؟ تاریخ کی روایات میں اس کا صرف ایک جواب ملتا ہے کہ شمر بن ذی الجوشن نے چڑھا دیا (طبری ص ۲۳۶) مگر یہ کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ہے۔ ابن زیاد کوئی ایسا ہلکا اور سطحی آدمی تو نظر نہیں آتا جو ایسی حماقت کسی کے چڑھانے سے کر لے۔ خاص طور سے جبکہ اسی روایت کا یہ بیان بھی سامنے رکھا جائے کہ عمر بن سعد کے اس خط پر ابن زیاد کا اپنا ردّ عمل نہایت مسرت اور قبولیت کا تھا۔[2] بہرحال راقم سطور کی نظر میں اس گتھی کا کوئی معقول اور تشفی بخش حل نہیں ہے۔ البتہ عقبہ بن سمعان کا بیان مان لیا جائے تو پھر سرے سے کوئی اشکال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ قتال کی بات بالکل سمجھ میں آتی ہے۔ اور ابن زیاد کیلئے یہ کہنے کا موقع ہوتا ہے کہ "اچھا اب وہ ہمارے ہاتھ میں آکر ہاتھ سے نکل جانا چاہتے ہیں؟" لیکن اس سہ گانہ پیش کش والی روایت کا پلڑا اتنا بھاری ہے اور اتنے شواہد اس کے حق میں پائے جاتے ہیں کہ چاروناچار اسی کو ماننا پڑتا ہے اور عقبہ بن سمعان کی شہادت کے بارے میں وہ کہنا پڑتا ہے جو جسٹس امیر علی نے (تشیع کے باوجود اپنی معقول پسندی کی بنا پر) کہا ہے کہ عُقبہ کا یہ انکار شاید اس بنا پر تھا کہ سہ گانہ پیش کش والی روایت میں اُنکو

---

[1] طبری جزو ۶ ص ۲۳۵-۳۶ [2] جیسا کہ اپنے موقع پر آئے گا۔

حضرت حسینؓ کی توہین نظر آتی تھی[1]

اس روایت کے وزن کی سب سے پہلی وجہ تو ابو مخنف کا یہ بیان ہی ہے کہ "جماعتِ محدثین کا اس پر اتفاق ہے"۔ دوسرے یہ کہ ابو مخنف اور طبری دونوں عقبہ بن سمعان کی بات نقل کرنے کے بعد آگے چوتھی روایت پانچویں روایت اور چھٹی روایت میں مسلسل وہ باتیں بیان کر کے جو سہ گانہ پیش کش کے نتیجے میں پیش آتی چلی گئیں۔ گویا ابن سمعان کی بات کو ناقابلِ اعتنا قرار دے دیتے ہیں۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ۔ از تاریخ کے واقعات میں حضرت حسینؓ کے ساتھیوں کی زبان پر ابن سعد اور اس کے ساتھیوں کو خطاب کرتے ہوئے بار بار یہ بات ملتی ہے کہ :-

اَفَمَا لَكُمْ فِی اَحدٍ مِنَ الْخِصَالِ	کیا حضرت کی پیش کی ہوئی باتوں میں سے
التی عرض علیکم رضیً ؟	کوئی ایک بھی تم کو قبول نہیں ؟

طبری جزو ۶ کے صرف دو صفحوں (ص ۲۴۴ اور ۲۴۵) میں تین جگہ یہ بات آتی ہے اور اس کے بعد بھی آتی چلی جاتی ہے۔ اس لیے کوئی گنجائش ہی نہیں کہ اس روایت کو نہ مانا جائے۔

اصل بات جو کہنا تھی

یہ ضمنی بات ناگزیر سمجھ کر عرض کی گئی، ورنہ اصل بات یہ کہی جا رہی تھی کہ اس قصے میں اصل حقیقت اور صحیح واقعات کی یافت بھی مشکل اور اس سے زیادہ اس کا اظہار مشکل۔ اس لیے کہ اس میں لوگوں کو یا حضرت حسینؓ کی (معاذ اللہ) توہین نظر آتی ہے، اور یا یزید و ابن زیاد کی طرفداری۔ لیکن ہے یہ ایک ضروری کام۔ اس لیے کہ یہ "توہین" نظر آنا اور "طرفداری" نظر آنا، یہ دونوں باتیں ہم سب کی نظروں میں (الا ماشاء اللہ) شیعیت کا رنگ آجانے کا نتیجہ ہیں۔ اور یہ رنگ کوئی اچھا رنگ نہیں ہے۔ واقعۂ کربلا سے اور جو کچھ ہوا ہو یا

1- SPIRIT OF ISLAM P.301 Delhi (1978)

نہ ہوا ہو، شیعیت کو اپنی دوکان چمکانے اور اپنے اثرات پھیلانے کا وہ بے پناہ موقع ملا ہے کہ کچھ کہا نہیں جاتا۔ اور اسی لیے ضرورت ہے کہ نہایت ٹھنڈے دل سے پورے معاملے کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

سنّی معاشرے پر شیعیّت کے اثرات

میں اور کسی کا کیا کہوں، اپنے والد ماجدؒ کا ایک اعتراف اور ایک بیان نقل کرتا ہوں۔
ذی الحجہ ۱۳۷۳ھ کے الفرقان میں میرا مضمون "واقعۂ کربلا" شائع ہوا تو والد ماجد لکھنؤ سے باہر کہیں سفر میں تھے۔ میری عادت یہ رہی تھی کہ جو کچھ بھی لکھتا بالعموم اُن کو دکھا کر ہی الفرقان میں دیتا تھا۔ مگر یہ مضمون اُن کی حالتِ سفر کی وجہ سے نہیں دکھایا جا سکا تھا۔ واپس آکر پڑھا تو میرے یہاں تشریف لائے۔ بقول خود بہت غصّے میں گھر سے نکلے تھے۔ اولاً تو اس بات پر کہ حضرت حسینؓ کے اقدام کو "بغاوت" سے تعبیر کر دیا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ "یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دیدینے" (یعنی بیعت یا سپردگی منظور کر لینے) کی "لغو بات" نہ جانے کہاں سے لکھدی! لفظ "بغاوت" کی خلش کے بارے میں تو خود ہی فرمایا کہ وہ آتے آتے راستے ہی میں دور ہو گئی کہ یہ لفظ ہمارے فقہاء کے یہاں بے شک بُرا لفظ ہے لیکن آج کل کا ہندوستانی تو اس لفظ کو اپنے یہاں کے آج کے استعمال کے مطابق بولے گا اور آج کے استعمال میں، خصوصاً تحریکِ آزادئ ہند کے پس منظر میں، تو یہ لفظ ایک پسندیدہ اور فخر سے بولا جانے والا لفظ ہے نہ کہ کوئی مکروہ و مذموم لفظ، لیکن دوسری خلش باقی رہی اور وہ اس وقت دور ہوئی، جب پانچ چھ کتابوں کے حوالے میں نے پیش کئے جو ایک دوسرا وضاحتی مضمون لکھنے کے لیے جمع کیے گئے تھے۔
یہ بات تو آج سے ۳۷ برس پہلے ہوئی۔ زیر نظر کتاب کا جب وہ باب تیار ہوا اور والد ماجدؒ نے سنا جو حضرت مغیرہ بن شعبہ اور یزید کی ولی عہدی" کے متعلق ہے، تو بیان فرمایا کہ ہمارے بچپن میں عشرۂ محرم میں ہمارے گھر مجلس ہوتی تھی، ہمارے بڑے بھائی صاحب تاریخ ابن خلدون

(مترجم) سے حضرت حسینؓ کی شہادت کا بیان سناتے تھے، جس میں حضرت مغیرہؓ کا ذکر بھی آتا تھا، تو بعض بڑے بوڑھوں کا ان کے متعلق یہ کہنا یاد ہے کہ "ہاں شبیرے کی بونڈ تو مغیرہ ہی نے لگائی تھی" یعنی فساد کا بیج تو انہوں نے ہی بویا تھا۔ ایک صحابی (اور وہ بھی صاحب فضائل و مناقب صحابی) کے متعلق کس بے تکلفی سے کتنی بڑی بات کہدی جاتی تھی! ــــ اور یہ ہمارے وطن سنبھل کے پرانے بڑے بوڑھوں ہی میں نہیں کہدی جاتی تھی، جن کے پاس کوئی خاص علم نہ تھا اور جن کے زمانے تک اس موضوع پر کوئی بڑا اصلاحی کام ہندوستان میں نہ ہوا تھا بلکہ ہمارے زمانے کے ایسے اہلِ علم تک جن کے متعلق اس طرح کے کسی تبصرے کا خیال بھی اُن کے علمی اور تنقیدی مذاق کی بنا پر نہیں کیا جانا چاہیے تھا۔ ان کے قلم سے ہم بعینہٖ یہی "شیعیت" ٹپکتی ہوئی دیکھتے ہیں۔ یزید کی ولی عہدی کے قصے میں اُس فضول سی روایت پر اعتماد کرتے ہوئے جو کہتی ہے کہ حضرت مغیرہ نے اپنی گورنری بچانے کے لیے یزید کی ولی عہدی کا خواب حضرت معاویہؓ کو دکھایا[1] جو ان کے لیے اتنا خوش کن تھا کہ حضرت مغیرہ سے لی جانے والی گورنری بحال کر دی[1]۔ کس طنزیہ انداز میں لکھا ہے کہ:۔

"یزید کی ولی عہدی کے لیے ابتدائی تجویز کسی صحیح جذبے سے نہیں ہوئی تھی، بلکہ ایک بزرگ نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے دوسرے بزرگ کے ذاتی مفاد سے اپیل کر کے اس تجویز کو جنم دیا۔"[2]

حضورؐ کی قرابت کا احترام یا عصمت کا عقیدہ؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت بے شک قابلِ صد لحاظ اور واجب الاحترام شئی ہے۔ وہ آدمی بد نصیب ہے جو آپؐ کی قرابتوں کا لحاظ اور احترام نہ کر سکے۔ لیکن لحاظ و احترام الگ چیز ہے اور معصومین محض کا درجہ کسی کو دینا الگ چیز ہے۔ شیعیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

---

[1] زیرِ نظر کتاب میں ایک پورا باب اس روایت پر آپ کو ملے گا۔ [2] خلافت و ملوکیت ۱۹۶۶ء از سید ابوالاعلیٰ مودودی صفحہ ۱۵۰

کے ساتھ حضرت فاطمہ، حضرت علی اور حضرات حسن وحسین (رضی اللہ عنہم) اور اپنے دیگر ائمہ کو بھی عصمت کے درجے پر فائز کرتی ہے۔ نتیجے میں ان محترم حضرات سے کسی خطا اور بھول چوک کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ ان سے اختلاف کی صورت میں اختلاف کرنے والا لاز"ما" ہی خطاکار و گنہ گار قرار پائے گا۔

ہم اہل سنت بطور عقیدہ یہ بات نہیں مانتے مگر بہت تھوڑے لوگوں کو چھوڑ کر ہمارا عمل اسی ذہنی رویے کی شہادت دیتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی کے زمانے سے حضرت عثمان غنیؓ کے زمانے تک کے معاملات میں بعض دوسری اعتقادی قسم کی رکاوٹیں ہمیں اس رویّے کے اظہار کی اجازت نہیں دیتیں۔ لیکن اس دور کے ختم ہوتے ہی جو نیا دور شروع ہوتا ہے تو ہمارے اس رویّے کے اظہار کا دور بھی شروع ہو جاتا ہے۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے اختلاف کی کہانی میں ہم ذرا بھی انصاف پسندی کا مظاہرہ نہیں کرتے، انصاف کے بجائے حضرت معاویہؓ کو بس کچھ رعایت بمشکل دیتے ہیں۔ اگر ہم سچ مچ انصاف پر آمادہ ہو سکتے تو اس قضیے کی صورت ہماری نظروں میں آج بہت کچھ مختلف ہوتی، ہم اپنے اس رویّے کو کتاب وسنّت پر مبنی کچھ اعتقادات سے مربوط کرتے ہیں۔ مگر واقعے میں اس کا ربط ان شیعی اثرات سے زیادہ ہے جن سے اہل سنّت کا کوئی طبقہ بھی بمشکل بچ سکا ہے۔

بے انصافی کی ایک مثال

بے انصافی کی صرف ایک مثال لیجئے ــــــ اس لیے کہ یہاں اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں نکل سکتی ــــ کہ جن تاریخی کتابوں سے ہم حضرت معاویہؓ کی طرف سے حضرت علیؓ پر سب وشتم کی روایتیں پاتے ہیں انھیں کتابوں کی شہادت یہ بھی ہے کہ:-

"وکان علی اذا صلّی الغداۃ	اور (واقعہ تحکیم کے بعد) علیؓ جب فجر کی
یقنت فیقول : اللھم العن	نماز پڑھتے تو قنوت پڑھتے اور کہتے

معاویۃ وعمرًا وابا الاعور وحبیبًا	کہ اے اللہ لعنت کر معاویہ پر، عمرو بن العاص
وعبد الرحمٰن بن خالد والضحاک	پر، ابو الاعور پر، حبیب (ابن مسلمہ) پر،
بن قیس والولید فبلغ ذالک	عبد الرحمٰن بن خالد (بن ولید) پر، ضحاک بن
معاویۃ فکان اذا قنت لعن	قیس پر اور ولید پر۔ پس یہ بات جب معاویہ
علیًا وابن عباس والحسن	کو معلوم ہوئی تو وہ بھی جب قنوت کرتے تو
والحسین والاشتر۔[1]	علی، ابن عباس، حسن، حسین اور اشتر پر لعنت کرتے

لیکن اس صاف وصریح بیان کے باوجود ہمیں صرف اتنا یاد ہے کہ معاویہؓ اور ان کے ساتھی حضرت علیؓ پر سب وشتم کرتے تھے۔[2] یہ نتیجہ حضرت علیؓ کے اس احترام کا نہیں ہے جو از روئے کتاب وسنت ہم پر واجب ہے کیونکہ کتاب وسنت بے انصافی نہیں سکھاتی بلکہ اس "احترام" کا نتیجہ ہے جو شیعیت والے عقیدۂ معصومیت سے لازم آتا ہے" اہل سنت کے اصل مذہب کا تقاضہ تو یہ تھا کہ اگر یہ روایت حضرت علیؓ کے حق میں قابل یقین یا قابل بیان نہیں تھی تو ایسا ہی حضرت معاویہؓ کے حق میں سمجھا جاتا کہ وہ بھی صحابی ہیں۔

تاہم حضرت علیؓ کے مقابلے میں جیسے کچھ بھی تھے حضرت معاویہ بہرحال ایک صحابی تھے۔ اس لیے ہم اپنے علم کلام کے ماتحت مجبور ہوتے ہیں کہ ان کے ساتھ کچھ رعایت برتیں۔ لیکن جب ان کے بیٹے یزید کا دور آتا ہے تو اس کے اور حضرت حسین ابن علیؓ کے معاملے میں ہم میں اور شیعوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ اس لیے کہ یزید کو ایسا کوئی تحفظ حاصل نہیں تھا جیسا کہ اس کے والد حضرت معاویہ کو حاصل تھا۔ شیعوں نے "مثلاً" کہا کہ وہ فاسق وفاجر تھا اور کسی طرح اس لائق نہ تھا کہ تحت خلافت پر اس کو جگہ ملتی۔ تو چونکہ یہ بات حضرت حسینؓ کی حمایت میں کہی

---

[1] طبری ج ۶ ص ۴۰ [2] اور یہاں یہ نوٹ کر لیجئے کہ طبری کی روایت میں جیسا کہ نقل کیا گیا دونوں جگہ "لعنت" کا لفظ ہے۔ اسی کو ابن اثیر نے اپنی کتاب میں دوسری جگہ یعنی حضرت معاویہ کے ساتھ "سب" کے لفظ سے بدل دیا ہے جس کا ترجمہ ہم "سب وشتم" کرتے ہیں۔

گئی تھی اس لیے بالکل بآسانی ہم نے بھی یہی کہنا شروع کر دیا۔ پھر بعض کو خیال آیا کہ اس سے تو حضرت معاویہؓ پر بڑا الزام آتا ہے۔ تب یوں کر دیا گیا کہ حضرت معاویہؓ کی زندگی میں تو وہ ایسا نہیں تھا لیکن بعد میں ہوا۔ حد یہ ہے کہ ابن خلدون جیسا آدمی جس نے یزید کی ولی عہدی کی زبردست وکالت اپنے مقدمۂ تاریخ میں کی ہے، وہ بھی ذرا سا آگے چل کر جب یزید اور حضرت حسینؓ کے قضیے پر آتا ہے تو ٹھیک یہی بات کہنی شروع کر دیتا ہے یعنی یہ کہ وہ فاجر و فاسق ہو گیا تھا۔ کب ہو گیا تھا؟ اور کب اس بات کا پتہ چلا؟ تاریخ تو کوئی سی بھی اٹھا کر دیکھ لیجیے، ہر جگہ ایک ہی بیان ہے کہ جیسے ہی مدینے کے گورنر نے حضرت حسینؓ کو یہ اطلاع دی کہ حضرت معاویہ انتقال فرما گئے اور ان کے ولی عہد یزید بن معاویہ آپ سے بیعت چاہتے ہیں، ویسے ہی حضرت حسینؓ نے مدینہ چھوڑ دینے کا ارادہ فرما لیا اور آنے والی رات میں مع تمام خاندان کے مکے کی راہ لی ۔۔۔ اس کے بعد جب اس کی اطلاع شیعان علی کو پہنچی تو وہ بھی اپنے مشاورتی جلسے کر کے عازم مکہ ہوئے اور صرف سوا مہینے کی مدت میں یہ مرحلہ آگیا کہ عراق میں حالات کی جانچ پڑتال اور ضروری پیشگی تیاریوں کے لیے مسلم بن عقیل کوفے کو روانہ کر دیئے گئے۔ تو کیا یہ سمجھا جائے کہ یزید نے تخت خلافت بعد میں سنبھالا والد کے انتقال کی خبر پاتے ہی فسق و فجور کا وہ عالم برپا کیا کہ حضرت معاویہ کے انتقال کی خبر سے پہلے یزید کے فسق و فجور کی خبریں پھیل گئیں؟ حالانکہ سچائی یہ ہے کہ اس بات کے لیے سوا مہینہ بالکل ناکافی تھا، کم از کم ایک سال تو گزرنا۔ "بیچاری مے" کی طرح فسق و فجور "مفت میں" بدنام ہوا ہے۔[1]

لکیر کی فقیری یا طلب علم و تحقیق؟

اب ایک طریقہ تو یہ ہے کہ جب ابن خلدون جیسے آدمی نے بھی یہی لکھ دیا تو پھر ثبوت ہو یا نہ ہو، سمجھ میں آئے نہ آئے، نہ ماننے کی کیا گنجائش ہے؟ یہ وہ طریقہ اور وہ طرز فکر ہے

---

[1] کتاب میں اس مسئلے پر قدرے تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

جس نے سچی بات یہ ہے کہ ہمارا خانہ خراب کیا ہے اور علم کے نام سے علمی جمود ہمارا شعار بن گیا ہے۔ اگلوں کی توقیر و تعظیم کے نام پر طلبِ علم و تحقیق کی راہ بند کرنے والا یہ طرزِ فکر اگر ہمارے یہاں عام نہ ہوا ہوتا تو ہمارا عالم آج کے عالم سے بہت مختلف ہوتا۔ منجملہ اس کے یہ جو شیعیت ہمارے یہاں اُس وقت گھُس آئی تھی جب اس نے ایک باقاعدہ متوازی مذہب کی شکل اختیار نہیں کی تھی، یہ بعد کے دور میں قطعی طور سے نکالی جا سکتی تھی، اور نکال دی جاتی اگر طالب علمانہ کی جگہ "منصوفانہ" ذہنیت ہم پر حاوی نہ ہو چکی ہوتی کہ جو اوپر والوں نے جس معاملہ میں کہدیا اور لکھ دیا وہ حرفِ آخر اور پتھر کی لکیر ہے اور اس لکیر کی فقیری ہم کو کرنا ہی ہے ؎

بہ مے سجّادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید

اللہ ہی جانے کہاں سے یہ طرزِ فکر اس دنیائے اسلام میں آیا جس کا خمیر ہی ذاتی غور و فکر کی دعوت سے اٹھایا گیا تھا اور آباء و اجداد اور رہبان و احبار (مشائخ) کی اندھی تقلید کو ضلال و خسران بتایا گیا تھا؟ کھلی ہوئی بات ہے اور ہم سبھی جانتے و مانتے ہیں کہ کوئی آدمی عالمِ کُل نہیں ہوتا، پھر ہر ایک کا کچھ نہ کچھ خاص زاویۂ نظر ہوتا ہے، ہر ایک اپنے زمانے اپنے ماحول اور ماحول پر غالب چیزوں سے متأثر ضرور ہوتا ہے۔ اس لیے کوئی کتنا بھی بڑا عالم اور محقق ہو کہیں نہ کہیں ٹھوکر ضرور کھائے گا، کسی نہ کسی لاعلمی یا غلط فہمی کا شکار ضرور ہو گا (اِلّا مَا شَاءَ اللہ) اس لیے اگر اس کے احترام کے ساتھ ساتھ علم کے حق کا احترام بھی منظور ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی باتوں کو تقلیدًا لینے کے بجائے تحقیقًا لینے میں کوئی حرج سمجھا جائے اور خُذْ مَا صَفَا دَعْ مَا کَدِر (جو ٹھیک ہے وہ لے لو جس میں گڑبڑ ہے وہ چھوڑ دو) کے دانشمندانہ مقولے پر عمل نہ کیا جائے۔ کسی بڑے آدمی کے حوالے ہی کی ضرورت اگر اس کھلی ہوئی بات کو بھی قبول کرنے میں ہو تو حضرت امام مالکؒ کے بارے میں نقل ہوا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

کل یوخذ منہ و یرد علیہ — سوائے اس قبر والی ذات گرامی کے ہر ایک کا

اِلّاصاحب ھٰذا القبر۔ قول جسطرح قابلِ قبول ہوسکتا ہے قابلِ رد بھی ہوسکتا ہے،

ہر انسان کی اس محدودیت اور انفعالیت کے علاوہ ایک دوسری کھلی ہوئی بات یہ ہے کہ کسی گذشتہ زمانے کو ہم اخلاق و کردار اور عادات و اطوار کے لحاظ سے اس کے بعد والے زمانوں کے مقابلے میں خواہ کیسا ہی بہتر سمجھیں مگر وسائل کے معاملے میں ہر بعد والا زمانہ پہلے زمانوں کو پیچھے چھوڑتا آرہا ہے۔ وسائلِ علم کا بھی یہی حال ہے کہ وہ برابر ترقی پذیر ہیں۔ کتنے ہی علوم جو اگلی صدیوں میں یا تو مدوّن نہ تھے اور مدوّن ہو گئے تھے تو ان کے مجموعے آسانی سے دستیاب نہ تھے، جبکہ زمانے کی ترقیوں نے اُن کو اب نہایت منقّح شکلوں میں ہر کہہ ومہ کی دسترس میں کر دیا ہے، پھر علمی تحقیقات کو آسان بنانے کا فن الگ نئے نئے طریقے اور وسیلے ایجاد کر کے اپنے کرشمے دکھا رہا ہے۔ نتیجے میں نئی علمی تحقیقات کا بھی ایک سلسلہ قائم ہو چکا ہے۔ ایسے حال میں ہمارا علم جوں کا توں اور جمودِ مطلق کا نمونہ بنا رہے۔ جس معاملے میں جو بیان اگلے لوگ دے گئے تھے اور جو رائے ظاہر کر گئے تھے، اسے نئے اور بہتر وسائل کی روشنی میں پرکھ کر دیکھنے اور پھر رد کر دینے یا قبول کیے رہنے کا اپنا فیصلہ کرنے کی جرأت کے بجائے ہم جوں کے توں اُسی رائے پر قائم رہتے ہیں اور ہر نئی آواز اور نئی رائے سے لڑ جانے میں اپنی سعادت سمجھیں۔ یہ بے شک (حسنِ نیت کے ساتھ) اُخروی سعادت ضرور ہو سکتی ہے۔ مگر دنیوی سعادت کی قیمت پر ہوگی ——— اور ہو رہی ہے ——— جبکہ ہمارا دین بہ یک وقت دونوں سعادتوں کا کفیل ہے اور دونوں کی بیک وقت طلب ہی وہ ہمیں سکھاتا ہے[1]۔

دوسرا طریقہ جو ابن خلدون جیسے اہلِ علم کا اصلاً طریقہ ہے، یہ ہے کہ ہمیں اگر حضرت حسینؓ کی زندگی میں[2] یزید کے فسق و فجور کی کوئی معتبر شہادت نہیں

---

[1] بلاتکلف اعتراف ہے کہ جو چیز آج قطعاً ناقابلِ فہم معلوم ہو رہی ہے۔ بہت کچھ ناقدانہ ذہن رکھنے کے باوجود ایک زمانے میں ایک حد تک وہ اپنا حال بھی رہی ہے۔ اب افسوس ہوتا ہے کہ کاش عمر کا وہ قیمتی حصہ اس کم فہمی کی نذر نہ ہوتا۔ [2] ان الفاظ کو یاد رکھیے کیونکہ گفتگو حضرت حسینؓ کی زندگی کے دور تک کی ہی ہے۔

ملتی[1] تو پھر ساری دنیا کہے، بشمول ابن خلدون کہے، تب بھی اس قول اور بیان کو بس اس پر محمول کرنا چاہیے کہ بعض باتیں اپنی شہرت کی بنا پر اس درجہ یقینی اور قطعی بن جاتی ہیں اور ایک زمانے تک بنی رہتی ہیں کہ ان کی واقعیت میں کسی شک اور ان کے بارے میں کسی تحقیق کی ضرورت کا سوال ہی ذہن میں نہیں آتا۔ اور یہی چیز اس معاملے میں پیش آئی ہے۔ حضرت حسینؓ جیسی شخصیت کا یزید کے آدمیوں کے ہاتھوں قتل اور پھر شیعہ پروپیگنڈہ مشینری (جس نے پروپیگنڈہ کے زور پر حضرت عثمانؓ جیسے عظیم المرتبت صحابی کو ایک کافر و مرتد باور کرادیا تھا) ان دو چیزوں کی طاقت مل کر یزید کے بارے میں کیا کچھ نہیں باور کرا سکتی تھی؟ اس شہرت کا پردہ جب تک چاک نہ ہوا تھا اور پروپیگنڈے کا سحر ٹوٹا نہ تھا تب تک جس طرح بات چلتی رہی چلتی رہی۔ مگر کیا وجہ ہے کہ ہمیشہ یوں ہی چلتی رہے اور حقیقت کھل جانے پر بھی اسکے ساتھ حقیقت پسندانہ معاملہ نہ کیا جائے؟

مومن کا معیار اور اس کی ذمّہ داری

یزید سے ہماری کوئی رشتہ داری نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو پہلے حضرت حسینؓ سے ہے حضرت معاویہؓ سے ہماری کوئی رشتہ داری نہیں، اور اگر ہے تو پہلے حضرت علیؓ سے ہے۔ مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جن کی ذاتِ اقدس کی طرف یہ تمام رشتہ داریاں لوٹتی ہیں ان کی مبارک تعلیم نے ہمارا رشتہ سب سے پہلے حق اور صداقت کے ساتھ قائم کردیا ہے باقی تمام رشتہ داریوں کا درجہ

---

[1] صرف ایک شہادت ہمارے علم کی حد تک یہ ملتی ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یزید کی ولی عہدی کے معاملے میں اپنے حاکمِ بصرہ زیاد سے مشورہ مانگا تو اس نے یزید کے شوقِ شکار اور کچھ آزاد روی و سہل انگاری کا اندازہ کرکے یہ مشورہ دیا کہ یہ کام کچھ مؤخر کردینا مناسب ہوگا اور ساتھ ہی یزید سے کہلوایا کہ وہ اپنے حالات کی اصلاح کرے چنانچہ اسی روایت کے مطابق اس نے اپنی بہت کچھ اصلاح کر لی (طبری ج ۶ ص ۱۷۰) یعنی جو کچھ تھا وہ حضرت معاویہؓ کی زندگی میں تھا اور اُسی زمانے میں ختم ہوگیا۔

اس کے بعد رکھا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰى أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ[1]	اے ایمان والو مضبوط کھڑے ہو انصاف کے ساتھ گواہ بن کر اللہ کے۔ اگرچہ گواہی تمہارے اپنے خلاف ہو یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں کے خلاف ہو۔
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلّٰهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰى أَلَّا تَعْدِلُوا اِعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى[2]	اے ایمان والو کھڑے ہو مضبوط اللہ کیلئے انصاف کے گواہ بن کر۔ اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں بے انصافی پر آمادہ نہ کرے۔ انصاف ہی کرو کہ یہ قرین تقویٰ ہے۔

اسلام کی اس واضح اور صریح تعلیم کو دھیان میں رکھتے ہوئے ہمیں تو اس کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی کہ یزید کے لیے اور حضرت حسینؓ کے لیے ہمارے پاس الگ الگ ترازو اور الگ الگ باٹ ہوں بلکہ:

العين تدمع والقلب يحزن ولا نقول الا ما يرضىٰ به ربنا[3]	آنکھوں میں نم ہے اور دل میں غم مگر زبان سے بس وہی کہیں گے جو ہمارے رب کو پسند ہے۔

حضرت حسینؓ اور یزید کے قضیے کا مطالعہ اگر اللہ و رسول کی ان تعلیمات کی روشنی میں اسی اسپرٹ سے کیا جائے جس اسپرٹ سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ایک یہودی ملزم کے ساتھ برابری کی سطح پر اپنے قاضی کی عدالت میں حاضری قبول فرمائی۔ جس اسپرٹ کے ساتھ قاضی نے حضرت علیؓ کے خلاف فیصلہ دیا (اور صرف اس ٹیکنیکل بنیاد پر دیا کہ گواہی معتبر شرائط پر پوری نہیں اترتی) اور جس اسپرٹ کے ساتھ حضرت علیؓ نے یہ فیصلہ بلا تامّل قبول فرمالیا۔ انصاف

---

[1] القرآن۔ سورۃ النساء (۴)، آیت ۱۳۵۔ [2] القرآن سورۃ المائدۃ (۵) آیت ۸۔

[3] یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس موقع کا ارشاد ہے جب صاحبزادہ ابراہیم علیہ السلام آپ کے ہاتھوں میں جان جان آفریں کے سپرد کر رہے تھے اور آپ پر غم کا عالم طاری تھا۔

کی اس اسپرٹ کے ساتھ ہم اگر معاملے کو جانچنے کی کوشش کریں تو اس قضیے میں اب تک جو تصور چلا آرہا ہے اس کے باقی رہنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ اور اگر واقعی ایک ایماندارانہ اور غیر جانبدارانہ مطالعہ اس تصور اور تاثر کو باقی رکھنے کی اجازت نہیں دیتا جو اس معاملے میں اب تک عام طور سے رہا ہے تو پھر یقیناً یہ ایک ایماندارانہ فریضہ ہے کہ اس مطالعے کو سامنے لایا جائے اور ان تمام حلقوں تک اسے پہنچانے کی امکان بھر سعی کی جائے جو اب تک کے تصور کو ایک ایمانی سعادت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس طرح حقائق کے ساتھ بے انصافی جیسی غلط چیز ایمان کا تقاضہ بن جاتی ہے۔

اس کام کی ضرورت

راقم کو پورا احساس بلکہ تجربہ ہے جس کا اوپر اظہار ہو چکا ہے کہ ایسے معاملات میں جن کا تعلق نازک قسم کے جذبات سے جڑ گیا ہو ایک صدیوں اور نسلوں سے جمے ہوئے تاثر اور تصور کو چھیڑنا ایک پُرخطر کام ہے۔ مزید یہ اس لیے بھی ایک دشوار کام ہے کہ خود اپنے جذبات کی دنیا بھی اس "ایمانداری" کے ہاتھوں جگہ جگہ آزمائش میں پڑتی ہے۔ اس لیے کہ اب تک کا عمومی تصور کچھ نہ کچھ ہم سبھی کو ورثے میں ملا ہے۔ مگر یہ معاملہ، جیسا کہ اوپر بھی گزر چکا ہے، ان معاملات میں سے ہے جنھوں نے ہمارے دینی زاویۂ نظر کو مجموعی طور سے بہت متاثر کیا ہے، یہ ان معاملات میں سے ہے جن معاملات نے ہمارے اندر ایمانداری اور غیر جانبداری کے شعور کو مدھم کیا ہے، جن معاملات نے انصاف پسندی کی بے لاگ اسلامی روح کو بے جان کر دیا ہے اور حقیقت بینی اور حقیقت پسندی جو اسلام کی سب سے بڑی دین تھی اُس سے اُمّت کو بحیثیت مجموعی محروم کیا ہے، اُمّت کا ہر حلقہ (خاص طور سے ہر دینی حلقہ) جو آج اپنے آپ کو معیار حق بنائے ہوئے ہے، اور اس طرح حق سب سے زیادہ مشتبہ اور متنازعہ چیز بن گئی ہے، یہ ایسے ہی معاملات کا رفتہ رفتہ اثر ہے جن میں انصاف اور حقیقت پسندی جیسے اوّلین اسلامی اور انسانی تقاضوں

کو دوسرے تیسرے اور چوتھے درجے کے تقاضوں سے مغلوب ہو کر قربان کر دیا جاتا رہا۔ ہمارے اندر نئے نئے حلقوں کی پیدائش پرانے حلقوں کے باہمی بُعد میں اضافہ اور ان میں سے ہر ایک کے اندر انتشار اور ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے نئی باہمی تقسیمیں، یہ سب عذاب اسی انصاف پسندی، حقیقت پسندی اور حقیقت بینی کے فقدان کا ہے، اس عذاب سے اُمّت کے نکلنے کی کوئی صورت اس کے بغیر نہیں ہے کہ جہاں جہاں سے اس فساد کی ابتدا ہوتی نظر آتی ہے وہاں وہاں سے اصلاح کے کام کی ہمّت کی جائے۔

پیشِ نظر کتاب اصلاً تو والد ماجدؒ کے ایماء کی تعمیل ہے، مگر جس خاص شکل میں اور جس انداز پر تیار ہوئی ہے وہ میرے انہی مذکورہ بالا احساسات کا نتیجہ ہے، برسہا برس سے بڑی شدّت کے ساتھ احساس ہے کہ ہمارے یہاں حقیقت پسندی اور انصاف پسندی جس پر تمام دینی اور دنیوی سعادتوں کا مدار ہے ایک عنقا صفت شئی ہو گئی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سعادت بھی ہمارے یہاں عنقا ہو گئی ہے عاقبت کی خبر تو خدا جانے۔ ہم پر وہاں کا حال وہیں جا کے کھلے گا۔ دنیا کی ہر سعادت سے بحیثیت قوم و ملت، محرومی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ جو قوم بھی حقیقت بینی اور حقیقت پسندی کا دروازہ اپنے اوپر بند کرے گی اور مزعومات کو عقائد بنالے گی وہ لازماً پسماندگی اور محرومی ہی کو اپنا مقدر بنائے گی۔ اللہ ربّ العزت سے دعا ہے کہ اپنا یہ حال بدلے اور یہ کتاب اس تبدیلیٔ حال میں مددگار ہو۔ واٰخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العالمین والصلوٰۃ والسّلام علیٰ سیدنا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔

کچھ حوالوں کے سلسلے میں

کتاب کی تسوید کا بیشتر کام فروری ۱۹۸۰ء سے جولائی ۱۹۹۰ء تک ہندوستان کے قیام میں ہوا، مگر اس کی شروعات لندن ہی میں ہو چکی تھی، لندن میں البدایہ والنہایہ اور تاریخ ابن اثیر کے جو ایڈیشن سامنے رہے تھے اور جن سے لیے ہوئے کچھ نوٹس وغیرہ بھی ساتھ تھے، ہندوستان

میں کام کرتے وقت یہ ایڈیشن دستیاب نہ ہو سکے، اس کی بنا پر ایک ہی کتاب کے دو ایڈیشنوں کے حوالے کتاب میں آ گئے ہیں، کوشش کی گئی ہے کہ حوالے میں ایڈیشن کا امتیاز ہو جائے مگر امکان ہے کہ کہیں کچھ التباس ہو گیا ہو۔ اگر کوئی صاحب ان دونوں کتابوں کا کوئی حوالہ ملائیں اور اس میں کوئی دقت پیش آئے تو سمجھ لیا جائے کہ صفحہ کا نمبر دوسرے ایڈیشن ہے۔ ان کتابوں میں واقعات کا سنہ وار ذکر ہے اس لیے سنہ کے حساب سے ہر واقعہ بآسانی ہر ایڈیشن میں پایا جا سکتا ہے۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب سے اگر کوئی خیر انجام پائے تو اُسے قبول فرمائے اور قلم نے کہیں لغزش کی ہو تو اس کے اثرات سے ناظرین کو بچائے اور مجھے اس پر متنبہ ہونے کی سبیل پیدا فرمائے۔

تشکّر و امتنان

کتاب کی تیاری کے سلسلے میں جن اصحاب کی مدد کا میں ممنون ہوں ان میں سرِفہرست نام جناب مولانا سید محمد مرتضیٰ صاحب ناظم کتب خانہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کا ہے جن کی عنایت و کرم فرمائی سے ضرورت کی ہر وہ کتاب جو کتب خانہ میں تھی بروقت اور بہ آسانی دستیاب ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس مہربانی کا بہترین اجر میری طرف سے دے۔ افسوس کہ وہ اس تیسرے ایڈیشن کے وقت ہماری دنیا میں نہیں ہیں۔ ندوۃ العلماء کے اساتذہ میں اپنے محبِ قدیم مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی اور ایک نئے محب مولانا عتیق احمد صاحب بستوی کو بھی میں نے کئی دفعہ بعض چیزوں کی تلاش کے لیے تکلیف دی جسے ان حضرات کے علمی ذوق و نظر نے آسان کر دیا۔ ہر وقت کے اور حسبِ ضرورت مددگاروں میں میرے عزیز برادر خورد میاں خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی رہے۔ اللہ ان کو سلامت بعافیت رکھے۔ کتابت کی تصحیح وغیرہ کی ذمہ داری

جبکہ اس کام کو مکمل کیے بغیر لندن چلا آیا تھا، انھیں کے اوپر رہی۔ اور اس کے بعد کتاب کی طباعت اور اشاعت کے اہتمام کے لیے ان سے بڑے بھائی میاں محمد حسان نعمانی دعاؤں کے مستحق ہیں۔

آخر میں اللہ سے دعا ہے کہ اس کتاب سے اگر کوئی خیر انجام پائے تو اسے قبول فرمائے اور قلم نے کہیں لغزش کی ہو تو اس کے اثرات سے ناظرین کو بچائے اور مجھے اُس پر متنبہ ہونے کی سبیل پیدا فرمائے۔

عتیق الرحمٰن سنبھلی

لندن ۴ر اگست ۱۹۹۰ء

باب اوّل

شہادت عثمانؓ ـــ خانہ جنگی ـــ صلح حسنؓ

شہادت عثمانؓ اور خانہ جنگی

حضرت عثمانؓ کی شہادت (۳۵ھ) کے وقت سے مسلمانوں میں باہم تلوار چلنے کا جو دروازہ کھلا تو پھر اس پر حرام ہوگیا کہ بند ہو، اور یہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:۔

اذا وُضع السیف فی امتی لم یُرفع عنہا الیٰ یوم القیامۃ۔[1]	میری امت میں جب ایک دفعہ آپس میں تلوار کھنچ جائے گی تو پھر وہ قیامت تک رکھی نہ جائے گی۔

یہی بات حضرت عبداللہ بن سلامؓ (صحابی) نے اُن کوفیوں، بصریوں اور مصریوں سے فرمائی تھی جو حضرت عثمانؓ کے درپے قتل تھے[2]۔ مؤرخ ابن اثیر نے ان کے الفاظ نقل کئے ہیں

یا قوم لا تسلّوا سیف اللہ فیکم فواللہ ان سللتموہ لاتغمدوہ ویلکم ان سلطانکم الیوم یقوم	اے لوگو، اللہ کی تلوار کو آپس میں مت کھینچو، خدا کی قسم اگر تم نے اسے بے نیام کردیا تو پھر یہ واپس نیام میں جانیوالی

---

[1] مشکوٰۃ۔ کتاب الفتن۔ فصل ثانی۔ بحوالہ ابو داؤد، ترمذی۔ [2] انہی لوگوں کے ہاتھوں حضرت عثمانؓ کی شہادت ہوئی۔ یہ کون لوگ تھے؛ اس کی کچھ تفصیل انشاءاللہ باب دوم میں آئے گی۔

بالدّرۃ، فان قتلتموہ لا یقوم	نہیں ہے۔ دیکھو، سمجھو، آج تک تمھاری
الاّ بالسّیف۔ [1]	حکومت فقط دُرّے سے چلتی رہی ہے
	اگر تم نہ مانے اور عثمانؓ کو قتل کر دیا تو پھر
	یہ تلوار ہی سے چلے گی۔

اور خود حضرت عثمانؓ نے ان لوگوں سے اس بات کو یوں کہا تھا:۔

" اگر تم نے مجھے قتل کر دیا تو پھر آئندہ کبھی باہم محبّت سے نہ رہ سکو گے،
ایک ساتھ نماز نہ پڑھ پاؤ گے اور ایک جان ہو کے دشمن سے نہ لڑ سکو گے [2]

جنگ جمل اور صفّین

یہ تلوار آپس میں چلی اور ایسی چلی کہ الامان الحفیظ! شہادت عثمانؓ پر ایک سال بمشکل گزرا کہ مسلمانوں نے آپس میں دو جنگیں، جنگِ جَمل اور جنگِ صِفّین کے نام سے لڑیں اور اپنے ہزاروں بہترین افراد ان باہمی جنگوں کی نذر کر دیئے۔ دونوں جنگوں کے مقتولین کی تعداد ترا سی ۸۳ ہزار تک بتائی گئی ہے، اور جنگ جمل کی تیرہ ۱۳ ہزار تک۔

جنگ جمل جمادی الاخریٰ ۳۶ھ میں ہوئی۔ اس میں ایک طرف حضرت علیؓ تھے۔ دوسری طرف ام المومنین حضرت عائشہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ۔ اس کو جنگ جمل اس اونٹ کی وجہ سے کہا گیا ہے جس پر حضرت عائشہؓ سوار تھیں اور اس جنگ کا فیصلہ اس اونٹ کے کھڑے رہنے یا گر جانے پر ٹھہر گیا تھا۔ (عربی میں اونٹ کو جمل کہا جاتا ہے) حضرت علیؓ کے فوج کے دباؤ سے حضرت عائشہؓ کے حمایتی اگر پیچھے ہٹتے تھے تو اس اونٹ کے پاس جا کر بہرحال رک جاتے تھے اور اس کی حفاظت میں پروانہ وار جانیں دیتے۔ سینکڑوں آدمی بتائے

---

[1] الکامل فی التاریخ از ابن اثیر ج ۳ ص ۸۹۔ دار الفکر۔ بیروت۔

[2] تاریخ الامم والملوک (تاریخ طبری) از ابن جریر طبری ج ۳ جزو ۵ ص ۱۱۸ ۔ دار القلم بیروت۔

گئے ہیں جو اس اونٹ کے اردگرد شہید ہوئے۔

اس جنگ کا مختصر قصہ یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت موسم حج (ذی الحجہ) میں ہوئی جبکہ اہل مدینہ کی بھاری تعداد حج کے لیے گئی ہوئی تھی۔ منجملہ ان کے حضرت عائشہؓ اور بعض دیگر امہات المومنین تھیں۔ یہ واپس ہو رہی تھیں کہ مدینے سے بہت سے لوگ مکے پہنچے جن سے حضرت عثمانؓ کے قتل کر دیئے جانے کی خبر ملی۔ حضرت عائشہؓ نے اپنا ارادہ بدل دیا اور مکے ہی میں ٹھہر کر قاتلوں کے خلاف کارروائی کی منصوبہ بندی کا فیصلہ کیا۔ اس دوران میں حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ بھی مدینے سے پہنچ گئے۔ جو یہ خبر لائے تھے کہ مدینہ بالکل اُنہی اوباشوں کے قبضے میں ہے جن کے ہاتھوں خلیفۂ سوم قتل ہوئے۔ ہم بھی جان بچا کر بھاگے ہیں۔ علیؓ کو انہی لوگوں نے خلافت قبول کرنے پر مجبور کیا۔ ان اوباشوں کے خلاف کارروائی کے سلسلے میں آخری فیصلہ یہ ہوا کہ براہِ راست مدینہ نہ جایا جائے بلکہ بصرے اور کوفے کا رخ کیا جائے جہاں سے ان اوباشوں کی ٹولیاں نکل کر مدینہ پہنچی ہیں۔ ان دونوں مقامات کو قابو میں کر کے (جہاں طلحہؓ اور زبیرؓ کے ماننے والے بھی بکثرت ہیں) ان اوباشوں کے خلاف کارروائی آسان ہو گی۔ اس منصوبے کے ساتھ وہ تمام لوگ جو حضرت عثمانؓ کے حامی یا کم از کم قاتلوں کے مدینے پر قبضے سے ناخوش ہونے کی بنا پر مکے پہنچ گئے تھے، ام المومنین حضرت عائشہؓ کی قیادت میں بصرے کے لیے روانہ ہو گئے۔

حضرت علیؓ اگرچہ خود دیکھ رہے تھے کہ ان کے اردگرد بھاری تعداد میں قاتلانِ عثمانؓ ہیں مگر آپ کی حکمت عملی یہ تھی کہ اس وقت ان کی حمایت کو قبول کیا جائے کیونکہ ان کو اس وقت چھیڑنا نقصان دہ ہوگا۔ بلکہ حضرت معاویہؓ (حاکم شام) جن کو آپ برطرف کرنا چاہتے ہیں ان کے خلاف کارروائی میں تو یہی لوگ سب سے زیادہ کارآمد بھی ہو سکتے تھے۔ اس بنا پر آپ پہلی ترجیح کے طور پر حضرت معاویہ کے خلاف کارروائی کی تیاری کر رہے تھے کہ مکے سے حضرت عائشہؓ اور زبیرؓ و طلحہؓ کی قیادت میں یہ بصرے کے لیے ایک لشکر کی روانگی کی خبر ملی۔

حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کی وجہ سے بظاہر یہ یقینی ہے کہ اس مہم کو حضرت علیؓ نے نہ صرف قاتلانِ عثمانؓ کے بلکہ خود اپنے خلاف بھی جانا ہوگا۔ کیونکہ حضرت علیؓ کی بیعت کے سلسلے میں ان حضرات کے درمیان بدگمانی کے اسباب پیدا ہو گئے تھے۔ بہرحال حضرت علیؓ نے فوری طور پر مدینے سے کوچ کرکے ان لوگوں کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ مگر وقت گزر چکا تھا۔ اس لیے بصرے کی مہم بلا رکاوٹ بصرے پہنچ گئی۔ حضرت علیؓ بھی اپنی فوج کے ساتھ وہیں پہنچے اور پھر طرفین میں مذاکرات شروع ہوئے۔ جس کے نتیجے میں اس شرط پر صلح کی صورت بن گئی کہ حضرت علیؓ اپنے آپ کو قاتلانِ عثمانؓ سے آزاد اور بےتعلق کرلیں۔ ان لوگوں نے اس صلح کی سُن گُن پالی۔ جس میں ان کی قطعی موت تھی۔ چنانچہ ان لوگوں نے مشاورت کرکے فوری فیصلہ یہ کیا کہ حضرت عائشہؓ کے لشکر پر شب خون مار کر کے جنگ کی آگ بھڑکا دی جائے اور اس میں یہ لوگ کامیاب ہو گئے۔ پھر جو جنگ چھڑی تو اس وقت رکی جب حضرت علیؓ نے اس جنگ کے جلدی رکنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہ دیکھی کہ اونٹ کو نشانہ بنایا جائے اور وہ بیٹھنے پر مجبور ہو جائے۔ چنانچہ یہ ہوا اور یہیں پر جنگ ختم ہو گئی۔ یعنی یہ بس یک روزہ جنگ تھی۔ حضرت عائشہؓ بالکل سلامت رہیں اور پوری طرح باعزت سلوک کے ساتھ مکے کو روانہ کر دی گئیں۔ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ نے البتہ شہادت پائی۔ اور سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ قاتلانِ عثمانؓ کے گروہ سے حضرت علیؓ کی آزادی اور بےتعلقی اب مشکل تر ہو گئی۔ اور اس کے نتیجے میں حضرت معاویہؓ کے ساتھ بھی کسی مصالحت کا امکان گویا بالکل ختم ہو گیا۔ کیونکہ اس میں ان قاتلوں کی موت یقینی تھی۔ وہ حضرت معاویہ کو اور حضرت معاویہ انکو نہیں برداشت کر سکتے تھے۔

جنگِ جمل کے بعد حضرت علیؓ نے کوفہ کو اپنا دارالخلافہ قرار دے لیا اور یہاں سے پھر حضرت معاویہؓ کے ساتھ نامہ و پیام شروع کیا کہ وہ بیعت کریں اور اپنی معزولی قبول کرلیں۔ اُن کی شرط تھی کہ قاتلانِ عثمانؓ سے قصاص لیا جائے۔ جو ظاہر ہے کہ کم از کم فوراً تو ناممکن بات تھی۔ چنانچہ جنگ کی ٹھن گئی اور شام و عراق کے درمیان صفین کے مقام پر ذی الحجہ ۳۶ھ

میں طرفین کا آمنا سامنا ہوا اور تقریباً دو ماہ یہ جنگ چلی جس کا خاتمہ اس وقت ہوا جب حضرت معاویہ کے لشکر سے نیزوں پر قرآن اٹھا لئے گئے کہ قتل و قتال کی حد ہوگئی، اسے بند کرو اور قرآن کو حکم بنا لو۔ اسی کو واقعہ تحکیم کہا جاتا ہے۔ مقتولین کی تعداد نوّے ہزار تک بتائی گئی ہے۔

حضرت علیؓ کی شہادت

حضرت علیؓ نے تحکیم کی پیش کش پر جنگ اپنی مرضی کے خلاف بعض اہم ساتھیوں کے دباؤ پر بند کی تھی۔ ورنہ آپ اس پیش کش کو ایک جنگی چال سمجھتے تھے اور واقعی اسکو قبول کرنے سے آپ کے محاذ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ منجملہ اس کے یہ تھا کہ آپ کی فوج کا ایک حلقہ اسی تحکیم کی بنا پر آپ سے ایسا برگشتہ ہوا کہ کافر ہی قرار دے دیا۔ اور آپ سے برسر جنگ ہوگیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو تاریخ اسلام میں خارجی اور "خوارج" کہلائے۔ انہی میں کے ایک نے رمضان ۴۰ھ میں آپ کو شہید کر دیا۔[1]

حضرت حسنؓ کی خلافت

آپ کی شہادت کے بعد ساتھیوں نے آپ کے بڑے صاحبزادے حضرت حسنؓ کو جانشین بنایا۔ حضرت حسنؓ نے باہمی خون خرابے کا ماحول ختم کرنے کے لیے حضرت معاویہؓ کے حق میں دست برداری کا فیصلہ کیا۔ یہ ۴۱ھ کی بات ہے جب کہ آپ کی خلافت کو چھ مہینے ہوئے تھے۔ حضرت معاویہؓ نے اس کے لیے آپ کے منہ مانگے شرائط منظور کیے اور ربیع الاول ۴۱ھ میں یہ مصالحانہ دست برداری پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی اس طرح یہ پانچ سال کا تفرقہ مٹ کر اسلامی وحدت پھر سے بحال ہوئی۔ چنانچہ اس سال کو مسلمانوں

---

[1] اولاً یہ لوگ ان میں سے تھے جنھوں نے حضرت علیؓ کو مجبور کیا کہ تحکیم کو قبول کرلیں مگر بعد میں جب تحکیم کی عملی صورت یہ بنی کہ دو آدمی حَکَم بنائے جائیں تو یہ احمق بگڑ گئے کہ آدمی کو حُکم بنانا قرآن کے خلاف ہے۔

نے "عام الجماعت" اجتماعیت واپس آنے کا سال قرار دیا۔

عالی مقام بیٹا

حضرت حسنؓ کے بارے میں ایک ارشاد نبویؐ صحیح بخاری میں روایت ہوا ہے کہ آپؐ نے حضرت حسنؓ کی طرف اشارہ کر کے (جبکہ وہ بچّے ہی تھے) فرمایا کہ

انّ ابنی ھٰذا سیّد ولعل اللّٰہ	میرا یہ بیٹا سید (عالی مقام) ہے
ان یّصلح بہٖ بین فئتین عظیمتین	امید ہے کہ اللہ اس کے ذریعہ مسلمانوں
من المسلمین۔[1]	کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد صحابہ کے بارے میں آتا ہے کہ انھوں نے جنگ جمل اور جنگ صفین (جو حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مسلمانوں نے آپس میں لڑیں) سے اپنے آپ کو علیٰحدہ رکھا مثلاً حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت اسامہ بن زیدؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ یہ اور ان کے ساتھ بہت سے حضرات اس اختلاف اور خانہ جنگی کو وہ فتنہ سمجھتے تھے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو ڈرایا تھا۔ طبری نے جلیل القدر تابعی امام شعبیؒ (م ۱۰۴ھ) سے روایت کی ہے کہ:۔

باللّٰہ الذی لا الٰہ الا ھو ما نھض	قسم خدائے وحدہٗ لاشریک کی۔ اس واقعہ
فی تلک الفتنۃ الا ستّۃ بدریین	میں بدری صحابہ (جن کا درجہ سب سے اعلیٰ مانا
مالھم سابع او سبعۃ مالھم ثامن۔[2]	جاتا ہے) میں چھ کے سوا کوئی ساتواں یا سات کے سوا کوئی آٹھواں نہ تھا جو شریک ہوا ہو۔

---

[1] مشکوٰۃ (بحوالہ بخاری) باب مناقب اہل بیت [2] طبری جزو ۵ صفحہ ۱۶۵ روایت میں چھ اور سات کا جو شک ہے اس کی وجہ طبری کی اگلی روایت کے مطابق حضرت ابوایوبؓ انصاری کے بارے میں امام شعبی کا شک ہے کہ وہ شریک تھے یا نہیں اور تاریخی تحقیق یہ بتاتی ہے کہ شریک نہیں تھے۔

حضرت حسنؓ کی عمر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں اگرچہ اتنی نہ تھی کہ وہ "فتنہ" کے متعلق آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ایسے ارشادات اور تنبیہات سے واقف ہو سکتے جیسے ارشادات حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور دوسرے مقابلتاً بزرگ صحابہؓ کو اس موقع پر یاد آرہے تھے[۱] اور اس لیے وہ اپنے والد ماجد کے ساتھ جنگ جمل اور جنگ صفین دونوں میں اگرچہ شریک ہوئے۔ مگر ان کی طبیعت جس سانچے میں ڈھلی تھی اس کے زیر اثر ان کی ابتدائی کوشش یہی رہی تھی کہ ان کے والد ماجد حضرت علی جنگ سے گریز فرمائیں۔ طبری اور ابن اثیر دونوں میں ہے کہ حضرت معاویہؓ کی طرف سے جب یہ جواب آگیا کہ وہ قصاص عثمانؓ کا مطالبہ پورا ہونے سے پہلے حضرت علیؓ کی خلافت تسلیم کرنے والے نہیں ہیں (اور حضرت علیؓ اس وقت تک مدینے ہی میں تھے) تو اہل مدینہ کو فکر ہوئی کہ پتہ چلے کہ اب علیؓ کا ارادہ کیا ہے؟ وہ معاویہؓ کے خلاف لشکر کشی کریں گے اور اس طرح اہل قبلہ کے خلاف تلوار اٹھائیں گے[۲] یا اس سے رک جائیں گے۔ اور تجسس خاص کر اس لیے ہوا تھا کہ انہیں پتہ چلا تھا کہ حسنؓ اپنے والد کو یہ رائے دے رہے ہیں کہ وہ کوئی اقدام

---

[۱] مثلاً حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے لوگوں کو یاد دلایا کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ عنقریب ایک فتنہ (آزمائش اور غیر واضح معاملہ) رونما ہوگا جس میں بیٹھ رہنے والا کھڑے رہنے والے سے بہتر ہوگا اور کھڑا ہونے والا چلنے والے سے اور چلنے والا (یعنی پیدل چلنے والا) سواری پر چلنے والے سے (ابن اثیر ج ۳ ص ۱۱۷) اسی فتنہ کا حوالہ ان تمام لوگوں کی گفتگوؤں میں ملتا ہے جنھوں نے حضرت علیؓ کی خلافت قبول کی مگر جنگ میں ان کا ساتھ قبول نہیں کیا۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت علی تو خود کسی سے کم تر بزرگ صحابی نہ تھے، انھیں کیوں یہ فتنے کی حدیثیں نہیں یاد آرہی تھیں؟ اس سلسلے میں کوئی قطعی بات تو نہیں کہی جا سکتی لیکن بظاہر آپ خلافت کی بیعت لے لینے کی وجہ سے نظم و ضبط کو اہم تر ذمہ داری سمجھ رہے تھے اور یہ کہ فتنہ فرو ہونے کی یہی صورت ہے۔ واللہ اعلم۔

[۲] "اہل قبلہ کے خلاف تلوار اٹھانے کے الفاظ طبری اور ابن اثیر کی روایت ہی کے ہیں۔ "دابیہ فی قتال اھل القبلۃ، أیجرأ علیہ ام ینکل عنہ"؟ طبری ج ۵ ص ۱۶۵۔

نہ کریں۔ روایت میں ہے:

وقد بلغهم ان الحسن بن علی	اور انھیں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ حسن بن علیؓ
دعاه الی القعود و ترك	اپنے والد کو یہ رائے دے رہے ہیں کہ آپ کوئی اقدام
الناس [1]	نہ کریں اور لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں

ابن کثیر نے اس موقع پر حضرت حسنؓ کے الفاظ بھی نقل کیے ہیں کہ ان الفاظ میں آپ نے اپنے والد ماجد کو کسی اقدام کے خلاف رائے دی۔

یا ابت دع هذا فان فیه سفك	ابا جان! یہ نہ کیجئے، یہ ارادہ ترک کر دیجیے،
دماء المسلمین و وقوع	کیونکہ اس میں مسلمانوں کی خونریزی
الاختلاف بینهم [2]	اور باہم اختلاف انگیزی ہے۔

ابن اثیر ہی میں ایک دوسری جگہ آتا ہے (اور طبری اور البدایہ والنہایہ میں بھی ہے)[3] کہ اہل شام پر (یعنی حضرت معاویہؓ کے خلاف) فوج کشی کی تیاری ہو رہی رہی تھی کہ پتہ چلا مکہ سے حضرت عائشہؓ کی سرکردگی اور حضرت زبیرؓ و طلحہؓ کی رہنمائی میں ایک فوج حضرت علیؓ کے ساتھیوں کی طرف سے (جن میں قاتلان عثمانؓ اور ان کے ہمنوا شامل تھے) بے اطمینانی کے ماتحت بصرہ کی طرف روانہ ہو گئی ہے تاکہ ان کے خلاف کارروائی کر کے حضرت علیؓ کو ان کے چنگل سے نکالا جائے تو حضرت علیؓ نے بجائے شام جانے کے یکایک مدینے سے نکل کر ان لوگوں کو راستے میں روکنے کا فیصلہ کیا۔ روایت سے ایسا لگتا ہے کہ حضرت حسنؓ ساتھ نہیں تھے لیکن بعد میں پہنچ کر ربذہ کے مقام پر ملے[4]۔ نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ان کے روکنے سے حضرت علیؓ رکے نہیں تو وہ خود ان کے ساتھ روانہ نہیں ہوئے مگر پھر کچھ خیال

---

[1] ابن اثیر ج ۳ ص ۱۰۴ [2] البدایہ والنہایہ ج ۷ ص ۲۵۰ مطبعۃ الاصمعی۔ ریاض

[3] کیونکہ ابن اثیر کی اصل طبری ہی کی روایتیں ہیں اور اسی طرح البدایہ والنہایہ کی بھی اصل وہی ہے۔

[4] مدینے سے مکے کے راستے میں تین میل پر ایک مقام ہے۔

آیا تو پیچھے سے چل کر ربذہ پہنچے اور وہی گفتگو پھر کی جس کا اشارہ اوپر کی روایت میں ملتا ہے۔

وآتاه ابنه الحسن فی الطریق
فقال لہ لقد امرتك فعصیتنی فتقتل
غداً بمضیعة لا ناصر لك
فقال لہ علیؓ .... وما الذی
امرتنی فعصیتك قال امرتك
یوم اُحیط بعثمان ان تخرج
عن المدینة فیقتل ولست
بها ثمّ امرتك یوم قُتِلَ اَنْ لاّ
تُبایع حتیٰ تأتیك وفود العرب
وبیعة اهل کلّ مصر فانهم لن
یقطعوا امرًا دونك فابَیتَ علیّ
وامرتك حین خرجت هٰذه
المرأة وهٰذان الرجلان ان
تجلس فی بیتك حتیٰ یصطلحوا
فان کان الفساد کان علی ید
غیرك فعصیتنی فی ذالك
کلّه۔ [1]

آپ کے بیٹے حسنؓ راستے میں آپ کے پاس آئے
اور کہا کہ میں نے کچھ آپ سے کہا تھا جو آپ نے
نہیں مانا، نتیجہ یہ ہوگا کہ کل کو آپ بے یار
و مددگار مارے جائیں گے۔ حضرت علیؓ
نے کہا کہ تم نے مجھ سے کیا کہا تھا جو میں نے
نہیں مانا؟ کہا کہ جس دن عثمانؓ محصور کیے
گئے میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ مدینہ سے
باہر چلے جائیں تاکہ آپ کی موجودگی میں کچھ نہ
ہو، پھر جب عثمانؓ قتل کر دیئے گئے تو میں نے
آپ سے کہا کہ آپ بیعت مت لیجیے، حتیٰ کہ
تمام عرب کے وفود آپ کے پاس آویں اور ہر شہر
کے لوگوں کی بیعت آجائے۔ اسلیے کہ
یہ لوگ آپ کے سوا کسی کو منتخب کر ہی نہیں
سکتے، آپ نے یہ بات بھی نہیں مانی اور پھر
جب عائشہؓ اور زبیرؓ و طلحہؓ نکلے تو میں نے کہا کہ آپ
گھر بیٹھے حتیٰ کہ یہ آمادۂ مصالحت ہو جائیں اور
اگر فساد ہوتا ہے تو وہ آپ کے نہیں دوسرے
کے ہاتھ سے ہو مگر آپ نے میری کوئی بھی بات نہیں مانی۔

حضرت علیؓ کی رائے میں صاحبزادے حسنؓ کا مشورہ صحیح نہ تھا اس لیے انھوں نے جس بات

[1] ابن اثیر ج ۳ ص ۱۱۴

کو صحیح سمجھا اس پر عمل فرمایا اور پھر باہمی جنگ اور خونریزی کا ایک طویل سلسلہ چلا جس میں حضرت حسنؓ بھی والد ماجد کے دوش بدوش شامل رہے مگر جب سنہ ۴۰ھ میں ایک خارجی کے ہاتھ سے حضرت علیؓ کی شہادت کا سانحہ پیش آیا اور آپ کی جانشینی کا بار حضرت حسنؓ کے کاندھوں پر رکھا گیا تو اس وقت یہ حقیقت بالکل آئینہ ہو چکی تھی کہ اس اختلاف سے مسلمانوں کا بے پناہ نقصان ہو گیا تھا اور اب بھلائی اسی میں تھی کہ یہ باب بند کر دیا جائے۔ حضرت علیؓ کے حامیوں میں انتشار حکم عدولی اور شکست خوردگی کا مسلسل تجربہ بھی سامنے تھا، اس لیے گروہی نقطۂ نظر سے بھی بہتری باعزت مصالحت ہی میں تھی، چنانچہ حضرت حسنؓ کے حصّہ میں یہ سعادت آئی کہ ان کی پیش قدمی کی بدولت مسلمانوں کا پانچ سالہ تفرقہ مٹے اور وہ پھر سے ایک جماعت بن جائیں، اور اس طرح وہ پیشنگوئی بھی پوری ہوئی جو بخاری کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے لیے فرمائی تھی کہ "میرا یہ بیٹا بڑا عالی مقام ہوگا اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کا تفرقہ مٹے گا۔

امن و یکجہتی کے بیس سال

حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ کے اختلافات کی بدولت حضرت معاویہؓ کے بارے میں کسی کی کچھ بھی رائے ہو مگر ایک بات سے انکار کسی انصاف پسند کے لیے ممکن نہیں ہے کہ انکے اندر عرب سرداری کی اعلیٰ ترین خصوصیات تھیں۔ ایک طرف وہ اپنے زمانے کی عرب دنیا کے پانچ دور اندیشوں اور دیدہ وروں (دُھاتِ عرب) میں سے ایک مانے جاتے تھے، اور انھوں نے ثابت کر دیا کہ ان پانچ میں وہ سب سے بڑھ کر تھے[1]۔ دوسری طرف سخاوت اور حلم کے بادشاہ، داد و دہش میں ہاتھ نہیں رکتا تھا اور بُرد باری کی انتہا نہیں تھی۔ چنانچہ حضرت معاویہؓ کی ان صفات نے

---

[1] باقی چار کے نام ہیں: حضرت عمرو بن العاص، مغیرہ بن شعبہ، قیس بن سعد اور عبد اللہ بن بُدیل۔ ان میں سے ۱ حضرت معاویہؓ کے ساتھ تھے، ۲ غیر جانبدار اور ۳ و ۴ حضرت علیؓ کے ساتھ۔ طبری ج ۳ جز و ۶ ص ۹۳۔

تفرقہ کی خلیجوں کو پاٹنے اور اُس زمانے کی تلخ یادوں کو بھلانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ان کا بیس سالہ دورِ حکومت (۴۱ھ تا ۶۰ھ) بالعموم امن و عافیت اور مسلمانوں کی یکجہتی کے ساتھ گزرا اور مسلمان آپس کی جنگ سے چھٹی پا کر ان محاذوں کی طرف واپس چلے گئے جہاں وہ دشمنانِ اسلام کے خلاف مصروفِ جنگ ہوتے اور نئی فتوحات حاصل کرتے تھے۔ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں آپ کے حالاتِ زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"خلافتِ عمری اور خلافتِ عثمانی میں معاویہؓ کے ہاتھوں شامی محاذ پر جہاد اور فتوحات کا جوشاندار سلسلہ چلتا رہا تھا وہ اُس وقت بالکل رک گیا جب ان کے اور علیؓ کے درمیان معرکوں کا دور چلا۔ ان دنوں میں نہ اِن کے ہاتھ پر کوئی نئی فتح ہوئی نہ اُن کے ہاتھ پر۔۔۔ حتیٰ کہ حسنؓ کے ساتھ صلح ہوئی اور معاویہؓ کی خلافت پر جیسا کہ گزر چکا ہے ۴۱ھ میں، پوری اسلامی دنیا نے اتفاق کر لیا۔ اُس وقت سے لے کر اپنے سن وفات (۶۰ھ) تک وہ بے غل و غش حکمراں رہے۔ اس شان کے ساتھ کہ دشمن کی سرزمین پر جہاد ہو رہا ہے، حق کا پرچم بلند ہے، چاروں طرف سے مالِ غنیمت آرہا ہے اور مسلمان ان کے ساتھ آرام، انصاف اور عفو و درگزر کی فضا میں رہ رہے ہیں۔"[1]

حضرت معاویہؓ اور حضراتِ حسنینؓ

شیعہ علماء و مصنفین پر افسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے حُبِّ علیؓ کے نام پر معاویہؓ دشمنی میں حضرت معاویہؓ کی مسلّمہ صفاتِ حلم، سخاوت و سماحت اور ان پر مبنی تاریخی حقائق کو بھی جھٹلانے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہہ دیا کہ انہوں نے تو وہ وعدے بھی پورے نہیں کیے جو حضرت حسنؓ کے ساتھ شرائطِ صلح کے طور پر طے ہوئے تھے۔ حالانکہ ان کا معاملہ حضرت

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۲۹

حسنؓ ہی نہیں حضرت حسینؓ کے ساتھ بھی اس حد تک حسن سلوک اور رواداری کا تھا کہ اعلیٰ درجے کے حلم، تدبّر اور کریم النفسی کے بغیر اس کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے لئے خود انہی حضرات کی کتابوں میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ ایک مرتبہ یمن سے دمشق کو ایک سرکاری قافلہ بہت سا قیمتی سامان مثلاً یمنی چادریں، عنبر اور دیگر خوشبوئیات لے کر حسب معمول مدینے سے گزر رہا تھا۔ حضرت حسینؓ نے روک کر اس کا تمام مال اتروا لیا اور حضرت معاویہؓ کو یہ خط لکھ کر بھیج دیا کہ "ایسا ایسا قافلہ جو دمشق میں تمہارے خزانے بھرنے اور تمہارے باپ کی اولاد کا سامان عیش بننے کے لیے جا رہا تھا میں نے اُسے روک کر اس کا مال لے لیا ہے کیونکہ مجھے ضرورت تھی"۔[1] ہم یقین نہیں کر سکتے کہ حضرت حسینؓ نے ایسی نامناسب زبان اپنے خط میں استعمال فرمائی ہوگی، گمان غالب ہے کہ خط کو یہ زبان ان حضرات کی عطا کردہ ہے جو اس بات کے روادار نہیں کہ حضرت حسینؓ کو حضرت معاویہؓ کے ساتھ اس سے بہتر زبان میں مخاطب ہوتا ہوا دیکھیں۔ بہرحال ان حضرات کی روایت کے مطابق یہ خط حضرت حسینؓ نے حضرت معاویہؓ کو لکھا۔ اب دیکھیے کہ اس کا کیا اور کس انداز کا جواب حضرت معاویہؓ نے انہی حضرات کی روایت کے مطابق دیا:-

"اللہ کے بندے معاویہ کی طرف سے حسین بن علی کے نام۔ تمہارا خط ملا جس میں تم نے لکھا ہے کہ یمن سے آتا ہوا قافلہ روک کر اس کا سامان تم نے لے لیا ہے۔ لیکن تمہیں یہ چاہیے نہیں تھا جبکہ وہ میرے نام سے آ رہا تھا۔ کیونکہ یہ حق صاحب حکومت

---

[1] حیات الامام حسین بن علیؓ از باقر شریف القرشی۔ مطبوعۃ مؤسستہ الوفاء بیروت ج ۲ ص ۲۳۲۔ نیز مقتل الحسینؓ از عبدالرزاق الموسوی المقرم، مطبوعۃ دار الکتب الاسلامی بیروت حاشیہ ص ۱۲۳ بحوالہ شرح نہج البلاغۃ لابن حدید ج ۴ ص ۳۲۷ طبع اول۔ احتیاطاً خط کے عربی الفاظ کو بھی یہاں پڑھ لیجئے:-

من الحسین بن علی الیٰ معاویۃ بن ابی سفیان اما بعد! فانّ عیرًا مرّت بنا من الیمن تحمل مالاً وحُللاً وعنبرًا وطیبًا الیك، لتودعها خزائن دمشق وتعلّ بها بعد النهل بنی ابیك وانی احتجت الیها فاخذ تُها" والسّلام۔

(والی) کا ہے کہ مال اس کے ہاتھ میں آوے اور لے پھر وہی اسکو تقسیم کرے، اللہ جانتا ہے کہ
اگر تم اسکو میرے پاس آنے دیتے تو میں اس میں سے تمہارا حصہ دینے میں کوئی کمی نہ
کرتا، لیکن بھتیجے! بات یہ ہے کہ تمھارے دماغ میں ذرا تیزی ہے، کاش کہ یہ بس میرے
ہی زمانے تک رہے کیونکہ میں تمھاری قدر وقیمت جانتا ہوں اور ایسی باتوں سے
درگذر کر لیتا ہوں، ڈر لگتا ہے کہ (بعد میں) تمھارا واسطہ کسی ایسے سے نہ پڑ جائے
جو تمہیں کوئی چھوٹ دینے کو تیار نہ ہو"۔ [۱]

اس چھوٹی سی خط وکتابت سے کیا کیا بات ثابت ہوتی ہے، اس وقت اس سب کے
احاطہ کا موقع نہیں صرف اتنی بات یہاں کہنا مقصود ہے کہ حضرت معاویہؓ کا یہ جواب دیکھ کر
کسی ادنیٰ انصاف پسند کے لیے شبہ کی بھی گنجائش نہیں رہتی کہ وہ حضراتِ حسنین کے ساتھ پاس و
لحاظ اور کریم النفسی کے سوا کوئی دوسرا معاملہ کرتے ہوں گے، چہ جائیکہ وہ وعدے بھی پورے
نہ کریں جس پر حضرت حسنؓ نے خلافت کی جنگ سے دستبرداری دی تھی۔ [۲]

یہ دعوےٰ (یا یہ کہیے کہ حضرت معاویہؓ پر بد عہدی کا الزام) یوں تو شیعہ حضرات کے یہاں
عام ہے، لیکن بہت تعجب اس وقت ہوا جب اس مضمون کی تیاری کے سلسلے میں لکھنؤ کے

---

[۱] حوالۂ سابق۔ [۲] حضرت حسینؓ اور حضرت معاویہؓ کی یہ خط وکتابت اور جس واقعہ کے سلسلے میں یہ خط وکتابت ہوئی وہ واقعہ، یہ سب کچھ شیعہ کتب کے حوالے سے درج کیا گیا ہے اور خاص طور سے اسلیے درج کیا گیا ہے کہ انہی لوگوں کے بیان سے انکا یہ الزام غلط ثابت ہو جائے کہ حضرت معاویہؓ کا حضرت حسن حسین کے ساتھ معاملہ اچھا نہیں تھا اسکے سوا اس واقعہ اور خط وکتابت کو یہاں درج کرنے کا کوئی دوسرا مقصد کوئی معقول آدمی نہیں سمجھ سکتا مگر کتاب کا پہلا ایڈیشن (اردو) شائع ہوا تو کچھ لوگ جن کو کتاب کا ٹھیٹھ روایتی انداز سے ہٹا ہوا ہونا ناگوار گزرا ہے انھوں نے اس واقعہ اور خط وکتابت کو بیان کرنے کا یہ مطلب بھی نکال لیا ہے کہ مصنف حضرت حسینؓ کو (نعوذ باللہ) ایک لٹیرا بتانا چاہتا ہے۔ ایسے لوگوں کو جواب تو کہاں دیا جا سکتا ہے، ہاں دعائے خیر ان کے لیے کی جا سکتی ہے۔

شیعہ عالم جناب سید علی نقی (المعروف بہ نقن صاحب) کی تصنیف "شہید انسانیت" دیکھتے ہوئے اس دعوے کی دلیل میں تاریخ طبری کا حوالہ نظر سے گزرا، یہ حوالہ جزو ۶ ص ۹۳ کا ہے[1] طبری کے اس مقام پر واقعتہً یہ الفاظ پائے جاتے ہیں کہ "فَلَمْ يُنَفِّذْ لِلْحَسَنِ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنَ الشُّرُوطِ شَيْئًا"۔ جن کا ترجمہ اگر کوئی چاہے تو بے شک ان الفاظ میں کرسکتا ہے کہ "جتنی شرطیں طے کی گئی تھیں ان میں سے کوئی ایک بھی (معاویہؓ نے) پوری نہیں کی"۔ لیکن اہل علم سے بعید ہے کہ وہ طبری کے اس جملہ کا حوالہ اس مقصد کے لیے دیں کیونکہ اسی تاریخ طبری میں ایک صفحہ پہلے ص ۹۲ پر گزر چکا ہے کہ:۔

وقد صالح الحسن معاویۃ علیٰ ان جَعَلَ لہ ما فی بیت مالہ وخراج دار ابجرد علیٰ ان لا يُشْتَمَ علیٌّ وهو يسمع فاخذ ما فی بیت مالہ بالکوفۃ وکان فیہ خمسۃ آلاف الف۔

اور حسنؓ نے معاویہؓ سے صلح اس شرط پر کی تھی کہ کوفے کے بیت المال میں جو کچھ ہے وہ ان کا ہوگا نیز داراب گرد[2] کا خراج ان کو ملا کرے گا اور ان کے سامنے حضرت علیؓ پر سب وشتم نہیں ہوا کریگا پس انھوں نے وہ تمام رقم لے لی جو کوفے کے بیت المال میں تھی اور وہ پچاس لاکھ (درہم) تھی۔

اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ کوئی ایک شرط بھی پوری نہیں کی گئی۔

ایک صفحہ آگے چل کر یعنی ص ۹۳ پر طبری نے جن شرائط کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ پوری نہیں کی گئیں، ان کا قصہ دوسرا تھا۔ وہ قصہ طبری ہی کے بیان کے مطابق یہ تھا کہ یہ شرائط جن کا بیان آیا، یہ تو وہ تھیں جو حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہؓ سے صلح کی خواہش کرتے ہوئے ان کو لکھ کر بھیجی تھیں۔ ادھر حضرت معاویہؓ خود نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے درمیان

---

[1] شہید انسانیت ص ۲۳، ۲۴۔ سید العلماء اکادمی لکھنؤ۔ [2] شہر کا نام ہے عربی میں اسکو دار ابجرد لکھا گیا ہے مگر مولانا شبلی کی الفاروق سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی میں اس کا اصل نام داراب گرد ہے۔

کشت وخون کا سلسلہ چلتا رہے۔ چنانچہ قبل اس کے کہ حضرت حسنؓ کا مراسلہ ان تک پہنچے انہوں نے خود دو آدمی ایک سادہ کاغذ پر دستخط کر کے اس پیغام کے ساتھ بھیجے تھے کہ حسنؓ جو شرائط صلح چاہیں اس کاغذ پر لکھ دیں مجھے منظور ہیں۔ چنانچہ حضرت حسنؓ نے اس کاغذ پر کچھ نئے شرائط بھی بڑھا کر لکھ دیئے۔ یہ تھے وہ شرائط جن کے بارے میں طبری کی ص۹۳ کی روایت بتا رہی ہے کہ:۔

فاختلفا فی ذالك فلم ینفذ	ان شرائط کے بارے میں اختلاف ہوا
للحسن علیہ السلام ۔ الخ	اور ان میں سے کوئی شرط معاویہؓ نے پوری نہیں کی۔

مولانا نقوی صاحب نے اس پورے واقعہ کو قلم انداز کر دیا ہے اور افسوس ہے کہ اسی ایک جگہ نہیں اور بھی بہت سی جگہوں پر موصوف نے اسی طرح کا معاملہ شیعہ مزعومات کو نباہنے کیلئے اپنی اس تصنیف میں کیا ہے۔ جن میں سے بعض کا ذکر اپنے موقعہ پر آئے گا

بہرحال شرائطِ صلح پورے نہ کیے جانے کی بات بڑی زیادتی ہے، ایک شرط کے بالکل نقد ایفاء کا ذکر تو طبری کی مذکورہ بالا روایت میں آگیا ہے، دوسری شرط داراب گرد کا خراج، اس کے بارے میں طبری کے اندر کوئی مزید روایت نہیں ملتی۔ لیکن دوسرے ذرائع مثلاً ابن اثیر کی تاریخ کامل اور ابن کثیر کی البدایہ والنہایہ سے معلوم ہوتا ہے کہ داراب گرد جس کا تعلق بصرہ کی ولایت سے تھا اس کے خراج والی شرط پر بصرہ کے لوگ معترض ہوئے کہ یہ خراج تو ہمارا حق ہے یہ کسی اور کو نہیں دیا جانا چاہیے۔ ابن اثیر نے بس اتنی ہی بات بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ لیکن ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے اس کے بدلے میں ان کو سالانہ سرچھ ہزار کے بدلے میں ایک ہزار دینار منظور کیے جو حضرت حسنؓ اپنے حین حیات دمشق کے سالانہ سفر میں علاوہ دیگر عطیات وتحائف کے وصول فرماتے رہے[1]۔

---

[1] فعوضہ معاویۃؓ عن کل سنۃ آلاف الف درھم فی کل عام فلم یزل یتناول مع مالہ فی کل زیادۃ من الجوائز والتحف الی ان توفیؓ ۔ البدایہ والنہایۃ ج ۸ ص۲۵ ۔

رہی تیسری شرط کہ (کم ازکم) حضرت حسنؓ کی موجودگی میں حضرت علیؓ پر سب وشتم نہ کیا جائے اس کے بارے میں ابن اثیر کا بیان ہے کہ یہ شرط پوری نہیں کی گئی[1] اور تنہا یہ ایک بیان یہ تاثر دینے کے لیے کافی ہے کہ ابن اثیر بھی انہی مؤرخین میں سے ہیں جن پر حضرت علیؓ حسن وحسین (رضی اللہ عنہم) اور حضرت معاویہؓ ویزید کے درمیان والے معاملات میں آنکھ بند کر کے اعتماد نہیں کیا جانا چاہیے۔ کیونکہ یہ بیان اگر صداقت پر محمول کر لیا جائے تو ہمیں یہ ماننے کے لیے تیار ہونا پڑے گا کہ (معاذ اللہ) حضرت حسنؓ کو غیرت اور عزتِ نفس کی کوئی ادنیٰ مقدار بھی دربار حق تعالیٰ سے عطا نہیں ہوئی تھی، ان کے والد ماجد کو حضرت معاویہؓ اور ان کے لوگ منہ پر برا بھلا کہتے تھے اور حضرت حسنؓ اس کے باوجود کبھی ایک حرف شکایت بھی منہ پر لائے بغیر ہر سال دمشق جا کر مقررہ وظائف وتحائف انہی حضرت معاویہؓ کے ہاتھ سے وصول کیا کرتے تھے ایکسے ممکن ہے کہ اتنی نامناسب بات، جو شرائط صلح کے بھی خلاف تھی، حضرت معاویہؓ اور ان کے حکام کے طرزِ عمل میں شامل رہے اور حضرت حسنؓ ۹-۱۰ سال تک[2] اسے خاموشی سے برداشت ہی نہ کرتے رہیں بلکہ حضرت معاویہؓ کی خدمت میں سالانہ حاضری بھی دیتے رہیں اور ان سے تحائف وظائف لینا گوارا کرتے رہیں۔؟

ابن اثیر ہی نے داراب گرد کے خراج کے سلسلے میں اہل بصرہ کے اعتراض کی بابت یہ بھی لکھ دیا ہے کہ اس میں خود حضرت معاویہؓ کا اشارہ بھی شامل تھا مگر اس کا کوئی ثبوت؟ نہ ثبوت ہے نہ حوالہ۔ حالانکہ اگر اس بیان میں کچھ واقعیت ہوتی تو نہ تو یہ ممکن تھا کہ حضرت حسنؓ کو مصالحت کے وقت سے لیکر اپنی وفات تک (۹-۱۰ سال کے عرصے میں) اس کا پتہ نہ چلتا، جبکہ بصرہ بھی کوفے کی طرح آپ کی اور آپ کے والد ماجد کی عملداری کا حصہ رہا تھا، اور نہ ہی یہ بات قابل تصور ہے کہ سب کچھ جانتے بوجھتے آپ چھ ہزار سالانہ کی جگہ ایک ہزار سالانہ پر خاموشی سے راضی رہتے ـــــ اور حضرت حسنؓ کے بارے میں اگر کسی

---

[1] ج ۳ ص ۲۰۳ مطبوعہ دارالفکر بیروت ۱۹۸۷ء۔ [2] صلح ۴۱ھ میں ہوئی اور حضرت حسنؓ کی وفات ۵۰ھ میں۔

طرح ان کی نرم طبیعت وغیرہ کے حوالے سے شرائطِ صلح کی یہ سب مبیّنہ کھلی اور چھپی خلاف ورزیاں قابلِ تحمل بھی مان لی جائیں تو حضرت حسینؓ کے بارے میں تو یہ تصوّر قطعی طور پر ناقابلِ قبول ہے ـــــ اُن کا مزاج بالکل مختلف تھا وہ سرے سے صلح کے ہی روادار نہ تھے۔ بس حضرت حسنؓ کے فیصلے سے مجبور ہو گئے تھے، ابن کثیر نے لکھا ہے کہ:۔

"جب خلافت حضرت حسنؓ کے ہاتھ میں آئی اور انھوں نے مصالحت کا فیصلہ کیا تو حضرت حسینؓ کو یہ فیصلہ بہت شاق گذرا۔ وہ اپنے بھائی کی رائے کو بالکل صحیح نہیں سمجھتے تھے اور مُصر تھے کہ اہلِ شام سے قتال جاری رہے (ان کا اصرار اور صلح کی مخالفت یہاں تک تھی کہ) حضرت حسنؓ کو کہنا پڑا کہ میں سوچتا ہوں کہ تمھیں گھر میں بند کر دوں اور جب تک مصالحت کی کاروائی سے پوری طرح فارغ نہ ہو جاؤں باہر نہ نکالوں۔" [۱]

ایک روایت میں اس اختلاف رائے کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت حسینؓ نے صلح کی بات سن کر حضرت حسنؓ سے کہا کہ "میں آپ کو قسم دیتا ہوں کہ اپنے باپ کو جھوٹا اور معاویہ کو سچا مت ٹھہرائیے اس پر حضرت حسنؓ نے یہ کہہ کر ان کو خاموش کیا کہ میں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔" [۲]

الغرض حضرت حسینؓ کا مزاج بالکل مختلف تھا، ان کے لیے کسی بھی طرح نہیں سوچا جا سکتا کہ وہ ایسے حالات اور معاملات کے ہوتے ہوئے حضرت معاویہؓ کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنا گوارا کر سکتے تھے، حالانکہ اسی البدایہ والنہایہ میں مذکورہ بالا بیان کے بعد مذکور ہے کہ:۔

"حسن کا یہ رویّہ دیکھ کر حسین نے خاموشی اور موافقت اختیار کر لی اور پھر جب خلافت کی باگ ڈور پوری طرح معاویہ کے ہاتھ میں آگئی تو اپنے بھائی حسن کے ساتھ حسین

---

[۱] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۶۳ [۲] ابن اثیر ج ۳ ص ۲۰۳۔

بھی معاویہ کے پاس آتے جاتے تھے اور معاویہ دونوں کا غیر معمولی اکرام فرماتے تھے مرحبًا و اہلًا سے استقبال فرماتے اور بڑے بڑے عطیات دیتے۔"[1]
حتیٰ کہ حضرت حسن کا انتقال (سنہ ۵۰ھ میں) ہو گیا تب بھی حضرت حسین نے حضرت معاویہ کے پاس سالانہ تشریف بری کا معمول تن تنہا ہی قائم رکھا۔[2]

الغرض حضرت معاویہ اور حضرات حسنین کے درمیان جو حسن تعلق کی صورت اور بالخصوص حضرت معاویہ کی طرف سے اکرام و عطا کی جو روش ان کی خلافت کے پورے عرصے میں برقرار رہی، وہ نہ صرف اس الزام کی قطعی تردید کرتی ہے کہ حضرت معاویہ نے شرائط صلح کا احترام نہیں کیا تھا بلکہ ان بیانات کے لیے ایک تصدیق بھی فراہم کرتی ہے جو حضرت معاویہؓ کے حلم و عفو اور داد و دہش کے غیر معمولی اوصاف کے سلسلے میں مؤرخین کے یہاں ملتے ہیں۔[3]

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص۱۴۳۔ [2] ولما توفی الحسن کان الحسین یفد الی معاویۃ فی کل عام فیعطیہ ویکرمہ۔ حوالہ سابق۔ [3] مثلاً حضرت علیؓ کے دست راست حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول ہے جو طبری نے نقل کیا ہے کہ "میں نے حکومت کے لیے معاویہؓ سے بڑھ کر موزوں آدمی نہیں دیکھا کہ لوگوں کے ساتھ بیحد کشادہ دلی کا برتاؤ کرتے تھے" (ج ۶ ص۱۸۸) یا خود حضرت معاویہؓ کا قول اپنے بارے میں جو حلم و عفو کی ایک آزمائش کے موقع پر انکی زبان پر آیا کہ "مجھے گوارا نہیں کہ کوئی خطا میرے عفو سے بڑھ جائے اور کوئی جہالت میرے حلم سے یا کسی کی کوئی کمزوری ایسی بھی ہو جائے جس کی میں پردہ داری نہ کر سکوں اور کسی کی بدسلوکی ایسی جس کا جواب میں حسن سلوک سے نہ دے سکوں۔" (ایضاً ص۱۸۷) ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ ج ۸ میں پورے ایک صفحے (۱۴۸) پر حضرت معاویہؓ کے انہی اوصاف میں متعدد بیانات اور واقعات نقل کیے ہیں اور اپنے طور پر ان الفاظ میں ان کی ثنا بیان کی ہے کہ ... "یعنی انہ کان جید السیرۃ حسن التجاوز جمیل العفو کثیر الستر رحمہ اللہ" مختصر یہ کہ وہ عمدہ سیرت کے مالک، نہایت اعلیٰ عفو درگذر کرنے والے اور عیوب کی بہت ہی پردہ داری کرنے والے تھے۔ (ج ۸ ص۱۲۷)

بابِ دوم

کوفی مزاج ــــ ریشہ دوانیاں ــــ اور حضرت حسین رضؓ

حضرت معاویہؓ کے بارے میں یہ تھوڑی سی گفتگو بالکل ضمناً آگئی ورنہ اصل مدعا تو اُن حالات اور اسباب کی تحقیق تھی جن کے نتیجے میں حضرت معاویہؓ کا بیس سالہ پُرامن و پُرسکون دور ختم ہوتے ہی واقعہ کربلا جیسا سانحہ وجود میں آگیا۔ اسی تحقیق کے سلسلے میں اہلِ کوفہ کے مزاج و کردار کی خصوصیات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔

اہلِ کوفہ

کوفہ کی بنیاد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، کے دور میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے ہاتھوں سے پڑی تھی جو کسریٰ (فارسی) حکومت کے خلاف اسلامی جہاد کے کمانڈر تھے۔ وہ مختلف عرب قبائل جو عراق کے محاذ پر مصروفِ جہاد تھے اُنہی کے خاندانوں سے یہ نیا شہر آباد کیا گیا۔ اور اس طرح یہ مسلمانوں کی سب سے بڑی چھاؤنی اور ان کی جنگی طاقت کا مرکز بن گیا۔ لیکن اس خصوصیت کے ساتھ اس شہر کی یہ خصوصیت بھی رہی کہ ا[س] کے شہریوں میں بڑی تلوّن مزاجی اور بے سرے پن کی سی کیفیت پائی جا[تی تھی]۔ اپنے حکّام سے بیحد جلدی ناراض ہو جاتے اور مرکز سے شکایتیں کرکے

نئے حاکم کا مطالبہ کرنے لگتے تھے۔ یہ حال حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے پورے زمانے میں رہا۔ بلکہ عثمانی خلافت کے آخری دنوں میں تو ان کا مرض بڑھ کر اس کھلی سرکشی اور شوریدہ سری تک پہنچا کہ حضرت عثمانؓ کی خلافت ہی نہیں اُن کی جان بھی اسی کی بھینٹ چڑھ گئی۔ اور اپنے ہی جیسے مصری اور بصری مفسدوں کے ساتھ مل کر ان لوگوں نے مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم میں خوف و دہشت کی وہ فضا قائم کی کہ خلیفۃ الرسول کی تدفین بھی بمشکل تین دن بعد رات کے اندھیرے میں مسلمانوں کے عام قبرستان جنت البقیع سے الگ ایک احاطے میں کی جاسکی۔ جسے عہد اموی میں جنت البقیع سے ملایا گیا۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت سے دو سال پہلے کے واقعات میں تاریخ کچھ کوفیوں کا نام لے کر بتاتی ہے کہ انہوں نے حکام کے خلاف شکایتوں کے اظہار سے بڑھ کر خود ادارۂ خلافت کو "قریشی سلطنت" کا نام دینا شروع کر دیا۔ امیر کوفہ سعید بن العاص نے اس فتنہ پردازی کے خلاف کاروائی کی اجازت یا جو کچھ اور مناسب سمجھا جائے اس کی ہدایت مانگی۔ حضرت عثمانؓ نے مناسب سمجھا کہ ان کو شہر بدر کر کے حضرت معاویہؓ کے پاس دمشق بھیج دیا جائے کہ وہ شاید ان کا کچھ علاج کر سکیں گے۔ مگر ان کے مرض کے مقابلہ میں حضرت معاویہ کی حکمت اور مہارت بھی کام نہ دے سکی۔ تب یہ لوگ حمص میں جہاں عبدالرحمٰن بن خالدؓ بن ولید امیر تھے، بھیجے گئے اور ان کے طریقۂ علاج (سختی) سے بظاہر یہ لوگ ٹھیک اور تائب ہو گئے مگر واقعے میں ایسا نہیں تھا۔ چنانچہ جیسے ہی کوفے میں کچھ اور لوگ ان کی والی صدا بلند کرنے کو کھڑے ہوئے تو یہ فوراً ہی نمودار ہو گئے اور پھر جب مصر اور بصرے میں انہی کی طرح سے مرکزی حکومت کے خلاف شکایتیں پالنے والے لوگ بھی ابن سبا کی سازشی تحریک کے ذریعہ ایک رابطے میں مربوط ہو گئے تب یہ سب ۳۵ھ میں حج کے سفر کا ڈھونگ رچا کر مدینے

پر جا چڑھے اور ۱۸ ذی الحجہ کو حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا۔ دو ڈھائی ہزار کے قریب ان سب کی تعداد بتائی گئی ہے۔[1] یہ سب جھوٹ یا سچ حضرت علیؓ کا دم بھرتے تھے۔ چنانچہ بعد میں حضرت علیؓ کی بیعت بھی کی اور پھر جنگِ جمل اور جنگِ صفین میں آپ کے ساتھ نکلے اور جب جنگِ جمل سے پہلے فریقین کی نیک نیتی کی بنا پر صلح کی شکل پیدا ہو گئی تو سبائیوں نے اس صلح کو تباہ کرنے کی وہ کوشش کی جس کا ذکر گذشتہ باب میں آچکا ہے۔ تاریخ کے بیان کے مطابق اس میں شب خون مارنے کا اصل کردار کوفیوں ہی نے ادا کیا (ملاحظہ ہو ابن اثیر) اور پھر انہی کی بدولت صفین میں حضرت علیؓ جنگ بند کرنے پر مجبور ہوئے اور بعد میں آپ کا ہر دن ایسا گذرا کہ کہا جا سکتا ہے، آپ نے باقی وقت ان کے ساتھ رو رو کر پورا کیا۔ آپ کے اس دور کے خطبوں میں بار بار ایسے جملے ملتے ہیں کہ "سب سے بڑا دھوکہ کھانے والا وہ ہے جو تمہارے دھوکہ میں آیا۔"[2]

ایک خطبہ میں ہے:۔

ایها الفرقة التی اذا امرت لم تطع واذا دعوت لم تجب ان امهلتم خضتم وان حوربتم خرتم وان اجتمع النّاس علیٰ امام طعنتم.......... لا بالغیرکم۔[3]	اے وہ گروہ کہ جب بھی میں نے کسی بات کا حکم دیا اس نے نافرمانی کی، اور جب کسی کام کی طرف بلایا لبیک نہ کہی، ذرا مہلت مل جاتی ہے تو فضولیات میں لگ جاتے ہو اور جب دشمن حملہ آور ہو تو بزدلی دکھاتے ہو اور جب لوگ کسی امام پر جمع ہو جائیں تو تم کیڑے نکالتے ہو۔۔ ہائے افسوس تم پر۔

---

[1] مزید تفصیل کیلئے دیکھیے تاریخ ابن اثیر اور تاریخ طبری۔ [2] نہج البلاغة ج ۱ ص۸۷ دار المعرفة [3] ایضاً ج ۲ ص۱ نہج البلاغة ایسے ارشادات سے بھری پڑی ہے اگر کوئی چاہے تو جلد اول ہی کا مطالعہ کافی ہوگا۔

یہی لوگ تھے کہ حضرت علیؓ کی زندگی میں جنگ سے جی چراتے اور آپ کے احکام سے سرتابی کرتے رہے اور جب حضرت حسنؓ نے مصالحت کی تو ان کے خیمے پر حملہ کر دیا۔ سامان بھی لوٹا اور زخم بھی لگایا[1] ظاہر ہے کہ ان لوگوں کا حضرت معاویہؓ کے ساتھ کیسے گزارا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ حضرت معاویہؓ کے حلم نے اگر کہیں جواب دیا تو یہ کوفہ والوں ہی کے ساتھ ہوا۔

الغرض اس امن و امان اور اسلامی جمعیت کی بحالی کے دور میں اگر کہیں سے کچھ خلفشار پیدا کرنے کی خواہش اور جستجو ہوتی رہی تو وہ کوفہ ہی کی سرزمین سے تھی۔ حضرت حسینؓ کے متعلق ان لوگوں کو معلوم تھا کہ مصالحت سے وہ خوش نہ تھے۔ بس حضرت حسنؓ کے دباؤ سے مجبور رہو گئے تھے جیسا کہ اس سلسلے میں اوپر تاریخی بیان گزر چکا ہے۔ حضرت حسنؓ کی وفات کے بعد ان لوگوں نے سمجھا کہ اب حضرت حسینؓ کو آمادۂ جنگ کرنے کا وقت آگیا ہے۔ چنانچہ البدایہ والنہایہ کی روایت کے مطابق :۔

وقدم المسیّب بن عتبه الفزاری فی عدة معه الحسین بعد وفاة الحسن فدعوه الی خلع معاویة۔[2]	مُسیَّب بن عُتبہ فزاری حضرت حسنؓ کی وفات کے بعد مع کئی اور آدمیوں کے حضرت حسینؓ کے پاس آیا اور ان لوگوں نے آپکو حضرت معاویہ کی بیعت توڑنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔

پھر یزید کے لیے ولی عہدی کی بیعت کا قصہ کھڑا ہوا تب ان لوگوں نے ازسر نو یہی کوشش کی۔

لمّا بایع الناس معاویة لیزید کان حسین ممّن لم	جب لوگوں نے (عام طور پر) یزید کیلئے معاویہؓ سے بیعت کر لی تو حضرت حسینؓ

[1] طبری ج ۶ ص۹۳ ابن اثیر ج ۳ ص۲۰۳ [2] ج ۸ ص۱۶۵ ۔

یبایع لہٗ۔ وکان اھل الکوفۃ یکتبون الیہ یدعونہٗ الیٰ الخروج الیھم فی خلافۃ معاویۃ۔ [۱]	ان لوگوں میں تھے جنھوں نے نہیں کی اور (اسی بناپر) اہل کوفہ معاویہؓ کے زمانے میں حسینؓ کو لکھتے رہے تھے کہ (مدینے سے نکل کر) ان کے پاس آجائیں۔

آگے ابن کثیر لکھتے ہیں :۔

کل ذالک یأبیٰ علیھم [۲]	حسینؓ نے ہر بار ہی ان کی اس بات کو قبول کرنے سے انکار کیا۔

حضرت حسینؓ کی رائے

لیکن حضرت حسینؓ کے اس انکار سے یہ سمجھ لینے کی گنجائش نہیں ہے کہ آپ کی اس رائے میں تبدیلی آگئی تھی جس رائے کی بناپر آپ نے اپنے برادر بزرگ حضرت حسن کی مصالحت پسندی سے اختلاف فرمایا تھا۔ بلکہ دوسرے تاریخی بیانات کی روشنی میں نظر آتا ہے کہ آپ کی رائے میں تو کوئی فرق نہیں آیا تھا البتہ جو بیعت آپ حضرت حسن کے ساتھ حضرت معاویہ سے کر چکے تھے یا تو اس کا احترام آپ کو کسی ایسے اقدام سے مانع تھا جس کی طرف اہل کوفہ بلاتے تھے یا آپ کی رائے میں اب وہ قابلِ احترام تو نہیں رہی تھی مگر مصلحت نہیں معلوم ہوتی تھی کہ ایسا اقدام کیا جائے۔ تاریخ کے بیانات سے دونوں ہی امکانات سامنے آتے ہیں۔ البدایہ والنہایہ میں ہے کہ جب کوفیوں نے حضرت حسین کے پاس فتنہ انگیز آمدورفت شروع کی تو مدینے کے گورنر مروان نے حضرت معاویہ کو اس کی اطلاع دیتے ہوئے خطرات کی پیش بندی کی طرف توجہ دلائی اس پر حضرت معاویہ نے حضرت حسین کو لکھا کہ :

انّ من اعطی اللّٰہ صفقتہ	جس شخص نے اللہ کو قول وقرار دیا ہو

---

[۱] البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص ۱۶۵ [۲] ایضاً

یمینٍ وعهد بالجدیر بالوفاء وقد أنبئت ان قوماً من اهل الکوفة قد دعوك الی الشقاق واهل العراق من قد جرّبت قد افسد واعلی ابیك واخیك فاتق الله واذکر المیثاق فانك متی تکدنی اکدك۔[1]

(یعنی بیعت کی ہو) اسکو لائق ہے کہ وفائے عہد کرے، مجھے اطلاع دی گئی ہے کہ کوفہ کے کچھ لوگوں نے تمھیں فتنہ آرائی کی دعوت دی ہے حالانکہ یہ اہل عراق وہ ہیں جنکو تم خوب جانتے ہو کہ انھوں نے تمھارے باپ اور بھائی کو کس فساد میں ڈالا پس اللہ سے ڈرو، عہد یاد رکھو اور یہ کہ اگر تم نے میرے خلاف کوئی قدم اٹھایا تو میں بھی اٹھاؤنگا۔

اس خط پر حضرت حسین کا جواب یہ نقل کیا گیا ہے

اتانی کتابك وانا بغیر الذی بلغك عنّی جدیرٌ والحسنات لا یهدی لها الّا الله وما اردت لك محاربةً ولا علیك خلافاً وما اظن لی عند الله عذرًا فی ترك جهادك وما اعلم فتنةً اعظم من ولا یتك امر هٰذه الامّة۔[2]

تمھارا خط ملا۔ معلوم ہونا چاہیے کہ میرا حال اس سے مختلف ہے جو تمھیں میرے متعلق معلوم ہوا ہے۔ اور یہ بس اللہ کا فضل ہے جسکے سوا نیکیوں کی ہدایت دینے والا اور کوئی نہیں، میں تمھارے خلاف کسی محاذ آرائی اور مخالفت کا ارادہ نہیں رکھتا ہوں۔ اگرچہ میں نہیں جانتا کہ تمھارے خلاف جہاد نہ کرنے کیلئے میرے پاس اللہ کے سامنے کیا عذر ہوگا اور میں نہیں جانتا کہ اس سے بڑھ کر اور فتنہ کیا ہو سکتا ہے کہ تمھارے ہاتھ میں اس امت کی سربراہی ہو۔

---

[1] ج ۸ ص۱۷۵ [2] ایضاً۔

اس جواب کے سخت لہجے کے باوجود یہی اندازہ ہوتا ہے ــــ خاص کر پہلے فقرے کی روشنی میں ــــ کہ حضرت حسین کے لیے اصلاً یہی بیعت مانع تھی۔ اور اس کو توڑ ڈالنے کا خیال آپ نے اپنے آپ سے بعید اور اپنے لیے نازیبا قرار دیا تھا۔ لیکن کوئی شخص آخری فقروں کا سہارا لیکر کہنا چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ بیعت کا خیال مانع نہیں تھا بلکہ بات مصلحت وقت کی تھی جو مانع ہو رہی تھی۔ یعنی حضرت معاویہ کے اقتدار کے استحکام کو دیکھتے ہوئے کسی مخالف اقدام کی کامیابی کا امکان نظر نہیں آتا تھا۔ اور شیعہ حضرات یہی کہتے ہیں، کیونکہ وہ تو سرے سے بیعت ہی کا انکار کرنا چاہتے ہیں۔ حیاۃ الامام الحسین، جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے، کے شیعہ مصنّف باقر شریف القرشی لکھتے ہیں کہ :-

ولم یکن من رائ الامام الخروج علی معاویۃ، وذالك لعلمہ بفشل الثورۃ وعدم نجاحھا۔[1]	امام حسین کی رائے میں معاویہ کے خلاف خروج مناسب نہیں تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ کامیابی نہیں ہوگی۔

اس کے بعد الاخبار الطوال ص۲۰۳ اور انساب الاشراف (ج ا ق ا) کے حوالے سے آپ کا یہ خط بھی نقل کیا ہے جو اہل کوفہ کی طرف سے خروج کی دعوت کے جواب میں لکھا گیا تھا :-

.... واما انا فلیس رأیی الیوم ذالك، فلصقوا رحمکم اللہ بالارض واکمنوا فی البیوت واحترسوا من الظنّۃ ما دام معاویۃ حیًّا فان یحدث اللہ بہ حدثًا	اور جہاں تک میرا تعلّق ہے تو فی الحال میری رائے اس کی (خروج کی) نہیں ہے۔ پس تم لوگ، جب تک کہ معاویہ زندہ ہیں، زمین سے چپکے رہو، گھروں میں قرار پکڑو اور کسی طرح کے شک و شبہ کا ماحول مت پیدا کرو۔ ہاں

---

[1] حیاۃ الامام حسین ج ۲ ص۲۳۰۔

وانا حیٌّ کتبت الیکم برأئی ۔ [1]	اگر معاویہ کو کچھ ہو گیا اور میں اس وقت زندہ ہوا تو میں تمھیں اپنی رائے سے آگاہ کروں گا ۔

اس خط کا انداز بظاہر اُن لوگوں کی تائید میں جا رہا ہے جو سمجھتے ہیں کہ حضرت حسینؓ کا عدم خروج بر بنائے حالات و احتیاط تھا نہ کہ اُس بیعت کے احترام میں جو آپ نے حضرت حسنؓ کے ساتھ حضرت معاویہ کے ہاتھ پر کی تھی ۔

بہر حال جو بھی واقعہ ہو، اس بات میں شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ حضرت حسینؓ کا یہ رویہّ بس حضرت معاویہؓ کی زندگی تک کے لیے تھا۔ حضرت معاویہؓ نے اپنے بعد کے لیے جب بطور ولی عہد اپنے بیٹے یزید کا تقرر کیا اور چاہا کہ لوگ اُسے قبول کرلیں تو حضرت حسینؓ کا اس کو قبول کرنے اور یزید کے لیے بطور ولی عہد بعیت کرنے سے انکار اسی بات کی ایک علامت تھی کہ وہ اپنے آپ کو آئندہ کسی اقدام کے لیے آزاد رکھنا چاہتے تھے اور اس میں کچھ نہ کچھ دخل کوفیوں کا بلاشبہ تھا جیسا کہ مذکورہ بالا تاریخی بیانات سے ظاہر ہوتا ہے ۔

بابِ سوم

یزید کی ولی عہدی کی تجویز اور حضرت مغیرہؓ بن شعبہ

مؤرخین (طبری، ابن اثیر، ابن کثیر وغیرہ) کے بیان کے مطابق ۵۶ھ میں (یعنی اپنے انتقال سے ۴ سال پہلے) حضرت معاویہؓ نے طے کیا کہ اپنے بعد زمام خلافت سنبھالنے کے لیے یزید کو نامزد کر جائیں اور اس نامزدگی کے لیے رعایا سے رضامندی بھی حاصل کرلیں جس کی شکل اس زمانے میں بیعت تھی۔ تاکہ بعد میں کوئی جھگڑے قضیے کی صورت نہ پیدا ہو۔ حضرت معاویہ کی اس کوشش کی بابت آتا ہے کہ:۔

وفیھا دعا معاویۃ الناس الی البیعۃ لیزید ولدہ ان یکون ولیّ عھدہ من بعدہ ...... فبایع لہ الناس فی سائر الاقالیم الاّ عبد الرحمٰن بن ابی بکر وعبد اللہ بن عمر والحسین بن علی وعبد اللہ بن زبیر وابن عباس[1]	اور اسی سنہ (۵۶) میں معاویہ نے تحریک کی کہ لوگ انکے بعد کیلئے انکے بیٹے یزید کی ولی عہدی کے لیے بیعت کریں..... پس تمام اقلیموں میں لوگوں نے اس کیلئے بیعت کرلی۔ سوائے عبدالرحمٰن بن ابی بکر کے اور سوائے عبداللہ بن عمر حسین بن علی، عبداللہ بن زبیر اور عبداللہ بن عباس کے۔

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص۸٦۔

جہاں تک یزید کی ولی عہدی کے لیے نامزدگی کا تعلق ہے وہ ایک یقینی واقعہ ہے اسی طرح حضرت حسین کا اس کو قبول کرنے سے انکار بھی ایک قطعی واقعہ ہے۔ مگر ان دونوں باتوں کی جو تفصیلات ہماری تاریخی کتابوں میں آتی ہیں ان میں ایک بڑا حصہ ناقابلِ یقین ہے۔ یہ تفصیلات چونکہ خوب شہرت پا چکی ہیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ اس موقع پر تھوڑی سی گفتگو ان تفصیلات پر ہو جائے۔ اس باب میں ہم پہلے واقعے کی تفصیلات پر گفتگو کریں گے۔

ولی عہدی کی تجویز

یزید کو ولی عہد بنائے جانے کی تجویز کے سلسلے میں روایت بیان کی جاتی ہے کہ یہ تجویز صحابی رسولؐ حضرت مغیرہ بن شعبہ نے پیش کی تھی اور اس کا پسِ منظر خالص ایک خود غرضانہ اور نفس پرستانہ پس منظر تھا۔ ایسی خود غرضی اور نفس پرستی کہ اس میں اسلام اور ملّتِ اسلام کی بدخواہی بھی انھیں بخوشی منظور ہوئی[1] (العیاذ باللہ)

حضرت مغیرہؓ کا مقامِ صحابیت

یہ مغیرہؓ بن شعبہ کون ہیں؟ ان اصحابِ کرام میں سے ہیں جنھیں ۶ھ میں صلح حدیبیہ کے موقع پر بیعتِ رضوان[2] میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہے[3]۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اصحابِ نبیؐ کی وہ بیعت ہے جس کے بارے میں قرآن پاک نے بشارت دی کہ

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ (الفتح آیت ۱۸)	بیشک اللہ راضی ہوا ان مسلمانوں سے جب کہ (اے نبی) وہ درخت کے نیچے تمھارے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے۔

---

[1] روایت کی تفصیل آگے آتی ہے۔ [2] یعنی وہ بیعت جس پر رضائے الٰہی کی بشارت نازل ہوئی۔ [3] الاصابہ لابن حجر ج ۶ ص ۱۳۱، سیر اعلام النبلاء از حافظ ذہبی ج ۳ ص ۱۲۱ (بیروت) البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۵۲-۴۸

اور پھر اس صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت مغیرہ صرف شرکاءِ بیعت ہی میں نہ تھے بلکہ ان کا ایک اور خاص قابلِ ذکر کردار بھی اس موقع پر تھا جو ان کے ایمانی مرتبے کا اظہار کرتا ہے، وہ کردار یہ ہے کہ اس صلح کے موقع پر قریش مکہ کی طرف سے جو صاحب سفیر ہو کر گفتگو کے لیے آئے تھے وہ حضرت مغیرہ بن شعبہ کے چچا عروہ بن مسعود ثقفی تھے۔ عروہ بن مسعود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو شروع کی تو ان کا ہاتھ بڑھ بڑھ کر بار بار آنحضرت کی ریش مبارک تک پہنچتا تھا۔ مغیرہ بن شعبہ تلوار لیے اور آہنی خود پہنے، جس میں چہرہ بھی چھپا ہوا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کھڑے ہوئے تھے۔ اپنے چچا کے اس طرزِ گفتگو پر تڑک کر بولے کہ "اپنا ہاتھ روک لو قبل اس کے کہ اس سے ہاتھ دھو بیٹھو" عروہ بن مسعود جو طائف اور مکہ کی نہایت مؤثر شخصیت تھے، اس جملے پر سناٹے میں آ گئے۔ آنحضرت سے مخاطب ہو کر بولے کہ محمد! یہ کون شخص ہے؟ کس قدر بے تکی زبان میں بات کرتا ہے! آنحضرتؐ نے فرمایا "آپ ہی کا بھتیجا ہے۔"[1] ـــــ اور یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ کوئی ایسے چچا بھتیجے تھے جن کے آپس کے تعلقات اچھے نہ رہے ہوں گے۔ نہیں ان کے آپس کے تعلقات نہایت اچھے تھے جس کی شہادت عروہ کا اگلا جملہ دیتا ہے۔ عروہ آنحضرتؐ کا جواب سنکر حضرت مغیرہ کی طرف متوجہ ہوئے اور بولے "اچھا یہ تم ہو، دھوکہ باز! جس کے کیے کو کل ہی میں نے بھرا ہے۔"[2] ـــــ یہ اشارہ تھا اس واقعے کی طرف کہ حضرت مغیرہ جو ابھی کچھ دن پہلے اسلام لائے تھے، اس سے متصلاً پہلے انھوں نے ایک سفر میں اپنے ساتھیوں کی کسی بات پر خفا ہو کر ان سب کو تہِ تیغ کر دیا تھا۔ عروہ بن مسعود نے ان سب کی دیت اپنے پاس سے ادا کر کے معاملے کو ختم کیا تھا۔

حضرت مغیرہ کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ جب ان کے شہر طائف والے (۹ھ) میں مسلمان ہوئے تو ان کے مخصوص بُت "لات" کا بُت خانہ توڑنے کیلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] سیر اعلام النبلاء ج ۳ ص۲۵۔ [2] ایضاً۔

نے جن دو اشخاص کو بھیجا تھا ان میں سے ایک یہی مغیرہ بن شعبہ تھے۔[1] (دوسرے ابوسفیان بن حرب تھے)

۹ھ میں ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری غزوہ، غزوۂ تبوک ہوا ہے۔ یہ غزوہ اپنی چند در چند سختیوں اور دشواریوں کی وجہ سے "غزوۂ عسرت" بھی کہلایا ہے۔ اور اسی حوالے سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے شرکاء پر اپنی عنایت خاص کا اعلان بھی قرآن پاک کی سورۂ ۹ (التوبہ) میں بایں الفاظ فرمایا ہے:-

لَقَدْ تَّابَ اللّٰہُ عَلَی النَّبِیِّ	اور اللہ نے رحمت کی نظر فرمائی نبیؐ پر
وَالْمُھٰجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ	اور مہاجرین و انصار پر کہ جنہوں نے تنگی
الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْہُ فِیْ سَاعَۃِ	کے وقت میں نبیؐ کا ساتھ دیا تھا جبکہ
الْعُسْرَۃِ مِنْۢ بَعْدِ مَا کَادَ یَزِیْغُ	ان میں سے بعض کے دل کج ہوئے جارہے
قُلُوْبُ فَرِیْقٍ مِّنْھُمْ ثُمَّ تَابَ	تھے پھر اللہ نے ان پر بھی نظر رحمت
عَلَیْھِمْ اِنَّہٗ بِھِمْ رَءُوْفٌ	فرمائی بے شک وہ ان کے لیے رؤف
رَّحِیْمٌ ۙ (آیت ۱۱۷)	اور رحیم ہے۔

حضرت مغیرہ کو اس غزوہ میں شرکت کا بھی شرف حاصل تھا اور وہ مہاجرین کے زمرے میں تھے۔ حضرت مغیرہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ۱۳۶ سے اوپر احادیث مروی ہیں۔ اسی غزوۂ تبوک کے موقع کی بھی ایک روایت چمڑے کے موزوں پر مسح کرنے ان سے بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور مؤطا امام مالک وغیرہ میں مروی ہوئی ہے، کہیں غزوۂ تبوک کے ذکر کے ساتھ اور کہیں بغیر اس کے ذکر کے۔[2]

حضرت مغیرہؓ خلفائے راشدینؓ کے دور میں

دور نبویؐ کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور میں بھی وہ ایک معتمد شخصیت اور

[1] الاصابہ ج ۶ ص ۱۳۲ [2] دیکھئے سیر اعلام النبلاء ج ۳ ص ۲۲ مع حاشیہ۔

مہمات میں نمایاں رہے[1]۔ شجاعت میں بھی مرد تھے اور تدبیر و حکمت اور فطانت و ذہانت میں بھی فرد، حافظ ذہبی لکھتے ہیں :۔

من کبار الصحابۃ اولی	بڑے درجے کے صحابہ میں سے تھے
الشجاعۃ والمکیدۃ شھد	صاحبِ شجاعت بھی اور صاحبِ حکمت و
بیعۃ الرضوان۔[2]	تدبیر بھی۔

غیر معمولی ذہانت اور اصابتِ رائے کی بنا پر "مغیرۃ الرأی" کہلاتے اور مدبّر ترین عرب میں شمار ہوتے تھے[3] حضرت عمر فاروق رضؓ کے دور میں بھی وہ معتمد رہے۔ بحرین کے گورنر بنائے گئے، بصرے کی گورنری پر رہے اور پھر کوفے کی[4]۔ بصرے کی گورنری کے زمانے میں ان پر ایک سنگین اخلاقی الزام لگا۔ حضرت عمرؓ نے معزول کر کے شہادت طلب کی۔ شہادت ناکام ہوئی تو روایت میں ہے کہ :۔

فکبّر عمر۔	حضرت عمرؓ نے (خوشی سے) تکبیر کہی۔[5]

اور اس کے بعد جب پھر ایک موقع آیا کہ کوفے کی گورنری کے سلسلے میں حضرت عمرؓ سخت پریشان تھے، جس آدمی کو بھی وہاں بھیجتے وہ ناکام ہوتا۔ اس لیے کہ جیساکہ اوپر گزرا وہ سخت بے سرے لوگ تھے۔ اِدھر کوئی حاکم پہنچا اور اُدھر انہوں نے اس کے خلاف شکایتوں کا سلسلہ شروع کیا۔ تو اس موقع پر آپ نے گہرے غور و فکر اور مشاورت کے بعد حضرت مغیرہ بن شعبہ ہی کا انتخاب کیا۔

---

[1] حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں لکھا ہے کہ یمامہ کے معرکے میں شامل تھے یعنی وہ شدید جنگ جو مُسیلمۂ کذّاب کے خلاف لڑی گئی ص ۱۳۱، اس کے بعد سوادِ عراق میں حیرہ کا شہور مقام اسلامی حکومت کے دائرہ میں آیا تو وہاں حضرت ابوبکرؓ کی طرف سے بکارِ سرکار بھیجے گئے ص ۱۳۲۔ [2] سیر اعلام النبلاء ج ۳ ص ۲۱۔ [3] اصابہ ج ۴ ص ۱۳۱ اعلام ج ۳ ص ۲۲ [4] اصابہ ص ۱۳۱-۱۳۲۔ [5] اعلام ج ۳ ص ۲۸۔

فاروقی انتظامیہ کا ایک اہم اصول اور حضرت مغیرہؓ

اس مشاورت اور انتخاب اور اس کے پسِ منظر کی تفصیل بجائے خود بڑی بصیرت افروز ہے اور فاروقی بلکہ اسلامی انتظامیہ (ADMINISTRATION) کا ایک نہایت اہم اصول اس کے ذریعہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ تفصیل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت عمار بن یاسر کو کوفے کی گورنری پر بھیجا۔ حضرت عمارؓ ان سابقین اوّلین میں ہیں جنھوں نے بڑی مصیبتیں اسلام کی راہ میں اٹھائی ہیں، مگر کوفے والے تو بس کوفے والے فوراً ہی شکایتیں شروع کر دیں۔ نہ صرف یہ شکایت تھی کہ نااہل ہیں بلکہ یہ بھی کہ امانت و دیانت سے بھی خالی ہیں[1]۔ حضرت عمرؓ نے واپس بلالیا اور کہا کہ عمار میں جانتا تھا کہ یہ کام تمہارے بس کا نہ ہوگا مگر میرا دھیان اس آیت کی طرف گیا جس میں ارشادِ حق ہے کہ:۔

وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ	اور ہم ارادہ کرتے ہیں کہ ان لوگوں پر احسان
اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ	کریں جن کو کمزور بنا کر رکھ لیا گیا ہے
اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ۔	پس ان کو سربراہی دیں اور زمین
(سورہ ۲۸ قصص) آیت ۵)	کی وراثت بخشیں۔

اس لیے میں نے تم کو بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ ان کو واپس بلانے کے بعد حضرت عمرؓ نے کوفے کے وفد سے پوچھا کہ اچھا تم بتاؤ کس کو چاہتے ہو۔ انھوں نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کا نام لیا۔ یہ بھی بڑے پائے کے صحابی تھے اِن لوگوں کے اپنے بھی تھے۔ یمن سے تعلق تھا اور یمن کے بہت سے قبیلے کوفے میں آ بسے تھے۔ مگر سال بھر مشکل سے گزرا کہ ان کے خلاف بھی شکایت شروع ہوگئی اور حضرت عمرؓ نے ان کو کوفے سے ہٹا کر بصرے بھیج دیا[2] اور اب اس خالی جگہ کے لیے فکرمند تھے کہ کیا کریں، کس کو بھیجیں، مسجد میں جاکر

---

[1] تاریخ ابن اثیر ج ۳ ص ۱۶ ۔ [2] ایضاً ۔

لیٹے اور نیند آگئی ۔ اسی حالت میں حضرت مغیرہ بن شعبہ وہاں پہنچ گئے، حضرت عمرؓ بیدار ہوئے تو انھوں نے اپنی قیافہ شناسی کے ماتحت کہا کہ آپ کچھ زیادہ ہی فکر مند معلوم ہو رہے ہیں خیریت تو ہے۔ حضرت عمرؓ نے قصہ بتایا ۔ اسی دوران میں اہلِ شوریٰ بھی آگئے ان کے دریافت کرنے پر کہ معاملہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ :-

ان اهل الكوفة قد عضلوني — اہلِ کوفہ نے مجھے بڑے مخمصے میں ڈال دیا ہے

اور پھر نئے تقرر کے سلسلے میں مشورہ طلب کرتے ہوئے ان حضرات سے فرمایا کہ مسئلہ میرے سامنے یہ ہے کہ حکّام اور والیان کے تقرر کے سلسلے میں کیا اصول برتوں؟ اعلیٰ اسلامی صفات والے کو ترجیح دوں اگرچہ وہ انتظامی لحاظ سے کمزور ہو؟ یا انتظامی لحاظ سے مضبوط اور اہل افراد کو ترجیح دی جائے اگرچہ وہ اسلامی صفات کے لحاظ سے اعلیٰ مقام کے نہ ہوں بس میانہ رَو ہوں ۔ آپ کے الفاظ جو روایت میں نقل ہوئے ہیں وہ یہ ہیں :-

ما تقولون فی تولیۃ رجلٍ ضعیفٍ مسلم او رجل قوی مسدّدٍ ؟

اس پر جواب دینے والے حضرت مغیرہ تھے انھوں نے فرمایا کہ :-

امّا الضعیف المسلم فانّ اسلامہٗ لنفسہٖ وضعفہٗ علیك وعلی المسلمین واما القوی المسدّد فانّ سدادہٗ لنفسہٖ وقوتہٗ لك وللمسلمین [1]

امیر المومنین! جہانتک انتظامی اعتبار سے کمزور مگر اسلامی لحاظ سے اعلیٰ درجہ کے مسلمان کا سوال ہے تو اسکی اسلامیت کا فائدہ تو اسکی ذات کو پہنچے گا مگر اسکی کمزوری کا نقصان آپکو اور مسلمانوں کو، اسکے برعکس بس میانہ رو مگر مضبوط فرد ہو تو اسکی میانہ روی اسکے لیے ہوگی اور مضبوطی آپکے اور عامۃ المسلمین کے لیے ۔

---

[1] تاریخ ابن اثیر ج ۳ ص ۱۶

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے جب مذکورۂ بالا سوال اہلِ مشورہ کے سامنے رکھا تھا تو ان کا اپنا رجحان بھی اسی طرف تھا۔ اور وہ جو شکایت ان سے مروی ہے کہ یا اللہ کیا کروں متقی ملتا ہے تو منتظم نہیں ہوتا اور جو منتظم ہوتا ہے اُس میں تقویٰ نہیں ملتا۔ اس شکایت اور تجربے کے نتیجہ میں بالآخر وہ یہی طے کرنے پر مائل ہو گئے تھے کہ تقویٰ کو کم اور انتظام کو زیادہ اہمیت دی جائے۔ چنانچہ اس موقع پر جو کہ آپ کی وفات سے دو ڈھائی سال پہلے (یعنی ۲۱ھ) کا واقعہ ہے، حضرت مغیرہ کا جواب سننے کے بعد آپ نے گویا اسی کو قبول کر لیا اور حضرت مغیرہ ہی کے لیے طے کر دیا کہ وہ کوفے کی ذمّہ داری سنبھالیں۔ روایت کے الفاظ ہیں:۔

فولّی المغیرة الکوفة فبقی علیها حتیٰ مات عمر و ذالك نحو سنتین او زیادة۔[1]	پس آپ نے کوفہ کی ولایت مغیرہ ہی کے سپرد کردی اور وہ اس عہدے پر رہے حتیٰ کہ حضرت عمرؓ نے وفات پائی اور یہ کوئی دو سال یا کچھ زیادہ کی مدّت ہوئی۔

حضرت مغیرہؓ کی دوسری عظمت

حضرت مغیرہؓ کی ایک عظمت وہ تھی جو سورۂ توبہ اور سورۂ فتح کی اُن قرآنی آیات سے ثابت ہوتی ہے جن کا حوالہ اوپر گزرا اور جن کی رو سے حضرت مغیرہ ایک طرف اُن (چودہ سو) سرفروش انسانوں میں سے ہیں جن سے پروردگارِ عالم نے اپنی خوشنودی کا اعلان صلح حدیبیہ کے موقع پر فرمایا۔ اور دوسری طرف ان تیس ہزار فرمانبرداروں کی فہرست میں بھی اُن کا نام ثبت ہے جن کو پروردگار نے غزوۂ عسرت کی صعوبتیں اٹھانے پر مہر و کرم کی ایک خصوصی نظر سے سرفراز فرمایا۔ یہ ان کی ایک (اور سب سے بلند تر) عظمت تھی۔ دوسری عظمت اوپر کے واقعے سے سامنے آتی ہے کہ حدیبیہ اور تبوک کی سرفرازیاں حاصل ہونے کے باوجود ان کے لئے

[1] ابن اثیر ج ۳ ص ۱۷۔

یہ بات ذرا بھی پریشان کن نہیں ہوئی کہ حضرت عمرؓ جس گفتگو کے سیاق وسباق میں ان کو کوفے کی حکومت دے رہے ہیں اس کی رو سے اُن کا درجہ ایک ذرا کم متقی مسلمان کا ہو جاتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ انھوں نے تو گویا اپنے ہی ہاتھ سے اپنے اوپر "کم متقی مسلمان" کا لیبل لگالیا۔ ظاہر ہے کہ سب صحابۂ کرامؓ ایک درجہ کے نہیں تھے، تقویٰ اور طہارت میں بھی ان کے درجات مختلف تھے۔ اور اسے بس اُن کی عظمت کی بات کہا جاسکتا ہے کہ ایسی ایسی قرآنی بشارتوں سے سرفرازی کے باوجود اُن میں سے اگر کوئی اپنے آپ کو تقویٰ اور طہارت اور تدیّن میں مقابلتہً کمتر دیکھتا تھا تو بے تکلف اپنے آپ کو کمتر ہی جانتا اور کمتر سمجھے جانے پر راضی ہوتا تھا۔ اللہ کی طرف سے ملے خوشنودیوں کے تمغے پر پر نظر کر کے غرّے میں نہیں مبتلا ہوتا تھا البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ... ولٰکن سدّدوا وقاربوا[1] پر نظر کر کے اللہ سے آخرت میں عفو وعنایت کی امید رکھتا تھا۔

بدنام کن روایت کا متن

شیعہ حضرات سوائے تین چار کے تمام اصحاب نبیؐ کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ مرتد ہو گئے تھے بلکہ سابقین اوّلین ابوبکر وعمر اور عثمان وغیرہ تو شروع ہی سے معاذ اللہ منافق تھے۔ ایسا گمان رکھنے والوں کے لیے ٹھیک ہے کہ وہ ان حضرات کی شان میں جو بھی چاہیں سوءِ ادب کریں مگر جو شخص اصحاب نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایسے گمان کو اپنے لیے بدبختی کی بات سمجھتا ہو وہ کیسے مان سکتا ہے کہ یہ لوگ جنھوں نے اسلام کے لیے ایسی جاں نثاریاں اور فرمانبرداریاں کیں کہ خدائے پاک نے بھی سندِ قبولیت

---

[1] حدیث نبوی ہے "ان الدین یسر ولن یشاد الدین احدٌ الا غلبہٗ فسددوا وقاربوا وابشروا۔ الحدیث" اللہ کا دین آسان ہے جو کوئی اس میں شدت پسندی کریگا بالآخر مغلوب ہو جائیگا پس میانہ روی سے کام لو، اور رضائے حق کی خوشخبری پاؤ۔ (مشکوٰۃ باب الاقتصاد فی العمل بحوالہ بخاری)

عطا فرمادی وہ اسلام کی جڑ کھودنے کا کام کریں گے اور فخر سے کہیں گے کہ "میں نے اسلام اور امّت اسلام کے لیے تباہی کی داغ بیل ڈال دی ہے "۔ یہی بدبختانہ بات ہے جو یزید کی ولی عہدی کی تجویز کے سلسلے میں حضرت مغیرہ جیسے صاحب فضائل صحابی رسول ؐ کی طرف ہماری تاریخی کتابوں میں منسوب کی گئی ہے اور جس کے متعلق ہم نے کہا تھا کہ تفصیل آگے آئے گی ۔ تاریخ کی جو کتابیں اس وقت ہمارے سامنے ہیں، ان میں سب سے زیادہ غضب ابن اثیر کی کتاب" الکامل فی التاریخ "میں ڈھایا گیا ہے ۔ اور یہ بیان دیا گیا ہے کہ :-

اور اس سنہ (۵۶) میں لوگوں نے یزید بن معاویہ سے ولی عہدی کی بیعت کی ۔ اور اس معاملے کی ابتداء مغیرہ بن شعبہ سے ہوئی تھی ۔ ہوا یوں کہ معاویہ نے کوفے کی امارت سے مغیرہ کو معزول کر کے سعید بن عاص کو مقرر کرنے کا ارادہ کیا ۔ مغیرہ کو یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے طے کیا کہ مجھے معاویہ کے پاس جاکر خود ہی اپنا استعفےٰ پیش کر دینا چاہیئے تاکہ لوگوں کو یہ ظاہر ہو کہ مجھے اس عہدہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے ۔ پس یہ طے کر کے وہ معاویہ کے پاس گئے اور وہاں (دمشق) پہنچ کر اپنے دوستوں سے کہا کہ میں نے آج ولایت اور امارت حاصل نہیں کر لی تو پھر کبھی بھی نہیں کر سکوں گا ۔ یہ کہہ کر سیدھے یزید کے پاس پہنچے اور اس سے بولے کہ میاں، بڑے بڑے اصحاب نبی صلے اللہ علیہ وسلم اور بزرگان قریش گزر چکے اب صرف ان کی اولاد رہ گئی ہے اور تم ان میں سے سمجھ بوجھ کے اعتبار سے بھی اور سنت وسیاست کے، علم کے اعتبار سے بھی افضل لوگوں میں ہو، میں نہیں جانتا کہ آخر امیر المومنین کو کیا چیز مانع ہے کہ وہ تمھارے لیے (ولی عہدی کی) بیعت لے لیں ! یزید یہ سن کر بولے کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ بیل منڈھے چڑھے گی ؟ مغیرہ نے کہا کیوں نہیں ؟ پس یزید اپنے باپ کے پاس پہنچے اور یہ گفتگو بتائی ۔ معاویہ نے بات سنکر مغیرہ کو بلایا اور پوچھا کہ یہ یزید کیا کہہ رہا ہے؟

انہوں نے کہا کہ ہاں امیرالمؤمنین! ٹھیک کہہ رہا ہے ـــ میرے سامنے اس اختلاف اور خونریزی کا منظر ہے جو عثمانؓ کے قتل کے بعد رونما ہوا (میں نہیں چاہتا کہ یہ دوبارہ ہو) یزید کی شکل میں آپ کے بعد ذمہ داریوں کو سنبھالنے والا ایک فرد موجود ہے۔ پس اس کا تقرر کر دیجئے تاکہ آپ کو کچھ ہو تو لوگوں کے لیے ایک جائے پناہ اور آپ کا خلف موجود ہو اور کوئی فتنہ و فساد رونما نہ ہونے پائے۔ معاویہ نے یہ سن کر کہا کہ اس کام کی صورت کیا ہوگی؟ مغیرہ نے جواب دیا کہ کوفے والوں کو (متفق کرنے کے لیے) میں کافی ہوں، بصرے کے لیے زیاد موجود ہے، اور ان دو بڑے شہروں کے بعد کوئی نہیں رہ جاتا جو آپ کی مخالفت کرے۔ معاویہ نے یہ سن کر کہا کہ اچھا تم اپنے منصب پر واپس جاؤ اور اپنے بھروسے کے لوگوں سے بات چیت کرو، پھر دیکھیں گے۔ یہ کہہ کر معاویہ نے ان کو رخصت کیا اور یہ لوٹ کر اپنے دوستوں میں پہنچے اور بولے کہ میں نے معاویہ کا پاؤں ایسی رکاب میں پھنسایا ہے کہ اب نکلنے والا نہیں ہے اور امتِ محمدیہ میں پھوٹ کا وہ سامان کیا ہے کہ اب ابد تک اس میں جوڑ کی صورت نہ ہوگی[1]

کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی اور بھی ہے لیکن جتنا اوپر آیا اس کا آخری (خط کشیدہ) جملہ ایسا ہے کہ اس کے بعد کچھ اور سنانے کی ضرورت نہیں[2]

کیا کوئی گنجائش اس بات کی ہے کہ ہم اصحابِ بیعتِ رضوان کے لیے اور مجاہدینِ غزوۂ تبوک کے لیے خدائے ذوالجلال کی وہ خوشنودی اور کرم فرمائی بھی مانیں جس کا نہایت بلند آہنگ اعلان قرآن پاک میں ہوا ہے۔ اور اس کے ساتھ ان میں سے کسی کے بارے میں یہ ماننے کو بھی تیار ہو جائیں کہ اس نے دنیا کی ایک حقیر غرض

---

[1] ابن اثیر ج ۳ ص ۲۴۹ ـ [2] اصل عربی الفاظ یہ ہیں:"لقد وضعت رجل معاویۃ فی غرز بعید الغایۃ علی امۃ محمد وفتقت علیھم فتقا لا یرتق ابدا۔"

کے لیے دیدۂ و دانستہ نہ صرف اسلام دشمنی کا ایک کام کیا بلکہ اس کا فخر سے اعلان بھی دو سطول میں کیا ؟ خدا کی پناہ اور ہزار بار پناہ ۔ ہم یہ لغویات (بلکہ کفریات) مان کر قرآن اور اس کے اعلان کو جھٹلانے کا کام کیسے کر سکتے ہیں ؟

کچھ اور اس سے بڑھی ہوئی روایتیں

ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے ان قابل فخر مؤرخین کا معیار روایات کے قبول کرنے میں کیا تھا اور انھوں نے کیسے رافضیت سے وابستہ نہ ہونے کے باوجود ایسی روایت کو بلا نقد و تبصرہ لے لیا ؟ لیکن ان پر آنکھ بند کر کے اعتماد ہم بہر حال نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے یہاں تو اس سے بھی زیادہ ناقابل یقین اور ایمان سوز روایتیں موجود ہیں ۔

حضرت مغیرہ ہی کے بارے میں ایک روایت طبری میں ہے اور ابن اثیر نے بھی اسکو حسب عادت من و عن لے لیا ہے ۔ سنیے اور خود فیصلہ کیجیے کہ کیا اس کو مانا جا سکتا ہے روایت ہے کہ :-

"سنہ ۴۰ھ میں حج مغیرہ بن شعبہ کی امارت میں ہوا ۔ "

اس کی تفصیل ابن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ :-

"جب اس سال میں کہ جس میں علی قتل کیے گئے، موسم حج آیا تو مغیرہ بن شعبہ نے معاویہ کی طرف سے ایک جعلی خط بنایا اور اس کی بنیاد پر لوگوں کو سنہ ۴۰ھ کا حج کرایا ۔ اور کہا گیا ہے کہ انھوں نے یوم ترویہ (۸ ذی الحجہ) میں وقوف عرفہ کرایا (جو ۹ تاریخ کو عرفات میں ہوتا ہے) اور عرفہ کے دن یعنی ۹ تاریخ کو قربانی کرائی (جو ۱۰ تاریخ کو ہوتی ہے) اور یہ اس ڈر سے کرایا کہ کہیں ان کی جعل سازی کا پتہ نہ چل جائے ۔ اور ایک بیان اس سلسلے میں یہ بھی ہے کہ یہ جلدی جلدی کی کاروائی انھوں نے اس لیے کی کہ انھیں اطلاع مل گئی تھی کہ کل صبح کو عتبہ بن ابی سفیان امیر حج کی حیثیت سے مکہ پہنچنے والے ہیں"۔

آپ ذرا غور کیجئے مغیرہ دشمنی میں کیسی کیسی خرافات تیار کرنے والوں نے تیار کی ہیں۔ اور ہماری تاریخی کتابوں میں ان کو جگہ مل گئی ہے۔ مان لیجئے مغیرہ بن شعبہ اُن فضائل سے آراستہ ہونے کے باوجود جن کا ذکر اوپر کیا گیا۔ اس حد تک بھی (معاذ اللہ) گر سکتے تھے کہ جعلی تقرر نامہ بنا کے حج کی امیری ہی نہ کریں بلکہ اس امیری کی خاطر حج کا حلیہ بھی بگاڑیں۔ یعنی ۹ ذی الحجہ کے بجائے ۸ر کو حج (وقوفِ عرفہ) کرادیں) ور ۱۰ر کے بجائے ۹ر کو قربانی کرادیں۔ لیکن کیا اس وقت کے اور وہ تمام مسلمان بھی اندھے ہو گئے تھے جو حج کرنے آئے تھے، ان میں سے کسی کو خبر نہیں رہی کہ مغیرہ کیا غضب کر رہے ہیں، یا کسی کے بھی منہ میں زبان نہ تھی جو اُنھیں ٹوکتا؟ آخر کون اس بیہودہ روایت کو مان سکتا ہے؟ مگر ہم دیکھ رہے ہیں کہ تنہا طبری ہی نے نہیں اس کو قابلِ بیان نہیں سمجھا بلکہ ابن اثیر نے بھی بلا چون وچرا نقل کر دیا ہے۔ خدا بھلا کرے ابن کثیر نے ضرورا سے نقل کرنے کے بعد یہ کہنے کی ضرورت سمجھی ہے کہ "یہ روایت باطل ہے، حضرت مغیرہ کے بارے میں ایسے گمان کی کوئی گنجائش نہیں، کیونکہ صحابۂ کرام ایسی باتوں سے بالاتر تھے، یہ روایت دراصل شیعیت کا شوشہ ہے۔[1]

حاصل کلام

بہرحال اس کا امکان تو تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ حضرت مغیرہ نے ایک صاحبِ رائے اور دور اندیش انسان کی طرح جس کے لیے وہ مشہور تھے۔ حضرت معاویہ کے بعد اختلاف کے اندیشے سے یہ رائے قائم کی ہو کہ اس کی پیش بندی کے لیے یزید کی ولی عہدی مناسب رہے گی۔ لیکن یہ بات کہ انھوں نے محض کوفے کی اپنی امارت بچانے کے لیے یہ داؤں کھیلا اور اس بات کا پورا شعور رکھتے ہوئے کھیلا کہ اس تجویز کے ذریعہ وہ امتِ مسلمہ کو

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ صـ ۱۶

تباہی و بربادی کے راستے پر ڈال رہے ہیں ۔ یہ قطعاً ناقابلِ قبول بات ہے۔ قرآن پاک کی صاف صاف شہادت ہے کہ " اللہ ان سے راضی ہوا " ۔۔۔ " اللہ نے ان پر رحمت کی نظر کی " اس قرآنی شہادت کے مقابلے میں کوئی بھی ایسی روایت کیسے قابلِ قبول ہو سکتی ہے جو حضرت مغیرہ کو ایسے کردار کا حامل دکھائے جس کے ساتھ اللہ کی رحمت و رضامندی ہرگز جمع نہیں ہو سکتی ؟ اور پھر روایت بھی وہ جس کی کوئی سند تک ہمارے سامنے نہیں ہے[1] ۔

ایک اور پہلو

اتنی ہی بات نہیں کہ یزید کی ولی عہدی کے لیے حضرت مغیرہ کی تجویز کی یہ روایت از روئے درایت لائق تسلیم نہیں ہے بلکہ روایتی حیثیت سے بھی اس کی خامی یہ ہے کہ ابن اثیر تو اپنی بلا سند روایت میں واقعہ کی صورت یہ بیان کرتے ہیں جیسا کہ اوپر گزر چکا کہ ۵۶ھ میں حضرت معاویہ نے حضرت مغیرہ کو کوفے کی امارت سے معزول کر کے سعید بن عاص کو ان کی جگہ لانے کا ارادہ کیا ۔ مغیرہ کو پتہ چلا تو وہ اس ارادے سے سیدھے عازم دمشق ہوئے کہ عہدے سے اپنی بے نیازی ظاہر کرنے کے لیے خود جا کر استعفیٰ دیدیں الخ ۔ جبکہ طبری میں سند کے ساتھ صورتِ واقعہ یہ بیان کی گئی ہے کہ مغیرہ اپنے ضعف کا عذر لے کر معاویہ کے پاس پہنچے کہ ان کا استعفیٰ قبول کر لیا جائے ۔ جس پر حضرت معاویہ نے قبول کر لیا اور ان کی جگہ پر سعید بن العاص کو لانے کا ارادہ کیا ۔

دونوں روایتوں میں صورتِ واقعہ بالکل مختلف ہے ۔ ابن اثیر کی روایت میں حضرت معاویہ ارادہ کرتے ہیں کہ حضرت مغیرہ کو ہٹا کر سعید بن عاص کا تقرر کر دیں اور اس کو سن کر حضرت مغیرہ استعفیٰ دینے جاتے ہیں جبکہ طبری کی روایت میں حضرت مغیرہ خود سے استعفیٰ کے خواہش مند ہوتے ہیں اور نتیجۃً حضرت معاویہؓ ارادہ کرتے ہیں کہ سعید بن عاص

---

[1] تاریخ ابن اثیر میں سند کی روایت درج نہیں ہوتی ۔

کا تقرر کر دیا جائے۔ اس اختلاف کی صورت میں طبری کی باسند روایت کو قدرتی طور پر ابن اثیر کی بے سند روایت پر ترجیح ہونی چاہیے۔ طبری کی روایت آگے ایسی کوئی بات نہیں بیان کرتی جس کو حضرت مغیرہ جیسے ایک صحابیٔ رسول کے حق میں ماننا ہمارے لیے ممکن نہ ہو۔

طبری کی روایت کا سقم

لیکن طبری کی روایت میں بھی ایک جھول ہے یعنی آگے جو صورت واقعہ انھوں نے بیان کی ہے وہ عقلاً کچھ سمجھ میں آنے والی نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت مغیرہ کا استعفٰے منظور ہونے اور سعید بن عاص کا ان کی جگہ پر نام آنے کی بھنک جو حضرت مغیرہ کے سکریٹری (کاتب) کے کان میں پڑی تو وہ (سعید کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے) ایک دم سعید کے پاس جا پہنچے اور خوشخبری سنائی۔ اس کا پتہ حضرت مغیرہ کو چل گیا اور یہ چیز جو انھیں ناگوار ہوئی تو ایک دم یزید کو ولی عہدی کا خواب دکھانے کی اسکیم تیار کر کے یزید کے پاس پہنچ گئے یزید یہ سنہرا خواب لے کے اپنے والد کے پاس پہنچے اور والد نے اس کی خوشی میں حضرت مغیرہ کو ان کی جگہ پر بحال کر کے کوفے واپس بھیجدیا کہ جائیں اور اس خواب کو واقعہ بنانے کی تدابیر کریں۔

مغیرہ بن شعبہ خود سے استعفٰے دینے کو جاتے ہیں ضعیف العمری کا تقاضہ ہے۔ پھر یہ کیا بات ہوئی کہ جو شخص ان کا سکریٹری تھا وہ نئے ہونے والے امیر کو فہ کو خوش کرنے کیلئے اس کے پاس خوشخبری لے کر پہنچ گیا تو آپ نہ صرف اس سے بگڑ گئے بلکہ اپنا استعفٰے ہی الفظ کرنے کی ٹھان لی۔ یہ تو ایک بچوں والا مزاج ہوا۔ حالانکہ مغیرہ مانے ہوئے صاحب رائے اور دانشمند اور ستر کے پیٹے میں ہیں! بظاہر روایت کا یہی ناقابل فہم پہلو ہے جس کی بنا پر ابن کثیر نے اسے طبری ہی کے حوالے سے درج کرنے کے باوجود اس کا یہ بچکانہ پن

والا جز و نکال کر بس یوں بیان کیا ہے کہ :۔

"...... استعفےٰ منظور ہونے اور سعید بن عاص کا تقرر کیے جانے کی خبر سننے سے مغیرہ کو شاید کچھ پچھتاوا سا ہوا جس کی بنا پر وہ یزید کے پاس گئے۔ الخ[۱] ...."

اور چونکہ ابن اثیر نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں صراحتہً لکھا ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب کی بنیاد اصلاً طبری کی روایات پر رکھی ہے اور بعد میں وہ دوسری کی روایات سے مناسب اضافے کرتے ہیں اس لیے یہ سمجھنا غلط نہ ہوگا کہ اصل روایت تو ان کے سامنے بھی طبری ہی کی ہے مگر ابن کثیر کی طرح انہوں نے بھی اس کو اصل صورت سے پیش کرنے میں دقت محسوس کی تو اس کی اصلاح انہوں نے ابن کثیر سے بھی زیادہ کر دی۔ اور خود ہی استعفےٰ دیکر خود ہی نادم ہونے کو بھی حضرت مغیرہ جیسے ہوشمند اور پختہ کار سے بعید دیکھ کر واقعہ کو یوں بیان کیا کہ اصل ارادہ معاویہ کی طرف سے ہوا تھا کہ مغیرہ کو معزول کر کے سعید کا تقرر کر دیا جائے۔ مغیرہ کو اس کی بھنک پڑی تو وہ اس کی کاٹ کے لیے اپنا استعفےٰ لے کر پہنچ گئے۔ اور استعفےٰ کے ساتھ ساتھ یزید کے کان میں ولی عہدی کا افسوں بھی پھونک دیا جس کے نتیجے میں معاویہؓ کو خود ہی ضرورت محسوس ہوئی کہ مغیرہ کو ان کے عہدے پر باقی رکھا جائے[۲]۔

سوال یہ ہے کہ ایسی روایت کی وقعت کیا ہے جو اتنی ناقابل فہم ہو کہ طبری کا نام لیکر بیان کرنے والے بھی اس کو کافی رد و بدل کے بغیر بیان کے قابل نہ سمجھتے ہوں ؟

ایک اور سوال

حضرت مغیرہ بن شعبہ کا انتقال معتبر روایات کے مطابق ۴۹ھ یا ۵۰ھ میں

---

[۱] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۸۶ ۔ [۲] ابن اثیر کی بیان کردہ روایتوں کا پورا ترجمہ اوپر گذر چکا ہے۔

ہوجاتا ہے[1] اب ذرا غور کیجیے کہ طبری کی روایت بھی ہے اگرچہ بہت مختصر طور پر[2] اور ابن اثیر نے تو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے کہ مغیرہ بن شعبہ جب کوفے واپس گئے تو حضرت معاویہ سے کیے ہوئے وعدے کے مطابق یزید کی ولی عہدی کے لیے زمین ہموار کرنے میں لگ گئے اور پھر وفود تیار کر کے دمشق بھیجے جو حضرت معاویہ سے جا کر درخواست کریں کہ اپنے بعد کیلئے یزید کی ولی عہدی کی شکل میں بندوبست کر جائیں[3]۔ لیکن یہ ساری روایتیں ہمیں ۵۶ھ کے واقعات کے ذیل میں ملتی ہیں بایں طور کہ ۵۶ھ میں یزید کو ولی عہد سلطنت بنایا گیا اور اس کی تجویز دراصل مغیرہ بن شعبہ نے رکھی تھی اور اس اس طرح قصہ پیش آیا تھا۔

سوال یہ ہے کہ یہ قصہ پیش آیا کب تھا؟ کون سے سنہ کی بات ہے؟ اور جس سنہ میں یہ قصہ پیش آیا کہ مغیرہ بن شعبہ نے استعفٰے دیا یا وہ معزول کیے گئے اور پھر انہوں نے یزید کی ولی عہدی کی تجویز سے حضرت معاویہؓ کو خوش کر کے اپنا عہدہ بچایا اس کا ذکر اسی سنہ کے واقعات میں کہیں کیوں نہیں ملتا جس سنہ میں یہ واقعہ پیش آیا تھا؟ (جو کہ ۴۹ھ یا اس سے پہلے ہی کا کوئی سنہ ہو سکتا ہے جبکہ حضرت مغیرہ زندہ تھے) طبری اور ابن اثیر کے صفحات حکّام کی معزولیوں، تقرریوں، استعفوں اور ترقیوں کے تذکروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ خود مغیرہ بن شعبہؓ ہی کا بالکل اسی طرح کا ایک استعفٰے دینے کا واقعہ بھی ۴۵ھ کے واقعات میں موجود ہے[4]۔ لیکن جس معزولی اور دوبارہ تقرری کا تعلق یزید کی ولی عہدی جیسے اہم واقعہ سے ہے اور پھر اس کے ساتھ حضرت مغیرہ کے بھیجے ہوئے وفود کا دمشق آنا جانا بھی جڑا ہوا ہے، اس کا ذکر اور اس کے اہم متعلقات اور نتائج کا ذکر ہمیں سنہ وقوعہ کے اندر نہیں ملتا!! اس کے بعد اس ولی عہدی سے لوگوں کے اختلاف کی باتیں چلتی ہیں۔ بات حضرت حسین اور حضرت ابن زبیر کے خروج اور محاذ آرائی تک

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ صـ۸۰، ابن اثیر ج ۳ صـ۲۲۸ بیان واقعات ۵۰ھ۔ [2] طبری ج ۶ صـ۱۶۹

[3] پوری تفصیل کے لیے دیکھیے ابن اثیر ج ۳ صـ۲۴۹ [4] دیکھیے طبری ج ۶ صـ۱۲۴-۱۲۳

پہنچتی ہے۔ طرح طرح کی گفتگوئیں ہیں، تبصرے ہیں، تنقید ہے، تائید ہے کسی ذیل میں بھی ہمیں حضرت مغیرہؓ کا نام اس سلسلے میں سننے کو نہیں ملتا۔ حالانکہ بالکل قدرتی بات تھی، کہ کبھی حضرت معاویہؓ کے ہی منہ پر اپنی پوزیشن کی صفائی کے سلسلے میں یہ نام آتا کہ بھائی یہ تو ایک غیر اموی کا تجویز کیا ہوا نام ہے، اور وہ بھی ایسے ایسے اوصاف و فضائل رکھنے والا، اسی طرح عادۃً غیر ممکن تھا کہ اس ولی عہدی کی مخالفت کرنے والے اور پھر ولی عہد سے لڑائی لڑنے والے اس کو اور اس کے باپ کو برا بھلا کہنے کے ساتھ دو چار نام اس تجویز پیش کرنے والے کو بھی نہ رکھتے۔ ۵۶ھ کی ان روایتوں کے علاوہ جن کا ذکر اوپر کیا گیا کہیں سے کہیں تک آپ کو حضرت مغیرہ کا ذکر اس قضیے سے جڑا ہوا نہیں ملے گا۔ کیا معاملے کا یہ پہلو ان روایتوں کی واقعیت میں شک پیدا کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

اور اب سند کی بات

اور سند کے لحاظ سے بھی یہ روایت کوئی قابلِ اعتناء درجہ کی نہیں ہے۔ اسکے ایک راوی علی بن مجاہد کے بارے میں ابن معین کا قول ہے کہ "کان یضع الحدیث" حدیثیں گھڑا کرتا تھا۔ (میزان الاعتدال ج ۳ ص ۱۵۲) جو شخص حدیثیں گھڑ سکتا ہو وہ تاریخی روایات میں کیا کچھ نہیں کرسکتا؟ حافظ ابن حجر تقریب التہذیب میں لکھتے ہیں کہ "متروک ہیں" اور "لیس فی شیوخ احمد اضعف منہ" (امام احمد کے شیوخ (اساتذہ) میں ان سے زیادہ ضعیف کوئی دوسرا نہیں ہے) (ج ۱ ص ۲۷۴)

باب چہارم

ولی عہدی کی راہ میں زیاد کا وجود رکاوٹ؟

یزید کی ولی عہدی کی تجویز کے سلسلے میں جو راوی یہ بتاتے ہیں کہ یہ تجویز کوفے کے اموی گورنر مغیرہؓ بن شعبہ کے دماغ سے نکلی تھی، اور نہایت بچکانہ حرکت کے طور پر نکلی تھی، وہی راوی ایک مزید بات اس سلسلے میں یہ بھی بتاتے ہیں کہ حضرت معاویہ نے اپنے ایک دوسرے اہم گورنر زیاد سے بھی اس سلسلے میں رائے مانگی تھی اور اس نے رائے یہ دی کہ اس معاملے میں عجلت مناسب نہیں ہے، فی الحال اسکو التواء میں رکھنا اور موزوں حالات کا انتظار کرنا مناسب ہوگا۔ حضرت معاویہ نے یہ رائے بلا چون وچرا قبول کر لی[1]، اس کے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۷۰۔ زیاد بصرے کا گورنر تھا۔ اس کو زیاد بن ابیہ، زیاد بن سُمیّہ، زیاد بن ابی سفیان وغیرہ کئی ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ یعنی نسب کے اعتبار سے ایک کمزور آدمی تھا۔ مگر نہایت باصلاحیت، طائف کے قبیلۂ ثقیف میں ہجری سنہ ۱ میں پیدا ہوا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں اس کی صلاحتیں کھلنا شروع ہوئیں اور حضرت عمرؓ نے اسے بڑھاوا دیا۔ بصرہ میں گورنروں کا سکریٹری رہا۔ حضرت علیؓ کا عہد آیا تو آپ نے اسے فارس کی گورنری دی۔ اور حضرت حسنؓ کی صلح کے بعد یہی ایک گورنر تھا جس نے سال بھر تک حضرت معاویہ کے اقتدار کو تسلیم نہیں کیا بالآخر ۴۲ھ میں اطاعت قبول کرلی اور کوفے میں رہائش کی اجازت حاصل کی۔ حضرت معاویہ اس سے اتنے خائف تھے (باقی آئندہ صفحہ پر)

بعد انہی راویوں کی یہ بھی روایت ہے کہ :۔ جب زیاد کا انتقال ہو گیا تو معاویہ نے

لمّامات زیاد دعا بکتاب	یزید کو خلیفہ نامزد کرنے کی ایک دستاویز
بکتاب فقرأ علی النّاس	تیار کرا کے لوگوں کے سامنے پڑھی جو
باستخلاف یزید۔ ان حدث	یہ تھی کہ معاویہ کی موت واقع ہو جائے
بہ حدث الموت فیزید	تو یزید جانشین ہوگا جس پر سب لوگوں
ولی عهد فاستوثق لہ الناس	نے، سوائے پانچ افراد کے
علی البیعۃ لیزید الا خمسۃ	یزید کی ولیعہدی کے لیے اپنا اقرار
نفر۔[1]	دیا۔

روایت کے الفاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے حضرت معاویہ کو بس زیاد کی موت کا انتظار تھا۔ چنانچہ ابن اثیر اور ابن کثیر دونوں نے بھی جو واقعات کو طبری کی طرح الگ الگ روایات میں توڑ کر نہیں بلکہ ایک تسلسل کے ساتھ بیان کرتے ہیں، زیاد کا مشورہ اور حضرت معاویہ کے یہاں اس کی قبولیت نقل کرنے کے بعد استخلافِ یزید کی از سرِ نو تحریک کو زیاد کی موت کے ساتھ بالکل اسی طرح جوڑ کے بیان کیا ہے جیسے بس زیاد کا وجود اس راہ میں رکاوٹ تھا وہ ہٹا اور حضرت معاویہ از سرِ نو سرگرم ہو گئے[2] حالانکہ زیاد کا انتقال باتفاقِ مؤرخین ۵۳ھ میں

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ) کہ کوفے کے گورنر حضرت مغیرہ کو لکھا کر زیاد اور اس کے ساتھ فلاں فلاں نمایاں شیعانِ علی کو پابند کر دو کہ نماز باجماعت مسجد میں پڑھیں (یعنی تاکہ نگاہ میں رہیں) مگر نہ تو زیاد جیسا آدمی ایسی زندگی پر راضی رہ سکتا تھا نہ حضرت معاویہؓ ایسے کارآمد آدمی کو اپنا بنائے بغیر چھوڑ سکتے تھے۔ بالآخر دونوں قریب آئے اور ۴۴ھ میں زیاد کو بصرے کی گورنری مل گئی اور پھر مسلسل ترقیاں پاتا ہوا ۵۳ھ میں انتقال کر گیا۔ (طبری ج ۶ ۔ ابن اثیر ج ۳ ۔ سیر اعلام النبلاء ج ۳۔

[1] طبری ج ۶ صفحہ ۱۷۰ [2] ابن اثیر ج ۳ صفحہ ۲۵۰ البدایہ والنہایہ ج ۸ صفحہ ۸۶۔

ہوگیا تھا[1] جبکہ حضرت معاویہ کی از سر نو سرگرمی کا وقت ۵۶ھ میں بتایا جا رہا ہے۔ ۵۶ھ کے واقعات کے عنوان کے تحت طبری کے الفاظ ہیں :۔

وفیہا دعا معاویۃ النّاس	اور اسی سنہ میں معاویہ نے لوگوں کو
الیٰ بیعۃ ابنہ یزید من بعدہ	اپنے بعد اپنے بیٹے یزید کی بیعت کی دعوت
وجعلہٗ ولی العہد[2]	دی اور اسے ولی عہد بنا دیا۔

اور تقریباً یہی الفاظ ابن کثیر اور ابن اثیر کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں۔

پس اوّل تو کوئی وجہ ایسی سامنے نہیں ہے جس کی بنا پر یہ سمجھنا معقول ہو کہ حضرت معاویہ زیاد کے ڈر سے اپنی دلی خواہش دبائے بیٹھے رہے۔ دوسرے اگر یہی واقعہ تھا تو زیاد کا انتقال ۵۳ھ میں ہو جانے کے بعد ۵۶ھ تک مزید کون چیز انھیں روکے رہی؟ اور پھر کیا تُک ہے کہ ۵۶ھ میں ہونے والے واقعہ کو اس انداز سے بیان کیا جائے کہ جیسے وہ زیاد کی موت کے فوراً البعد ہی پیش آگیا تھا جو کہ تین سال قبل ۵۳ھ میں ہو چکی تھی؟

قرینِ قیاس بات

جہاں تک زیاد سے مشورے کا سوال ہے، وہ تو عین ممکن بلکہ قرینِ قیاس ہے، کیونکہ زیاد کا تعاون ناگزیر تھا، لیکن تجویز کے احیاء کو زیاد کی موت سے خواہ مخواہ مربوط کرنا جس سے یہ تأثر ہوتا ہے کہ بس زیاد کا وجود رکاوٹ بنا ہوا تھا جس کی وجہ سے ولی عہدی کی تجویز ۸۔۱۰ سال سردخانے میں پڑی رہی۔ چنانچہ وہ راستے سے ہٹا اور

---

[1] طبری ابن اثیر اور ابن کثیر تینوں کے یہاں اس کا ذکر موجود ہے۔ لیکن ابن کثیر ۵۶ھ کے واقعات میں جہاں انہوں نے زیاد کی وفات کے بعد حضرت معاویہ کا سرگرم عمل ہونا بیان کیا ہے وہاں، پتہ نہیں کیسے یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ زیاد کی وفات اسی سنہ میں ہوئی تھی "فلمّا مات زیاد وکان ھٰذہٖ السنۃ شرع معاویۃ الخ" ظاہر ہے یہ کوئی بھول چوک ہے اسلیے اس سے کسی کو خلجان نہیں ہونا چاہئے۔ ج ۶ ص ۱۶۸[2]

معاویہ پھر سرگرم عمل ہو گئے۔ یہ ربط ایک زبردستی کا ربط ہے اور قابلِ قبول نہیں نظر آتا۔
اس کے مقابلے میں قابلِ قبول یہ بات ہو سکتی ہے کہ ۵۶ھ میں اپنی عمر اور صحت کے تقاضے
سے حضرت معاویہ کو یہ خیال غالب ہوا ہو کہ انھیں اپنے بعد کے لیے انتظام میں مزید دیر
نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اس وقت ان کی عمر ستر سے اوپر ہو چکی تھی اور چار سال بعد ۶۰ھ
میں ان کا انتقال ہی ہو گیا[۱]۔ حضرت معاویہ کی سرگرمی کی جو تفصیلات اہلِ تاریخ نے لکھی
ہیں ان میں صاف طور سے اس کا اشارہ پایا جاتا ہے بلکہ بعض کے بیانات میں تو
صراحت کا درجہ ہے۔ مثلاً طبری میں ہے کہ جو پانچ آدمی یزید کی ولی عہدی سے متفق نہیں
ہوئے تھے۔ جس کا ذکر اوپر دی ہوئی طبری کی روایت میں آگیا ہے۔ ان کو ہموار کرنے
کے لیے حضرت معاویہ نے حجاز کا ایک سفر کیا تو ان میں سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ
بات چیت میں انہوں نے کہا کہ:۔

انی ارھب ان ادع امۃ محمد بعدی کالضأن لا راعی لھا۔[۲]	مجھے ڈر ہے کہ کہیں میں امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے بعد بکریوں کے اس ریوڑ کی طرح نہ چھوڑ جاؤں جس کا کوئی دیکھنے والا نہ ہو۔

اور ابن اثیر میں ہے کہ انہوں نے (اپنے سفر سے پہلے) مدینے کے گورنر مروان بن
حکم کو لکھا کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنے بعد کے لیے کسی کو نامزد کر جاؤں، سو تم اس سلسلے
میں اہلِ مدینہ کی رائے معلوم کرو۔ اس خط کا مضمون ابن اثیر میں اس طرح دیا گیا
ہے کہ:۔

---

[۱] حضرت معاویہ کی عمر ۷۳ سال سے لیکر ۸۵ سال تک بتائی گئی ہے۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ "ان کی عمر اس وقت (موت کے وقت) ۷۸ سال تھی اور کہا گیا ہے کہ اسّی سے اوپر تھی اور یہی زیادہ مشہور ہے" البدایہ والنہایہ جلد ۸ ص ۱۴۳۔ [۲] طبری ج ۶ ص ۱۷۰۔

انّی قد کبرت سِنّی و دَ قّ	میری عمر بہت ہو چکی ہے اور ہڈیاں
عظمی وخشیت الاختلاف	گھل رہی ہیں۔ اور مجھے ڈر ہے کہ
علی الامۃ بعدی وقد رأیت	امت میں میرے بعد اختلاف ہو۔ اس
ان اتخیّر لھم من یقوم	لیے ضروری سمجھ رہا ہوں کہ اپنے بعد کیلئے
بعدی وکرھت ان اقطع	کسی آدمی کو طے کر دوں۔ لیکن تمہارے
امرًا دون مشورۃ مَن عندك	پاس جو لوگ ہیں (یعنی اہلِ مدینہ) انکے
فاعرض ذالك علیھم	مشورے کے بغیر کوئی فیصلہ کر دینا مجھے
واَعلمنی بالّذی یردّون	پسند نہیں۔ پس تم میری یہ بات اُن
علیك ۔ [1]	لوگوں پر پیش کرو اور ان کے جواب
	سے آگاہ کرو۔

ایک اور فائدہ

ابن اثیر کی اس عبارت سے جہاں ہمارے اس قیاس کو دلیل ملتی ہے کہ ۵۶ھ میں حضرت معاویہؓ یزید کی ولی عہدی کے لیے جو سرگرم ہوئے وہ اس لیے نہیں تھا کہ زیاد کا انتقال ہو جانے سے راستہ صاف ہو گیا تھا بلکہ ضعیف العمری اور اپنے وقت کے قریب ہو جانے کا احساس اس کا باعث ہوا تھا۔ اسی کے ساتھ ابن اثیر کی بیان کردہ ان روایتوں کی تردید یا تضعیف کا سامان بھی، ابن اثیر کی اس (مذکورہ بالا) روایت میں پایا جاتا ہے جو یزید کی ولی عہدی کے سلسلے میں حضرت مغیرہ بن شعبہ کے متعلق ان کی کتاب میں ایک ہی صفحہ پہلے درج ہوئی ہیں اور اس جلیل القدر صحابی کی مضحکہ خیزی کا سامان بن رہی ہیں گزشتہ صفحات میں ہم نے اُن روایتوں کی طرف اشارہ کیا تھا تفصیل نہیں دی تھی۔ ان روایتوں کے مطابق حضرت مغیرہ جب یزید کی ولی عہدی کی تجویز سے حضرت

---

[1] ابن اثیر ج ۳ ص ۲۵۰

معاویہ کو خوش کر کے کوفے کی عمارت پر اس وعدے کے ساتھ واپس ہوئے کہ کوفے والوں کو اس تجویز سے متفق کرنا میرا کام ہے تو پھر انھوں نے وہاں سے ایک وفد بھی تیار کر کے حضرت معاویہ کے پاس اپنے لڑکے کی سرکردگی میں دمشق بھیجا تھا جو تیس یا چالیس آدمیوں پر مشتمل تھا۔ اس وفد نے یزید کے بڑے گیت گائے اور حضرت معاویہ پر زور دیا کہ ولی عہدی کا تاج بس یزید کے سر پر رکھ ہی دیں۔ تو ان کو مناسب جواب دینے کے بعد حضرت معاویہ نے ابن مغیرہ سے پوچھا کہ تمھارے باپ نے کتنے میں ان سب کا دین خریدا؟ صاحبزادے نے جواب دیا "تیس ہزار میں" ـــ یا دوسری روایت کے مطابق "چار سو دینار میں"۔

یہ مضحکہ خیز واقعات ہو چکے ہوں اور پھر بھی حضرت معاویہؓ مروان کو ایسے انداز میں خط لکھیں جیسے کہ ولی عہدی کے سلسلے میں کوئی بات کبھی اس سے پہلے ہوئی ہی نہیں ہے کیا یہ کوئی سمجھ میں آنے والی بات ہے؟ مروان تو اندرون خانہ کے آدمی تھے ـــ اگر یزید کی ولی عہدی کی تجویز پہلے کسی طرف سے ہو چکی ہوتی اور اس کی تائید کیلئے کہیں سے وفود بھی آ چکے ہوتے تو کہاں ممکن تھا کہ حضرت معاویہ اس معاملے میں مروان کو بالکل انجان سمجھ کر خط لکھتے؟

باب پنجم ۵

ولی عہدی کی بیعت اور اسکے مخالفین کا قصہ

اوپر طبری کی روایت گزری ہے کہ یزید کی ولی عہدی پر پانچ حضرات کے سوا اور سب نے اتفاق کر لیا تھا۔ اس کے بعد کی روایت میں ان پانچ حضرات کے نام طبری نے یہ دیئے ہیں:۔

حسین بن علی۔ عبداللہ بن عمر۔ عبداللہ بن زبیر۔ عبدالرحمٰن بن ابی بکر
عبداللہ بن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہم)

مگر اس ایک ابتدائی روایت کے سوا حضرت عبداللہ بن عباس کا نام اس اختلاف کے سلسلے میں کہیں نہیں ملتا۔ صرف باقی چار نام مختلف موقعوں پر دُہرا دُہرا کر آتے ہیں[1] حتیٰ کہ خود اس روایت میں جو آگے بیان ہوا ہے کہ حضرت معاویہ نے ان میں سے ہر ایک سے مل کر یہ بات کی اور وہ بات کی۔ اس میں چار کے بعد پانچویں عبداللہ بن عباس سے حضرت معاویہ کی کوئی بات نقل کرنے کے بجائے یہ لکھا ہوا ہے کہ "قال ولم یذکر ابن عباس" جس کا مطلب ہے کہ روایت کے اصل اور بنیادی راوی جو ایک مجہول اور نامعلوم الاسم

---

[1] مثلاً حضرت معاویہ کی جو وصیت یزید کے لیے بیان کی گئی ہے اس میں یہی چار نام اس حیثیت سے مذکور ہیں کہ ان لوگوں کی طرف سے تم کو اختلاف کا سامنا ہو سکتا ہے۔ طبری ج ۶ صفحہ ۱۸۰-۱۷۹۔

شخصیت "رجل بنخلۃ"[1] ہیں۔ ان سے روایت کرنے والے صاحب جن کا نام ابن عون ہے وہ کہتے ہیں کہ نخلہ والے صاحب نے بات چیت کے بیان کے سلسلے میں ابن عباس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ یعنی بیان کے شروع میں اختلاف کرنے والوں کے جو نام انہوں نے گنائے تھے ان میں تو ابن عباس کا نام تھا۔ مگر ان حضرات سے حضرت معاویہ کی گفت گو کا جو قصہ بیان کیا اُس میں پھر حضرت ابن عباس کا کوئی تذکرہ نہیں آیا۔ پس اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نام کسی غلطی سے آگیا ورنہ آنا نہیں چاہیے تھا۔ اور بظاہر یہی وجہ ہے کہ ابن اثیر جو طبری کے حرف بحرف مقلد ہیں انھوں نے بھی اس قصے کے بیان میں چار ہی نام لیے ہیں حضرت ابن عباس کا نام ان کے بیان میں نہیں ملتا۔ ابن کثیر نے البتہ ان کا نام بھی طبری کی پیروی میں باقی رکھا ہے۔ واللہ اعلم کیونکر ؟

نہ صرف ابن عباسؓ بلکہ ابن ابوبکرؓ بھی !

بہر حال ابن عباس کا ذکر اس فہرست میں قطعی طور پر غلط ہے اور صرف ابن عباسؓ کا نام نہیں غلط ہے بلکہ عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کا نام بھی محلِ غور ہے کہ آیا تاریخی اعتبار سے یہ نام ۵۶ھ کے واقعات کی فہرست میں شامل ہو سکتا ہے یا نہیں ؟ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کا سن وفات عام طور پر ۵۳ھ مانا گیا ہے۔ خود ابن اثیر کی یہی روایت ہے[2] چنانچہ اختلافی گفتگوؤں کا لمبا چوڑا قصہ پورے ڈھائی صفحے میں بیان کرنے کے بعد آخر میں وہ یہ لکھنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ :-

و ذکر عبد الرحمٰن بن ابی بکر	اور اس قصے میں عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ
لا یستقیم علیٰ قول من یجعل	کا ذکر ان لوگوں کے قول کے مطابق

---

[1] یعنی مقام نخلہ کے ایک صاحب۔ معجم البلدان میں نخلہ نام کے دو مقام ہیں۔ ایک نخلۂ شامیہ اور دوسرا نخلۂ محمود ز ج ۵ ص ۲۷۶ جدید اڈیشن۔ واللہ اعلم یہاں کونسا نخلہ مراد ہے۔ [2] ج ۳ ص ۲۴۶ ۔

وفاتہٗ سنۃ ثلاث وخمسین	ٹھیک نہیں بیٹھتا جو اُن کا سنہ وفات
وانّما یصحّ علیٰ قول من یجعلھا	۵۳ھ بتاتے ہیں۔ یہ صرف ان لوگوں
بعد ذالك الوقت[1]	کے قول پر ٹھیک بیٹھے گا جو اُن کا
	سن وفات اسکے بعد بتاتے ہیں۔

ہمارے سامنے جو کتابیں ہیں ان میں صرف ابن کثیر کی البدایہ والنہایہ میں یہ قول ملتا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر کا سن وفات ۵۸ھ ہے اور اس کو وہ "کثیر من علماء التاریخ" کا قول بتاتے ہیں مگر نام کسی ایک کا نہیں لیتے۔ جب کہ اس کے مقابل ۵۳ھ کے قول میں واقدی کا نام ہے، محمد بن سعد کا نام ہے اور ابوعبید وغیرہ کا نام ہے[2] اس "وغیرہ" میں ہم ابن قتیبہ کی المعارف کا اضافہ کرتے ہیں[3]

اور خود ابن کثیر کی البدایہ والنہایہ ہی میں اس کا ایک وزنی قرینہ پایا جاتا ہے کہ ۵۸ھ کا قول صحیح نہیں ہے۔ اور وہ قرینہ یہ ہے کہ ۵۸ھ کے وفیات (OBITUARIES) ہی میں ام المومنین حضرت عائشہ صدّیقہؓ کا نام بھی آتا ہے۔ چنانچہ بھائی بہن کے یہ دونوں نام البدایہ والنہایہ میں پہلو بہ پہلو موجود ہیں اور اسی کے ساتھ حضرت عبدالرحمٰن کے تذکرۂ وفات میں یہ بتاتے ہوئے کہ ان کی وفات مکّے کے راستے میں مکّے سے ۶۔ یا ۱۲ میل کے فاصلہ پر ہوئی تھی جہاں سے ان کو مکّے لے جایا گیا اور بالائی مکہ میں دفن کیا گیا۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ:-

فلما قدمت عائشۃ مکۃ	پس جب حضرت عائشہ مکہ آئیں تو قبر
زارتہٗ وقالت لو شھدتك	پر گئیں اور کہا کہ میں اگر (تمھاری
لم ابك علیك ولو کنت عندك	موت کے وقت) موجود ہوتی تو نہ

---

[1] ج ۳ ص ۲۵۲ [2] ج ۸ ص ۸۹ طبع مطبعۃ السعادۃ۔ مصر [3] ص ۷۶ طبع اول مطبعۂ اسلامیہ ازہر، قاہرہ۔

لم انقلك من موضع الذی متّ فیہ[1]	روتی اور تم کو اس جگہ سے منتقل بھی نہ کرتی جہاں تمہاری موت واقع ہوئی تھی۔

اس عبارت سے یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ اپنے بھائی عبدالرحمٰن کی خبر وفات سن کر مکے گئی تھیں بلکہ عبارت کا تقاضا یہ ہے کہ مکہ ان کا جانا ہوا تو وہ بھائی کی قبر پر بھی گئی تھیں۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ازواجِ مطہرات کا مکے جانا اگر ہوتا تھا تو وہ صرف حج کے لیے ہوتا تھا ۵۸ھ میں حج کا موسم حضرت عائشہؓ نے پایا نہیں۔ اس لیے کہ ان کی وفات کا مہینہ رمضان اور بقول بعض شوال قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ البدایہ والنہایہ میں مذکور ہے[2]۔ پس اگر یہ واقعہ ہے کہ حضرت عائشہؓ اپنے بھائی عبدالرحمٰن کی قبر پر گئیں تو ضروری ہے کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ کی موت ۵۷ھ کے حج سے پہلے کا واقعہ ہو۔ پس اس لیے ۵۸ھ سن وفات نہیں ہو سکتا۔

بہرحال یہ بات مشکوک ہے کہ ۵۶ھ میں یزید کی ولی عہدی سے اختلاف کرنے والے حضرات میں عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ بھی ہوں۔ ہاں اگر الاصابہ فی تمییز الصحابہ (از ابن حجرؒ) کی روایت صحیح ثابت ہو جائے جس کے مطابق حضرت عبدالرحمٰن کا سنِ وفات ۵۶ھ ہوتا ہے اور وفات کا واقعہ حضرت معاویہ سے گفتگو کے بعد پیش آیا ہو[3] تو پھر یہ بیان صحیح ہو گا کہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ بھی ان حضرات میں شامل تھے جنھوں نے یزید کے لیے ولی عہدی کی بیعت سے انکار کیا۔ مگر اس گنجلک کا کیا کیا جائے کہ اس روایت کے متصلاً بعد ابن حجر اس روایت کی تائید میں مؤرخ ابن سعد وغیرہ کا جو بیان پیش کرتے ہیں اس میں جہاں یہ ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن کا انتقال اسی سال ہوا جس سال

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۸۹ [2] ج ۸ ص ۹۴ [3] اصابہ ج ۴ ص ۱۶۹ مطبع شرفیہ۔ ابن حجر کی بیان کردہ اس روایت میں حضرت عائشہؓ کے سفر مکہ کی بابت یہ صراحت بھی پائی جاتی ہے کہ یہ سفر حج کا سفر تھا۔

حضرت معاویہ یزید کی ولی عہدی کے سلسلے میں حجاز آئے تھے، وہیں یہ بھی ہے کہ :-

وماتت عائشۃ بعدہٗ بسنۃٍ   اور عائشہؓ کا انتقال ان کے سال بھر

سنۃ تسع وخمسین ۔   بعد ۵۹ھ میں ہوا ۔

یعنی اب حضرت معاویہ کے سفر کا سنہ ۵۶ کے بجائے ۵۸ ہوگیا حالانکہ وہ متفقہ طور پر ۵۶ھ ہے۔

بہتر ہے کہ اس گنجلک مسئلے کو اب چھوڑ ہی دیا جائے کیونکہ اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں کہ عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ اس اختلاف میں شریک تھے یا نہیں شریک تھے۔ مسئلے میں چونکہ شک کا پہلو سامنے آگیا تھا اس لیے ایک طالب علمانہ خواہش یہ تھی کہ صفائی ہوجائے مگر معلوم ہوا کہ آسان نہیں ہے۔ مزید کافی وقت لگ سکتا ہے جس کی گنجائش سردست نہیں ۔ اس لیے اس ضمنی مسئلے کو چھوڑ کر اب ہم اصل مسئلے پر آتے ہیں، یعنی اختلاف کی جو کہانیاں بیان کی جاتی ہیں دیکھا جائے کہ ان میں کہاں تک صداقت ہے۔

ابن کثیر کا بیان

اختلاف کی کہانی کا بیان اس روایت میں بھی ہے جس کا ذکر ابھی اوپر اس حوالے سے گزرا ہے کہ اس کے بنیادی راوی ایک نامعلوم شخص ہیں جنھیں "مقام نخلہ کے ایک صاحب" کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔ مگر اس روایت والی کہانی میں ایک تشنگی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کہیں بیچ سے شروع کردی گئی ہے، شروع کی کچھ کڑیاں رہ گئی ہیں۔ اس تشنگی کو ابن کثیر کا بیان دور کرتا ہے۔ اگرچہ اس میں اختصار ہے اس لیے ہم ابن کثیر کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ زیاد کے مشورے کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں :-

" پس جب زیاد کا انتقال ہوگیا ــــــ اور یہ اسی سن کی

بات ہے[1] تو معاویہ نے ولی عہدی کے لیے کارروائی شروع کر دی۔ یزید کے لیے بیعت طے کی اور تمام اطراف میں اس کے لیے لکھا۔ پس مملکت کی تمام اقلیموں میں لوگوں نے بیعت کر لی، سوائے عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ اور عبداللہ بن عمرؓ، حسین بن علیؓ، عبداللہ بن زبیرؓ اور ابن عباسؓ کے۔ اس پر معاویہ نے عمرے کے عنوان سے مکّہ کا سفر کیا اور مکّہ سے لوٹتے ہوئے جب ان کا گزر مدینے میں ہوا تو انہوں نے ان پانچوں میں سے ہر ایک کو الگ الگ بلایا اور ڈرایا دھمکایا۔ سو ان سب میں سب سے زیادہ سخت اور بے باکانہ جواب دینے والے عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ تھے، اور سب سے زیادہ نرم کلام والے عبداللہ بن عمرؓ۔ پھر معاویہ نے ایک خطبہ دیا اور اس وقت یہ پانچوں ان کے منبر کے نیچے موجود تھے۔ اس خطبہ کے بعد لوگوں نے یزید کی (ولی عہدی کی) بیعت کی۔ یہ پانچوں بیٹھے رہے، نہ انہوں نے موافقت کی اور نہ کوئی اختلاف ظاہر کیا۔ اس لیے کہ یہ ڈرائے دھمکائے جا چکے تھے۔ پس ساری مملکت میں یزید کی باقاعدہ بیعت ہو گئی اور تمام علاقوں سے وفود (اس کی توثیق کے لئے) یزید کے پاس پہنچے۔"[2]

طبری کی روایت

طبری کی روایت میں اس بیان کا اول و آخر نہیں ہے۔ صرف وہ مکالمہ ہے جو حضرت معاویہ اور ان اختلاف کرنے والے حضرات کے درمیان ہوا، جس کی تفصیل ابن کثیر نے نہیں دی محض حوالہ دیا ہے۔ وہ مکالمہ یہ تھا:۔

"جب معاویہ آئے تو انھوں نے حسین بن علی کو بلوایا اور کہا کہ بھتیجے، سوائے

---

[1] یہ عبارت اوپر گزر چکی ہے اور ہم وہاں تنبیہہ کر چکے ہیں کہ یہ سہو ہے زیاد کا سن وفات ۵۳ھ ہے۔

[2] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۸۶۔

اُن پانچ آدمیوں کے جن کی قیادت تم کرتے ہو، اور سب لوگ اِس معاملے میں متفق ہو چکے ہیں، تو بتاؤ کہ اس اختلاف کی تمھیں کیا ضرورت پیش آرہی ہے؟ حسینؓ نے جواب میں پوچھا: "میں ان کی قیادت کر رہا ہوں"؟ کہا "ہاں تم قیادت کر رہے ہو۔" حسین نے کہا "اچھا تو ان کو آپ بلا لیجئے۔ وہ اگر بیعت کر لیں تو آپ دیکھیں گے کہ میں بھی ان میں کا ایک ہو جاؤں گا، ورنہ پھر آپ میرے بارے میں تیز نہ ہوں"۔ معاویہ نے کہا "تم ایسا کرو گے؟" کہا ہاں بالکل۔" اس پر معاویہ نے ان سے اقرار مانگا کہ وہ اس بات چیت کو کسی پر ظاہر نہیں کریں گے۔ حسین نے بچنے کی کوشش کی۔ مگر بالآخر قول دے دیا۔ وہ نکلے تو راستے میں ابن زبیر نے ایک آدمی بٹھا رکھا تھا۔ اس نے کہا کہ آپ کے بھائی ابن زبیر پوچھتے ہیں کہ بڑے میاں سے کیا بات ہوئی ہے؟ حسین نے بچنا چاہا مگر اس آدمی نے پیچھے پڑ کے کچھ نہ کچھ ان سے نکلوا ہی لیا۔ حسین کے بعد معاویہ نے ابن زبیر کو بلا بھیجا اور ان سے بعینہٖ یہی بات ہوئی۔ جو حسین سے معاویہ نے کہا تھا وہی ابن زبیر سے کہا اور جو جواب حسین نے دیا تھا بالکل وہی ابن زبیر نے دیا۔ معاویہ نے ان سے بھی اقرار مانگا کہ کسی کو بتاؤ گے نہیں۔ ابن زبیر نے اس پر کہا کہ امیر المؤمنین ہم آپ حرمِ الٰہی میں ہیں[1]۔ اور یہاں آپ سے اقرار گویا اللہ سے اقرار ہے اور یہ بڑی بھاری بات ہے، یہ میں نہیں کر سکتا ہوں۔ اس کے بعد وہ گئے تو عبداللہ بن عمر کو بلوا گیا۔ ان سے معاویہ نے ذرا نرم بات کی اور یہ کہا کہ "دیکھو میں ڈرتا ہوں کہ اپنے بعد امتِ محمد کو ان بکریوں کی طرح چھوڑ جاؤں جن کا کوئی چرواہا نہ ہو۔" اور تمھیں معلوم ہے کہ سب لوگ بیعت کر چکے ہیں

[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکہ مکرمہ کا واقعہ ہے۔

صرف وہ پانچ نفر باقی ہیں جن کی قیادت تم کرتے ہو۔ آخر تمھیں کیا ضرورت پیش آرہی ہے"؟ ابن عمر نے جواب دیا کہ میں تمھیں اس مقصد کی ایسی صورت بتاؤں کہ جس سے کوئی برائی بھی نہ آوے اور امت میں فتنہ وفساد کا سدّباب بھی ہو جائے، کہا ضرور بتاؤ۔ کہا تم مجمع میں بیٹھو میں آؤں گا اور اس بات پر تمھاری بیعت کروں گا کہ تمھارے بعد جس شخص پر بھی امّت متفق ہو گی، میں اس سے بیعت کرلوں گا، اگرچہ وہ ایک حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو" معاویہ نے کہا تم ایسا کروگے ؟ کہا بے شک۔ اس کے بعد (حرم سے) گھر یعنی قیام گاہ پر آگئے اور عبدالرحمٰن بن ابی بکر کو بلوایا اور کہا کہ ابن ابی بکر تم کس برتے پر میری مخالفت کے درپے ہو؟ ابن ابی بکر نے جواب دیا میں اس میں خیر دیکھتا ہوں، کہا میں تمھیں قتل کر دوں گا، جواب ملا کہ اگر تم نے ایسا کیا تو تم پر دنیا میں اللہ کی لعنت ہو گی اور آخرت میں دوزخ تمھارا ٹھکانہ۔" ابن عون کہتے ہیں نخلہ والے آدمی نے (یا پانچویں شخص) ابن عباس کا کوئی ذکر اس مکالمے کے سلسلے میں نہیں کیا۔[1]"

ایک سوال اور اس کا حل

طبری کی اس روایت کو پڑھ کر لازماً یہ سوال پیدا ہونا چاہیے کہ عبدالرحمٰن بن ابی بکر کی کیا خصوصیت تھی کہ ان سے حضرت معاویہ نے بہت کڑے اور کڑوے انداز میں بات کی۔ جب کہ دیگر افراد کے ساتھ ان کا انداز گفتگو یہ نہیں تھا؟ اس سوال کا کچھ حل شاید ابن اثیر کے بیان سے نکلے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب زیاد کی موت کے بعد معاویہ نے یزید کے لیے ولی عہدی کی بیعت حاصل کرنے کا عزم کرلیا تو سب سے پہلے تو انھوں نے

---

[1] طبری ج ۶ صـ۱۷۰۔

عبداللہ بن عمر کو ہموار کرنے کی کوشش کی جس میں ان کو ناکامی ہوئی۔ بعدازاں مدینے کے گورنر مروان بن حکم کو لکھا کہ :

"میری عمر بہت ہو گئی ہے، ہڈیاں گھل رہی ہیں اور میں ڈرتا ہوں کہ میرے بعد امت میں (اقتدار کے مسئلے پر) اختلاف رونما ہو، اس لیے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اپنے بعد کے لیے کسی آدمی کو نامزد کر جاؤں، لیکن میں یہ نہیں پسند کرتا کہ یہ کام ان لوگوں کے مشورے کے بغیر کر لوں جو تمہارے پاس ہیں (یعنی اہل مدینہ) پس تم یہ میری بات ان کے سامنے رکھو اور ان کے جواب سے مجھے آگاہ کرو۔ چنانچہ مروان نے یہ مسئلہ اہل مدینہ کے سامنے رکھا اور ان لوگوں نے جواب دیا کہ ہاں بالکل مناسب بات ہے ہم بھی پسند کریں گے کہ وہ ہمارے لیے کسی کو نامزد کر دیں اور اس میں کوتاہی نہ کریں۔ مروان نے یہ روداد حضرت معاویہ کو بھیجدی۔ وہاں سے جواب میں یزید کا نام آیا۔ مروان نے لوگوں کو جمع کر کے بتایا کہ امیرالمومنین نے آپ کے لیے پوری خیرخواہی کے ساتھ اپنے فرزند یزید کو اپنے بعد کے لیے انتخاب کیا ہے۔ یہ سن کر عبدالرحمٰن بن ابی بکر کھڑے ہو گئے اور بولے کہ مروان تم بھی جھوٹے اور معاویہ بھی جھوٹے۔ تم دونوں کی نیت اس انتخاب میں امت محمدیہ کے ساتھ بھلائی کی نہیں بلکہ تم لوگوں کی نیت یہ ہے کہ خلافت کو ہرقلیّت بنا دو۔ کہ ایک ہرقل[1] مرا تو دوسرا آ گیا...... اسی طرح حسین ابن علی، عبداللہ بن زبیر اور ابن عمر نے بھی اس تجویز کی مخالفت کی۔ اور مروان نے پھر اس کی اطلاع معاویہ کو دی۔"[2]

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن کے ساتھ حضرت معاویہ کی شدّت کے پس منظر میں حضرت عبدالرحمٰن کی یہ شدّت تھی جو ابن اثیر کی مذکورہ بالا روایت میں نظر آتی ہے۔

---

[1] یہ شاہان روم کا لقب تھا۔ [2] ابن اثیر ج ۳ ص ۲۵۰

جبکہ دوسروں (حضرت حسین وغیرہ) نے یہ شدّت نہیں اختیار کی تھی۔ یہ واقعہ پہلے پیش آچکا تھا اس کے بعد حضرت معاویہ نے حجاز کا سفر کیا ہے۔ شاید اسی لیے حضرت عبدالرحمٰن کے ساتھ ان کا اندازِ گفتگو مختلف تھا۔

وفود کی کہانی

ابن اثیر ہی کے بیان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مروان کو جب حضرت معاویہ نے یزید کا نام اپنے ولی عہد کی حیثیت سے مدینہ بھیجا تھا کہ اس کے لیے اہلِ مدینہ کی منظوری حاصل کریں تو ساتھ ہیں یہ بھی ہدایت کی تھی کہ مدینے سے کوئی وفد بھی اس منظوری کے اظہار کے طور پر دمشق آنا چاہیے۔ اور اسی طرح دوسرے گورنروں کو بھی ان کے علاقے سے متعلق لکھا تھا[۱] چنانچہ یہ وفود پہنچے۔ ابن اثیر نے ان میں سے خاص طور پر دو[۲] کا ذکر کیا ہے۔ ایک اہل مدینہ کا وفد جس میں سے محمد بن عمرو بن حزم کا نام دیا گیا۔ دوسرا اہل بصرہ کا وفد جس میں احنف بن قیس کا نام مذکور ہوا ہے۔

ابن اثیر نے ان وفود کے اجتماع کی کاروائی جس طرح دی ہے اس سے یہ تاثر ہوتا ہے کہ اس اجتماع سے جو مقصد حضرت معاویہ کا تھا کہ یزید کی ولی عہدی پر تمام مملکت کے نمائندوں کی مہرِ اتفاق ثبت کرالی جائے۔ یہ مقصد اس اجتماع سے تو حاصل نہیں ہو سکا بلکہ ایک انتشاری کیفیت کے ساتھ اجتماع برخاست ہوا۔ البتہ بعد میں حضرت معاویہ نے لطف و عطا اور مدارات کے ذریعہ لوگوں کو ہموار کیا اور اکثریت سے یزید کی ولی عہدی پر بیعت حاصل کر لی[۲] اور اس کے بعد حجاز کا سفر کیا تاکہ وہاں جو لوگ بیعت سے انکار کر رہے ہیں ان کا انکار ختم کرایا جائے۔ انھیں سمجھایا جائے کہ اب جب کہ اور سب ہی لوگ متفق ہو چکے تو کچھ کا اختلاف جاری رہنا مناسب نہیں

---

[۱] ابن اثیر ج ۳ صفحہ ۲۵۰ [۲] ایضاً صفحہ ۲۵۱

یہی وہ سفر ہے جس کی روداد طبری کے نیز البدایہ والنہایہ کے حوالے سے اوپر پڑھی جا چکی ہے ۔

سوالیہ نشان ؟

یہ بات کوئی ناممکن نہیں ہے کہ وفود کا اجتماع ناکام رہا ہو اور نہ یہ کہ اس کا تدارک حضرت معاویہ نے مدارات وعطیّات اور تالیفات سے کیا ہو۔ ایک آدمی اگر حضرت معاویہ سے حسن ظن رکھتا ہے تو وہ اس بارے میں بلا کسی دقّت کے یوں سوچ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ انھوں نے نیک نیتی سے اور اچھے مقصد سے کیا تھا۔ لیکن اجتماع کی جو روداد ابن اثیر نے بیان کی ہے اس کا منطقی تقاضا یہ ہے کہ اجتماع اپنے مقصد کے اعتبار سے کامیاب رہا ہو، نہ کہ ناکام ۔ جبکہ مدارات وعطیات سے کام لینے کی بات جو انھوں نے بلا کسی ثبوت، مثال اور حوالے کے صرف ایک فقرے میں بیان کردی ہے وہ اپنے لیے کسی وزن کا تقاضہ نہیں کرتی ۔ بلکہ داد و دہش کا جو تنہا ایک واقعہ انھوں نے اس قصّے کے بالکل شروع میں بیان کیا ہے وہ تو اس بات کا ثبوت ہے کہ داد و دہش سے کچھ کام نہیں بنا[1] ۔

اجتماع کی روداد جو ابن اثیر نے بیان کی ہے وہ یہ ہے :۔

ثمّ ان معاویۃ قال للضحاک بن قیس الفہری لما اجتمع	پھر جب وفود جمع ہو گئے تو معاویہ نے ضحاک[2] بن قیس سے کہا کہ میں اوّلاً

---

[1] لکھا ہے کہ زیاد کی موت کے بعد یزید کی ولی عہدی کا تہیّہ کیا تو حضرت عبداللہ بن عمر کو ایک لاکھ درہم بھیجے جو انھوں نے یہ شبہ ہونے کے بعد لینے سے انکار کر دیا کہ یزید کی ولی عہدی کے سلسلے میں ہیں ۔ ص ۲۵ ۔

[2] کم عمر صحابہ میں سے ہیں ۔ بعض احادیث کی روایت بھی ان سے ہے ۔ حضرت معاویہ کے خاص الخاص حامیوں میں تھے ۔ ۵۶ھ کے اس اجتماع کے وقت کوفہ کے گورنر تھے ۔ بعد میں (بقیہ حاشیہ ص ۱۰۴ پر)

الوفود عندهٗ: انّی متکلّمٌ فاذا	کچھ کہوں گا پھر جب میں خاموش ہوں
سکتُّ فکن انت الّذی	تو تم کھڑے ہو، یزید کی بیعت کی تحریک
تدعوا الی بیعۃ یزید وتحثنی	کرو اور مجھے اس کے لیے ترغیب دو"
علیھا فلما جلس معاویۃ	پس جب معاویہ خطاب کرنے بیٹھے
للناس تکلم فعظم امر الاسلام	تو اسلام کی عظمت، خلافت کی حرمت
وحرمۃ الخلافۃ وحقھا و ما	(SANCTITY) اور اس کا حق اور
امر اللہ بہ من طاعۃ ولاۃ	اولوالامر کی اطاعت کے بارے میں اللہ
الامر ثم ذکر یزید وفضلہٗ	کے احکام بیان کیے، پھر یزید اور اس
وعلمہ بالسیاسۃ وعرض	کی خوبیوں کا بالخصوص اس کے سیاسی
بیعتہ فقام الضحاک	شعور اور آگاہی کا تذکرہ کر کے اسکی
فحمد اللہ واثنیٰ علیہ ثم	بیعت کا مسئلہ پیش کیا۔ اس کے بعد
قال: یا امیر المؤمنین انہٗ	ٹھیک اسی انداز سے ضحاک بولے،
لابد للناس من والی بعدك	حمد و ثنا کے بعد کہا کہ امیر المومنین لازم
وقد بلونا الجماعۃ والالفۃ	ہے کہ آپ کے بعد کے لیے صاحب
فوجدناھما احقن للدماء	امر کا تقرر ہو جائے تاکہ جماعت اور
واصلح للدھماء و اٰمن	یکجہتی قائم رہے جس کی برکتیں ہم نے

(بقیہ حاشیہ صـ۱۰۳ کا) حضرت معاویہ نے ان کو دمشق میں انتظامیہ کی سربراہی سپرد کی۔ حضرت معاویہ کی نماز جنازہ انہی نے پڑھائی یزید کے زمانے میں یہ اپنے منصب پر برقرار رہے یزید کی موت کے بعد انکی رائے تھی کہ سب لوگ عبداللہ بن زبیر کی بیعت کر لیں اور قریب تھا کہ لوگ بات چل جاتی اور اسلامی جمعیت پھر سے بحال ہو جاتی مگر ابن زیاد نے مروان کو امیدوار بنا کے کھڑا کر دیا۔ ۶۴ھ میں مروان کے مقابلے میں عبداللہ بن زبیر کی طرف سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

اصابہ ج ۳ صـ۲۶۴ سیر اعلام النبلاء ج ۳ صـ۲۴۱ تا ۲۴۵۔

للسبل وخيرًا في العاقبة والايّام عوّجٌ رواجع والله كل يوم هو في شأن وبزيد بن امير المؤمنين في حسن هديه وقصد سيرته على ما علمت وهو من افضلنا علمًا وحلمًا والعدنا رأيًا فوله عهدك واجعله لنا علمًا بعدك ومفزعًا نلجأ اليه ونسكن في ظله۔ ذتکلم عمرو بن سعيد الاشدق بنحو من ذالك، ثم قام يزيد بن المقنع العذري فقال

آزمائی ہیں کہ اس میں جانوں کی حفاظت ہے، راستوں کا امن ہے اور عاقبت کی بھلائی ہے۔ زمانہ کی کج رفتاری ہم سب پر روشن ہے اور اللہ کی شان بے نیازی بھی، میں سمجھتا ہوں کہ یزید بن امیرالمومنین اس کام کے لیے نہایت موزوں ہیں، ان کے حسن سیرت کا حال آپ پر عیاں ہے نیز علم، حلم اور رائے میں وہ ہم سب سے فائق ہیں۔ پس ان کو اپنے بعد کیلئے نامزد کرکے ہمارے لیے ایک نشان وعلَم اور ایک پناہ گاہ کا انتظام کیجیے۔ کہ جس کی پناہ اور سائے میں ہم قرار پکڑیں پھر عمرو بن سعید الاشدق[1] بولے

---

[1] کبار تابعین میں ہیں۔ بعض نے صحابہ میں شمار کیا ہے لیکن یہ صحیح نہیں (اصابہ ابن حجر) ابن کثیر انکے تذکرے میں لکھتے ہیں کان من سادات المسلمین ومن الکرماء المشھورین الخ (ج ۸ ص ۳۱۱) اور یہی اوصاف انکے والد ماجد سعید بن العاص کے تھے جو حضرت عثمانؓ کی تربیت میں رہے تھے اور حضرت عثمان کے زمانے میں کوفے کے گورنر رہے پھر حضرت معاویہ کے زمانے میں بھی اولاً کوفے کی پھر مدینے کی گورنری پر رہے (اصابہ ج ۲) عمرو بن سعید اس اجتماع کے وقت کسی عہدے پر تھے یا نہیں، یہ معلوم نہیں ہو سکا البتہ بعد میں وہ مکے اور مدینے کی گورنری پر رہے ہیں۔ حادثۂ کربلا کے وقت وہ پورے حجاز کے گورنر تھے۔ واقعہ کے بیان میں ان کا ذکر آئے گا۔ غالب گمان یہ ہے کہ ۵۶ھ کے اس اجتماع کے وقت بھی وہ برسرعہدہ ہوں اور جیسا کہ دستور تھا ان کے والد سعید کے ۵۳ھ یا ۵۴ھ میں انتقال کے بعد انھیں کوئی جگہ دے دی گئی ہو۔

هذا امیر المومنین واشار
الی معاویۃ فان هلك فهذا
واشار الیٰ یزید ومن ابیٰ
فهذا واشار الیٰ سیفه
فقال معاویه، اجلس فانت
سید الخطباء وتکلم من
حضر من الوفود فقال معاویۃ
لاحنف ما تقول یا ابا بحر،
فقال نخافکم ان صدقنا
ونخاف الله ان کذبنا
وانت یا امیر المؤمنین اعلم
بیزید فی لیله ونهاره
وسرّه وعلانیته و
مدخله ومخرجه
فان کنت تعلمهٗ لله تعالیٰ
وللامّة رضًا فلا تشاور
فیه وان کنت تعلم فیه

اور کچھ یہی باتیں انہوں نے بھی کہیں ۔
اس کے بعد یزید بن مقنع عذری[1] کھڑے
ہوئے اور معاویہ کی طرف اشارہ کرکے
بولے یہ امیر المومنین ہیں ان کو اگر
کچھ ہو جائے تو یزید کی طرف اشارہ
کرکے بولے کہ۔ پھر یہ ہیں۔ اور اس
کے بعد اپنی تلوار کی طرف اشارہ کیا
کہ جو انکار کرے اس کے لیے یہ ہے
معاویہ نے کہا بس بیٹھ جاؤ، تم
سب سے بڑے خطیب ہو، اس طرح
تمام وفود نے اظہار خیال کیا۔ احنف[2]
نہیں بولے تھے۔ معاویہ نے ان سے
مخاطب ہو کر کہا کہ ابو بحر (یہ کنیت ہے)
تم بھی تو کچھ کہو۔ اس پر انہوں نے
کہا کہ اگر سچ کہوں تو آپ لوگوں کا
خوف ہے اور جھوٹ میں اللہ کا
خوف۔ امیر المومنین مختصر یہ ہے کہ

[1] ان صاحب کا حال معلوم نہ ہو سکا۔ [2] احنف بن قیس بصری تابعین میں ہیں فتنے کے وقت میں حضرت علی کے خاص حامیوں میں تھے، اپنی نیک سیرت، حلم، وقار اور دانش کی وجہ سے حضرت معاویہ کے دور میں بھی محترم اور معزز رہے۔ ابو بحر کنیت تھی اور کنیت سے مخاطب کرنا عرب میں تعظیم کی علامت تھی۔ (ابن اثیر ج ۳، اصابہ ج اوّل)

غیر ذالك فلا تزوّده الدنیا
وانت صائر الی الآخرة
وانما علینا ان نقول سمعنا
واطعنا، وقام رجل من
اهل الشام فقال ما ندری
ما تقول هٰذه المعدیة
العراقیة وانما عندنا
سمع وطاعة وضرب
وازدلاف فتفرق الناس
یحکون قول الاحنف [1]

آپ یزید کے لیل ونہار اور ظاہر و
باطن سے واقف ہیں۔ اگر آپ سمجھتے
ہیں کہ اس کے انتخاب میں اللہ اور
امت کی رضا ہے تو کسی سے مشورے کی
کوئی ضرورت نہیں۔ اور اگر ایسا نہیں
سمجھتے تو پھر اب جب آپ کا چل چلاؤ ہے
ہے اس کی محض دنیا کا بندوبست
مت کیجئے۔ اور ویسے آپ جو بھی طے
کریں گے ہمارا فرض تو سَمِعْنَا واَطعنَا
ہے، اور اس پر ایک شامی کھڑا ہوا
اور بولا ہم نہیں سمجھے کہ یہ عراقی زبان
کہنا کیا چاہتی ہے۔ ہم تو بس سمع
وطاعت جانتے ہیں اور سیدھی
سیدھی باتیں۔ اس پر لوگ منتشر ہو گئے
اس طرح کہ احنف کا قول ان کی
زبان پر تھا۔

اب ذرا غور کیجئے کہ وفود کا اجتماع حضرت امیر معاویہ منعقد کر رہے ہیں۔ وفود بھیجے ہوئے ان کے گورنروں کے ہیں۔ ماحول دمشق کا ہے۔ سب تقریریں یزید کی ولی عہدی کی حمایت میں ہو رہی ہیں۔ بعض تقریروں میں بڑی صفائی، صراحت اور سنجیدگی سے آسے اسی سیرت اور ان صفات کا حامل بتایا جا رہا ہے جو منصب خلافت کو درکار ہیں۔ ایسے

---

[1] ابن اثیر ج ۳ ص ۲۵۱ - ۲۵۰ ۔

ماحول میں صرف ایک تقریر، نہایت مختصر حضرت احنف بن قیس کی ہوتی ہے، جو بہت محتاط اور بند بند طریقے پر کچھ مختلف رائے دیتے ہیں[۱] مگر ساتھ میں یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ جو بھی فیصلہ امیر المومنین کر دیں گے ہم اس کی مخالفت نہیں کریں گے۔ فرمانبرداری کریں گے۔ پھر اس تقریر کے بعد ایک شامی کھڑے ہو کر کہتا ہے کہ یہ کیا "نیمے دروں نیمے بروں" کا انداز ہے۔ ہم شامی صرف ایک اور سیدھی بات جانتے ہیں، سمع اور طاعت !

کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ایسے ماحول میں یہ اجتماع بلا کسی فیصلے کے انتشار پر ختم ہوا ہوگا جیسا کہ ابن اثیر بتاتے ہیں ؟ بظاہر یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے اور اس لیے وہ نتیجہ جو ابن اثیر بتاتے ہیں کہ :-

استوثق اکثر الناس	لوگوں کی اکثریت نے توثیق کر دی
وبایعہ، [۲]	اور بیعت کر لی ۔

یہ نتیجہ اسی اجتماع کا ہونا چاہیے جو اسی مقصد کے لیے بلایا گیا تھا نہ کہ اس خیالی مدارات وعطا کا جس کا کوئی ثبوت اور حوالہ دیئے بغیر ابن اثیر اس نتیجہ کو اسی کا کرشمہ ٹھیراتے ہیں۔

دمشق کے اس اجتماع کی کارروائی کے ذکر سے ہمارا مقصد صرف اُس کمی کو پورا کرنا تھا جو طبری کی روایت میں رہ گئی تھی۔ تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس روایت کے مطابق حضرت معاویہ نے حجاز کا سفر کر کے حضرت حسین رضؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ وغیرہ سے جو یہ کہا کہ سب لوگ یزید کی ولی عہدی کے لیے بیعت کر چکے ہیں تم ہی لوگ کیوں مخالفت کر رہے ہو ؟ تو اس کا پس منظر کیا تھا، کب اور لوگوں نے بیعت کر لی تھی اور کس طرح یہ کارروائی ہوئی تھی ؟

---

[۱] کچھ اسی طرح کی بات وفد مدینہ کے محمد بن عمرو بن حزمؒ سے بھی منسوب کی گئی ہے مگر اسے وفود کے اجتماع کی کارروائی میں نہیں، اس کارروائی سے باہر دکھایا گیا ہے، اجتماع میں انکی شرکت نہیں دکھائی گئی۔ اس لیے ہم نے اس کا ذکر یہاں نہیں کیا ہے۔ [۲] ایضاً ص ۲۵۱

ابن اثیر اور حضرت معاویہؓ کا سفرِ حجاز

ابن اثیر کے بیان میں معاملہ کی ایک اچھی خاصی ــــ یا کم از کم فی الجملہ ــــ معقول صورت کو جس طرح خواہ مخواہ بدصورت کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ ابھی ہم نے دیکھی اور یہی وہ باتیں ہیں جنھوں نے ہماری تاریخ کے اس باب کو قطعی یکطرفہ اور نامنصفانہ رنگ دیدیا ہے۔ اب اس کے بعد ابن اثیر کی زبانی حضرت معاویہ کے سفر حجاز کی روداد بھی سن لیجئے، اس میں ابن کثیر کے اس مجمل بیان کی، جو ہم اوپر دے آئے ہیں ــــ تفصیل ہے کہ جو ــــ چار یا پانچ ــــ اصحاب مخالفت کر رہے تھے ان کو حضرت معاویہ نے ڈرا دھمکا کر خاموش کیا۔ اور اسی تفصیل کے اجزاء کافی مشہور ہوئے ہیں حالانکہ ان کے بے تکے پن کی انتہا نہیں ہے۔ اس کے باوجود ان کی شہرت وقبولیت کو ہم صرف اپنی روایات پرستی کی معراج کہہ سکتے ہیں[1]۔

ابن اثیر بتاتے ہیں کہ جب "لطف وعطا ومدارات" کے ذریعہ "اکثر الناس" کی اور خصوصاً اہل عراق وشام کی بیعت یزید کی ولی عہدی کے لیے حاصل کرلی گئی تو معاویہؓ نے ایک ہزار سواروں کے ساتھ حجاز کا رخ کیا چلتے چلتے مدینے کے پاس پہنچے تھے کہ اوّل آدمی جو نظر پڑا وہ حسین بن علیؓ تھے۔ معاویہ انھیں دیکھ کر بولے:۔

لا مرحبًا ولا اھلًا بدنة یترقرق دمھا واللہ مھریقھا۔	استغفر اللہ، یہ کون نظر آیا، قربانی کا بکرا ہے جس کا خون اچھل رہا ہے اور اللہ اسے بہائے گا۔

حسینؓ نے جواب دیا:۔

---

[1] اسی روایت پرستی کا ماتم اقبالؔ نے کیا ہے ؎

حقیقت خرافات میں کھو گئی ۔۔۔ یہ امت روایات میں کھو گئی

مھلاً نانیّ دالله لست باھلٍ لہٰذہ المقالۃ۔ | ایسی درشتی مت کیجئے، میں واللہ ایسی بات کا مستحق نہیں ہوں۔

معاویہ بولے، "اس سے بھی بڑی بات کے مستحق ہو"۔۔۔ پھر ابن زبیر ملے اُنکو دیکھ کر بولے "مکار گوہ جو اپنا سر بل میں گھسا لیتی ہے اور دُم پٹکا کرتی ہے لیکن قریب ہے کہ دُم سے پکڑلی جائے گی اور کمر توڑ دی جائے گی، اسے مجھ سے دور کرو۔" چنانچہ ان کی سواری پر دو ہنٹر مار کر راستے سے ہٹا دیا گیا۔ اس کے بعد عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ ملے معاویہ بولے "لامرحباً ولا اھلاً۔ بوڑھا ہے جو سٹھیا گیا اور عقل سے بیدل ہوا"۔ یہ کہہ کر ان کو بھی راہ سے ہٹا دیا گیا۔ اور پھر یہی سلوک ابن عمر کے ساتھ کیا گیا۔ تب یہ لوگ معاویہ کے ساتھ ساتھ مدینے کی طرف کو چل دیئے۔ درانحالیکہ وہ ان کی طرف کوئی التفات نہیں کر رہے تھے[1] مدینہ پہنچ کر یہ لوگ معاویہ کے پیچھے پیچھے ان کی اقامت گاہ پر بھی پہنچے۔ جہاں ان کا ان کی حیثیت کے مطابق استقبال نہیں ہوا۔ تب یہ لوگ مدینہ چھوڑ کر مکے چلے گئے۔ معاویہ نے مدینے میں ایک تقریر کی جس میں خلافت کے لیے یزید کی اہلیت اور دوسروں پر اس کی فوقیت بیان کر کے مخالفت کرنے والوں کو دھمکایا کہ اسے اب برداشت نہیں کیا جائیگا اس کے بعد ام المومنین حضرت عائشہؓ کے یہاں حاضری دی۔ جہاں ام المومنین نے ان سے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ تم نے حسینؓ وغیرہ کو قتل کی دھمکی دی ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ام المومنینؓ یہ لوگ فی الواقع اس سے بالاتر ہیں۔۔ لیکن آپ مجھے یہ بتائیں کہ میں یزید سے بیعت کر چکا ہوں اور ان لوگوں کے ماسوا سب بیعت کر چکے ہیں، تو کیا اب یہ بیعت توڑ دی جائے؟ حضرت عائشہؓ نے

---

[1] یہاں ایک بار پھر نوٹ کر لیجئے کہ ابن عباسؓ کا نام اس فہرست میں نہیں ہے۔

جواب دیا کہ نہیں، مگر ان کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ، مجھے امید ہے کہ جو تم چاہتے ہو وہی ہو جائے گا۔ معاویہ بولے بہت اچھا میں ایسا ہی کروں گا۔ پھر کچھ دن ٹھہر کر مکہ روانہ ہوئے۔ اور اب خواہش کہ ان چاروں (حضرت حسینؓ وغیرہ) سے ملیں، جو کہ مکے ہی میں تھے۔ اس خواہش کا علم ان لوگوں کو ہوا تو وہ بطن مَرّ (مرّ الظہران[1]) میں آکر ملے۔ سب سے پہلے ملنے والے حضرت حسینؓ تھے۔ انھیں دیکھ کر معاویہ بولے "مرحبًا و اھلاً یا ابن رسول اللہ وسید شباب المسلمین" اور حکم دیا کہ ان کے لیے سواری لائی جائے۔ پس اب وہ سوار ہو کر معاویہ کے ساتھ ساتھ چلے۔ علیٰ ہٰذا باقی تین کے ساتھ بھی معاملہ کیا۔ اور اب ان چاروں کے جلو میں اس طرح چلے کہ کوئی پانچواں اس زمرے میں شامل نہیں تھا۔ اور اسی شان کے ساتھ ان چاروں کو لے کر مکے میں داخل ہوئے، پھر جتنے دن رہے ہر دن نیا اکرام، نیا احسان تھا۔ اور دوسری کوئی بات نہیں تھی، حتیٰ کہ عمرے کے ارکان ادا ہو گئے اور چل چلاؤ کا وقت آنے لگا۔ تو ان چاروں نے آپس میں کہا کہ کسی دھوکے میں نہ آجانا۔ یہ سب جو ہو رہا ہے ہماری محبت میں نہیں ہو رہا ہے۔ "مطلب سعدی دیگر است" لہٰذا جواب سوچیے کہ جب مطلب کی بات ہم سے کہی جائے گی تو کیا کہنا ہے۔ پس ان لوگوں نے طے کیا کہ بڑے میاں مطلب کی بات کہیں گے تو ابن زبیرؓ ان کو جواب دیں گے۔ چنانچہ وہ وقت آگیا اور معاویہ نے ان کو طلب کر کے کہا کہ تمھارے ساتھ جو میرا رویّہ رہا ہے وہ تم جانتے ہو، تم سے رشتہ داریوں کا جو پاس و لحاظ مجھے رہا ہے وہ بھی تم پر عیاں ہے اور اس کے مقابلے میں جو تم لوگوں کی روش رہی ہے اس کے لیے میرا تحمّل بھی تم سے مخفی نہیں۔ اب اس وقت بات یزید کی ہے۔ وہ تمھارا بھائی ہے،

[1] مکّے سے چار پانچ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں کا نام (معجم البلدان) اسکو وادیٔ فاطمہ بھی کہتے ہیں۔

تمہارا ابن عم ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ خلافت کے عہدے کے لیے تم اسے آگے بڑھاؤ،
رہے خلافت کے اختیارات، عزل و نصب، تحصیل خراج و تقسیم دولت، وہ سب
تمہارے ہاتھ میں ہوگا۔ یزید تمہارے آڑے نہیں آئے گا۔ یہ لوگ
خاموش رہے، کچھ بولے نہیں۔ معاویہ نے دوبارہ کہا کہ تم کچھ جواب نہیں دیتے،
پھر ابن زبیر سے مخاطب ہوئے کہ تم بولو۔ تم ہی ان کے خطیب ہو — ابن زبیر
نے جواب دیا کہ میں تین باتیں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔

۱۔ اپنے بعد کے لیے ایسے چھوڑ جائیے جیسے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم چھوڑ گئے
تھے کہ کسی کا تقرر نہیں کیا، لوگوں نے ابوبکرؓ کو منتخب کر لیا۔

معاویہ بولے کہ آج تم میں کوئی ابوبکرؓ جیسا نہیں ہے پس اختلاف ہوگا۔

۲۔ ابن زبیرؓ نے کہا کہ اچھا پھر ابوبکرؓ کی طرح کیجئے کہ خلیفہ نامزد کیا مگر اپنی اولاد
یا خاندان کا نہیں۔

۳۔ یا عمرؓ کی طرح کیجئے کہ انتخاب خلیفہ کے لیے شوریٰ نامزد کر دی۔ مگر اس میں اپنی
اولاد یا خاندان کے کسی فرد کو نہیں رکھا۔

معاویہ نے کہا اور کوئی صورت تمہارے پاس پیش کرنے کو نہیں ہے! ابن زبیرؓ
بولے کہ نہیں۔ باقی لوگوں سے پوچھا تو انہوں نے بھی یہی جواب دیا۔

معاویہ نے کہا اچھا اب بات چیت ختم ہوئی۔ میں نے چاہا تھا کہ تم
لوگوں کی رضامندی حاصل کر لوں۔ مگر معلوم ہوا کہ یہ نہیں ہو سکے گا۔ پس
حجت تمام ہوئی۔ اب کوئی مجھے الزام نہ دے۔ اب تک میرا معاملہ یہ تھا کہ میں
تقریر کرنے کھڑا ہوتا اور تم میں سے کوئی بھی برسرِعام میری تکذیب کرنے کھڑا
ہو جاتا تو میں اسے برداشت کر لیتا اور درگزر کر جاتا تھا۔ لیکن آج مجھے لوگوں
میں کچھ کہنا ہے۔ اس موقع پر اگر تم میں سے کسی نے میری تکذیب کی تو

بخدا دوسرا کلمہ نکالنے سے پہلے تلوار اس کے سر پر پہنچ چکی ہو گی۔ یہ کہہ کر اپنے محافظ دستے کے سربراہ کو بلایا اور کہا کہ ان میں سے ہر ایک کے اوپر اپنے دو آدمی شمشیر بکف مسلط کرو۔ اور ہدایت کرو کہ اگر میری تقریر کے دوران ان میں سے کوئی کچھ بولے تو اس کی گردن اڑا دیں۔ اس کے بعد معاویہ اور ان کے ساتھ میں یہ چاروں بھی چلے حتیٰ کہ معاویہ منبر پر پہنچے اور حمد و ثنا کے بعد کہا کہ یہ (حسین، ابن زبیر، ابن عمر ابن ابوبکر) سادات مسلمین اور عمائدین ملت ہیں۔ جن کے مشورے ہی سے تمام کام انجام پاتے ہیں، انہوں نے یزید کی ولی عہدی قبول کی اور بیعت کرلی ہے۔ بس اب آپ سب لوگ بھی اللہ کا نام لے کر بیعت کریں۔ چنانچہ سب اہل مکہ نے بیعت کرلی۔ اور معاویہ نے اسی وقت سواری کھنچوائی اور مدینہ کو روانہ ہو گئے اب اہل مکہ نے ان لوگوں سے سوال کیا کہ آپ لوگ تو کہتے تھے کہ ہم ہرگز بیعت نہ کریں گے۔ یہ کیا ہوا؟ ان لوگوں نے کہا کہ بخدا ہم نے بیعت نہیں کی ہے۔ لوگوں نے کہا پھر آپ نے تردید کیوں نہیں کی۔ اس آدمی کو بولنے کیوں دیا! بولے اس نے ہمارے ساتھ داؤں کھیلا اور ہم ڈر کے مارے نہیں بول سکے۔ اُدھر معاویہ مدینے پہنچ گئے اور مدینے والوں نے بھی بیعت کرلی۔ یہ کام کر کے معاویہ شام روانہ ہو گئے اور بنی ہاشم کے ساتھ اپنے برتاؤ میں سختی شروع کی۔ (یعنی وظائف وغیرہ روک دیئے) اس پر ابن عباس دمشق پہنچے اور کہا کہ یہ کیا قصہ ہے؟ معاویہ نے کہا قصہ کیا ہوتا۔ وہ تمہارے حسین صاحب بیعت نہیں کر رہے ہیں اور تم لوگ ان سے کچھ نہیں کہہ رہے۔ ابن عباس نے کہا: معاویہ تم جانتے ہو کہ میں اگر چاہوں تو بعض ساحلی علاقوں میں جا کر ڈیرا ڈال دوں، اور وہاں کے لوگوں کو تمہارے خلاف کھڑا کردوں۔ بولے نہیں نہیں ابن عباس تمہیں تمہارے وظائف دیئے جائیں گے۔ تمہیں راضی رکھا جائے گا۔

بلکہ پہلے سے زیادہ دیا جائے گا۔[1]"

ایک لمحۂ فکریہ

ذرا غور کیا جانا چاہیے کہ اس پورے بیان میں سوائے ان دو تین جملوں کے جن کا تبادلہ ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ اور امیر معاویہ کے درمیان ہوا اور یا پھر سوائے اس مختصر گفتگو کے جو حضرت ابن زبیرؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان انتخاب خلیفہ کے موضوع پر ہوئی کوئی اور بات ہے جس کا کوئی سنجیدہ آدمی یقین کر سکے؟ امیر معاویہؓ کے لیے تو ہر بُری اور گری بات ہم نے لائق یقین فرض کر رکھی ہے۔ اس لیے انکے مسلّمہ اخلاق، حلم، مدارات، رکھ رکھاؤ وغیرہ کے علی الرغم مان لیجئے کہ وہ مدینہ کے پاس حسین بن علیؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کے ساتھ ایسی ہی بدخلقی سے پیش آئے جیسی بدخلقی مذکورۂ بالا بیان میں دکھائی گئی ہے مگر کیا ایسی ہی آسانی سے یہ بھی ماننے کی چیز ہے کہ یہ معززین مدینہ امیر معاویہؓ کے ہاتھوں نہ صرف اس آخری درجے کی تذلیل و تحقیر کا نشانہ بننے پر بے چون و چرا راضی ہو گئے بلکہ ھل من مزید کہتے ہوئے پھر اُنہی کے پیچھے لگے رہے، اور بار بار ان کے ہاتھوں تذلیل ہی کے جام پی کر کہیں ان کی سیری ہوئی یعنی ناراض ہو کر یا شرمندہ ہو کر مکّے چلے جانے کا خیال ان کو آیا ـــــ لیکن یہ ناراضگی یا شرمندگی بھی پھر کچھ دیر پا ثابت نہ ہوئی جیسے ہی مکّے کے قریب پہنچ کر امیر معاویہؓ نے ان کو یاد فرمایا یہ پھر دوڑ کے مکّے سے باہر ہی ان کے استقبال کو پہنچ گئے اور پھر ان کی عنایتوں اور عطاؤں سے سرفراز ہونے کو یہ جانتے بوجھتے تیار ہو گئے کہ یہ سب بناوٹ اور یزید کے لیے خواہش بیعت کی تمہید ہے!

استغفر اللہ۔ یہ وہی ابن عمرؓ، ابن ابوبکرؓ، ابن علیؓ اور ابن زبیرؓ ہیں جن کی عظمتوں کے کلمے

---

[1] ابن اثیر ج ۳ ص ۲۵۲-۲۵۱

ہم پڑھتے ہیں ؛ یا جنسِ عظمت سے عاری ان کے ہم نام چند بونے اور بالشتئے ـــــ یا مسخرے ؟ معاویہ دشمنی کا یہ اندھا پن تو دیکھئے ۔!

اور ابھی بس کہاں ہے ؟ ہم نے تو اس قصّے میں یہ بھی پڑھا کہ یہ جن کے ناموں کی دھوم ہے کہ اُن کا مرنا اور جینا حق کے لیے تھا، انسانی، روحانی اور اخلاقی رفعتوں کے لیے تھا ؏

وہ ہم سے بھی زیادہ کُشتۂ تیغِ ستم نکلے

وہ حسین ابن علیؓ جنھوں نے اپنی اور اپنی اولاد کی اور اپنے اہل خاندان کی گردنیں کربلا میں کٹوا دیں۔ مگر عبیداللہ بن زیاد کے جبر کے آگے کسی قیمت پر جھکنا گوارا نہ کیا۔ وہ ابن زبیرؓ جو شیروں کی موت مرے ذلّت کی زندگی قبول نہیں کی، وہ ابن عمرؓ جنھیں حق بات کہنے سے کبھی کوئی روک نہ سکا اور ہر جابر ان کے رعبِ حق پرستی کے آگے جھکا۔ اور وہ ابن ابی بکرؓ جو حسب روایات ولی عہدئ یزید کی مخالفت میں ہمیشہ سب سے آگے، سب سے تیز اور صاف گو رہے۔ ان شیرانِ خدا کے بارے میں اس روباہی کا یقین ہمیں دلایا جا رہا ہے کہ امیر معاویہ نے جو دھمکی دی کہ "خبردار اگر زبان کھولی" تو ان سب کے پورے وجود پر وہ لرزہ اور سکتہ طاری ہوا کہ معاویہ خانۂ خدا میں مجمع کے سامنے ان کی موجودگی میں اِن کے بارے میں "یہ غلط بیانی" کرتے رہے کہ یہ چاروں یزید کی بیعت کر چکے ہیں، اور ان میں سے کسی کے لب کو جنبش نہیں ہو سکی!

کیسی ناقابلِ تصوّر باتیں ہیں! مگر ہمارے یہاں ٹکسالی سکّوں کی طرح چل رہی ہیں۔ ابن کثیر جیسا محتاط مؤرخ بھی معاویہ دشمنی کی اندھی وباء کے اس زہر سے نہیں بچ پایا اور تفصیل سے گریز کے باوجود اتنا بہرحال لکھدیا ـــ جیسا کہ گزر چکا ـــ کہ:

"معاویہ نے ان میں سے ہر ایک کو الگ بلا کے ڈرایا دھمکایا......... پھر ان کی موجودگی میں منبر پہ جا کے تقریر کی جس پر لوگوں نے یزید کی بیعت کر لی

اور یہ خاموش بیٹھے دیکھتے رہے کیونکہ انھیں ڈرایا دھمکایا جاچکا تھا۔ “

اسے اگر معاویہؓ دشمنی کا اندھاپن نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے کہ معاویہ کا چہرہ (معاذ اللہ) سیاہ کرنے کے جوش میں اس بات کا ہوش بھی کھویا گیا کہ اُن کے چمکدار چہروں پر بھی سیاہی پھری جارہی ہے جن کی خاطر معاویہ سے دشمنی ٹھہرائی ہے !

اور ذرا یہ بھی دیکھنے کی چیز ہے کہ یہ واقعہ کس جگہ کا بیان کیا جارہا ہے ؟ ابن اثیر کے بیان کے مطابق حرم مکیّ (مسجد حرام) کا اور ابن کثیر کے بیان کے مطابق حرم مدنی (مسجد نبوی) کا۔ کیا کسی ” معاویہ “ کی واقعی یہ جرأت تھی کہ ان دونوں حرموں میں سے کسی حرم کے اندر شمشیر بدست لوگوں کو ان حضرات کے سروں پر مسلّط کرتا کہ حکم عدولی پر گردن اڑادی جائے ۔ ؟

سچی بات یہ ہے کہ اگر واقعہ میں یہ سب کچھ ہوا تھا اور یہ حضرات خصوصاً حسین ابن علیؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ اس وقت جرأت دکھانے اور جان پر کھیلنے کے بجائے ڈر سہم کر بیٹھ گئے تھے تو پھر یزید کی خلافت کے قیام کی ذمّہ داری میں یہ شریک ہوئے اور تین چار سال اسی خاموشی میں گزار کر ۶۰ھ میں وفات معاویہ کے بعد جو کھڑے ہوئے تو بے جواز بھی کھڑے ہوئے اور بے وقت بھی ۔

علیٰ ہٰذا ، یہ اضطراب بیان کس بات کی چغلی کھارہا ہے ؟ ابن اثیر کہتے ہیں کہ واقعہ حرم مکیّ کے اندر پیش آیا۔ جبکہ ابن کثیر کا بیان ہے کہ حرم مدنی میں پیش آیا ؟ ایسی روایت پر کس حد تک اعتبار کیا جاسکتا ہے ؟

غرض کوئی ایک نہیں ، سبھی کلیں اس روایت کی ٹیڑھی ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ جیسے تاریخ اسلام اور مشاہیر اسلام کا مضحکہ اڑانے کے لیے یہ روایت بنائی گئی ہو۔[1]

---

[1] اس سلسلے میں روایت کا آخری جزو حضرت ابن عباسؓ کی دھمکی والا بھی دیکھ لیجئے اور پھر حضرت معاویہؓ کا جواب بھی ۔ کیا اسے مسخروں کی لڑائی کے سوا کچھ اور کہا جائے گا ؟ اور یہی وہ معاویہ (بقیہ صــــ پر)

مگر ہمارے مؤرخین نے اسے ایک "تاریخی امانت" کے طور پر محفوظ رکھنا ضروری سمجھا ۔۔ واللہ اعلم ان حضرات کے سامنے ۔۔ جو کہ علم دین کے بھی ماہرین میں سے ہوئے ہیں ۔ کیا چیز تھی جس نے حدیث نبویؐ "کفیٰ للمرأ کذباً ان یحدث بکل ما سمع" (آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ جو بات سنے (بلا تحقیق کئے) نقل کر دے۔ اور آیت قرآنی :۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنْ جَاءَکُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْا	اے ایمان والو جب کوئی فاسق کوئی خبر تم کو پہنچائے تو ذرا اس کی تحقیق کر لیا کرو۔

کو تاریخی واقعات کی روایتوں کے سلسلے میں قابلِ اطلاق نہیں سمجھا جبکہ حدیث کی روایات کے سلسلے میں ان ہدایات کا خیال ضروری مانا گیا ۔ ؟

واقعہ کی قرین قیاس صورت

اوپر کی بحث کا مقصد یہ نہیں ہے کہ سرے سے کسی ایسے واقعے کے وجود ہی کا انکار کر دیا جائے جس میں حضرت معاویہؓ نے رفع اختلاف کی خاطر حجاز کا کوئی سفر کیا ہو اور ان حضرات (حضرت حسینؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ وغیرہ) سے ملے ہوں جن کو یزید کی ولی عہدی قبول کرنے سے اِبا (انکار) تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ ہمارے خیال میں تو یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں ہوگا کہ ان ملاقاتوں میں کوئی تلخی ترشی ہی نہیں ہوئی ۔ لیکن اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اس طرح کے قصے ہرگز نہیں پیش آئے جو ابن اثیر کی تاریخ نے سنائے ہیں ۔ واقعہ کی تمام روایات و بیانات کو دیکھتے ہوئے اور مذکورہ بالا بحث میں اٹھائے گئے نکات و سوالات کو بھی سامنے رکھتے ہوئے روایات کے جو اجزاء قابلِ قبول نظر آتے

(حاشیہ صـــ کا بقیہ) ہیں جو حجاز میں جا کر حجازیوں پر شیر ہو گئے اور اپنے پایۂ تخت دمشق میں بالکل بھیڑ! انا للہ ثم انا للہ۔

ہیں ان کی روشنی میں سارے قصّے کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی کہ حضرت امیر معاویہؓ، جیساکہ ابن کثیر کا بیان ہے، عمرے کی نیت کر کے شام سے حجاز کے لیے نکلے اور عمرے سے فراغت پاکر مدینۂ منورہ میں قیام کیا۔ یہاں انھوں نے مدینے کے ان حضرات سے بات کر کے جو یزید کی ولی عہدی کے مخالف تھے اس اُلجھن کو دور کرنا چاہا جو ان کی مخالفت کی وجہ سے اس معاملے میں پڑ رہی تھی۔ یہ لوگ تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت حسین بن علیؓ ان حضرات سے حضرت معاویہؓ کی گفتگو کی روداد کے سلسلے میں طبری کی روایت زیادہ قرین قیاس تھی جو صـــ ۔ پر گزر چکی ہے۔ کیونکہ :-

(الف) یہ چاروں افراد میں سے ہر فرد کے ساتھ علیٰحدہ گفتگو دکھاتی ہے۔ اور حضرت معاویہؓ جیسے مدبّر اور سیاست داں سے ایسے حالات میں کہ ایک مخالفت کا محاذ انھیں توڑنا ہے۔ یہی بات قرین قیاس ہے کہ وہ ہر فرد سے الگ اور تنہا گفتگو کریں۔

(ب) یہ ان چار افراد کو تین خانوں میں بانٹتی ہے۔ حضرت حسینؓ اور حضرت ابن زبیرؓ کا ایک خانہ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا اپنا الگ خانہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کا ایک تیسرا خانہ۔ اور یہ بالکل واقعی تقسیم ہے۔ یہ چاروں حضرات اسی طرح کی تقسیم کے مستحق تھے۔ اور حضرت معاویہؓ جیسے صاحبِ نظر اور صاحبِ بصیرت آدمی سے یہی توقع کی جانی چاہیے کہ وہ ان حضرات کی اسی طرح زمرہ بندی کریں۔ اور ہر ایک سے اس کے زمرے کے مطابق گفتگو کریں۔ چنانچہ حضرت حسینؓ اور حضرت ابن زبیرؓ سے انھوں نے بالکل ایک بات کی اور دونوں نے ایک ہی جواب بھی دیا۔ اور یہی دونوں حضرات تھے جنھوں نے حضرت معاویہؓ کے بعد یزید کی خلافت اور طاقت کو چیلنج کرنے کی یکساں روش اختیار کی۔ یہ گفتگو دونوں طرف سے بالکل سیاسی انداز کی اور نہایت ناپ تول والی نظر آتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی پوری زندگی کی روشنی میں یہ اطمینان کیا جاسکتا تھا

کہ وہ خود اپنے لیے خلافت کے دعویدار نہیں ہو سکتے۔ ان معاملات میں ان کی سب سے بڑی دلچسپی امت کا اتحاد ہے۔ وہ بالآخر یزید پر راضی ہو جائیں گے، چنانچہ ان کی گفتگو بھی یہی تأثر دیتی ہے اور حضرت معاویہؓ کی طرف سے بات میں بھی ایک کھلا پن اور اعتماد کی کیفیت نظر آتی ہے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ (اگر ۵۶ھ میں زندہ تھے تو) خلافت کے دعویدار نہ ہونے میں تو بظاہر حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہی کے زمرے کے آدمی تھے مگر یزید کی مخالفت میں سب سے زیادہ متشدد پائے جاتے تھے اور اسلامی نظام خلافت میں باپ کی طرف سے بیٹے کی نامزدگی کی بظاہر کوئی گنجائش نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے ساتھ حضرت معاویہؓ کی گفتگو دیکھی جائے تو دونوں ایک دوسرے کے لیے ناقابل برداشت نظر آتے ہیں۔ نہ سمجھنے کی کوئی امید پائی جاتی ہے، نہ سیاسی مکالمے کی کوئی گنجائش! یہ بات کتنی ہی ناخوشگوار ہو لیکن طرفین کی پوزیشن کے پیش نظر سمجھ میں آنے والی ہے۔ طرفین دو انتہاؤں پر تھے۔

طبری کی روایت کے یہ دو پہلو (الف اور ب) ایسے ہیں جو ہمیں آمادہ کرتے ہیں کہ اس رودادِ گفتگو کو بطور واقعہ تسلیم کر لیں[1]۔ مگر روایت کی دو یا تین کمزوریوں کی وجہ سے ہم اس پر زور نہیں دے سکتے۔

ا۔ روایت کا بنیادی راوی قطعی نامعلوم شخصیت ہے "رجل بنخلة" (نخلہ کا ایک آدمی) اور پیچھے جہاں روایت گزری وہاں ہم بتا چکے ہیں کہ نخلہ بھی کوئی ایک متعین جگہ نہیں ہے۔ اس نام کی دو بستیوں کا ذکر معجم البلدان میں ہے لیکن دونوں میں سے ایک کا تعین بھی ہو جائے تب بھی مجہولیت تو برقرار ہی رہے گی۔

---

[1] جبکہ ابن اثیر کی روایت میں جو گفتگو بیان کی گئی ہے اس میں مخالفین کی طرف سے حضرت ابن زبیرؓ کی گفتگو تو قرین قیاس ہو سکتی ہے مگر حضرت معاویہؓ کی طرف سے منسوب باتیں بالکل بچکانہ اور خلاف قیاس ہیں۔ اتنے سخت مخالفین سے ایسی بچکانہ بہلاوے کی باتیں حضرت معاویہؓ کے متعلق نہیں سوچی جا سکتیں۔

۲۔ یہ روایت مخالفین میں پانچ آدمیوں کا شمار کرتی ہے۔ اور پانچواں نام حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا دیتی ہے مگر جیسا کہ اوپر ایک جگہ بحث آچکی ہے، اس نام کا شمار قطعاً غلط ہے اور اس کی ایک دلیل ـــ یا قرینہ ـــ خود روایت ہی میں موجود ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کے ساتھ کوئی گفتگو روایت میں نہیں دکھائی گئی۔

۳۔ اس میں گفتگو کی جگہ کا نام تو نہیں لیا گیا کہ مکہ تھا یا مدینہ، مگر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی زبان سے یہ الفاظ کہلوائے گئے ہیں کہ "یا امیرالمؤمنین نحن فی حرم اللہ عزّوجل" (امیرالمومنین ہم اس وقت حرم الٰہی میں ہیں) جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بات چیت مکہ مکرمہ میں ہو رہی تھی جب کہ جن لوگوں نے حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کو اس گفتگو کے وقت تک زندہ بتایا ہے انھوں نے یہ بھی کہا ہے ـــ جیسا کہ پیچھے اس سلسلے کی بحث میں گزر چکا ہے ـــ کہ وہ حضرت معاویہؓ کے اس سفر ہی کے دوران میں یزید کے لیے ان کی مہم سے ناراض ہو کر مکے چلے گئے تھے اور اس سفر ہی میں مکہ سے آٹھ دس میل دور رات کو سوتے میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ تب اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ کا اگر ۵۳ھ میں انتقال نہیں ہو چکا تھا (جو کہ عام طور پر ان کا سنہ وفات مانا گیا ہے) اور وہ ۵۶ھ میں حضرت معاویہؓ کے اس سفر کے وقت بقید حیات تھے تو لازماً حضرت معاویہؓ سے ان کی ملاقات کی جگہ مدینہ ہے نہ کہ مکہ۔

ان تین موٹی موٹی باتوں کی وجہ سے طبری کی روایت کے متعلق ہم یہ اطمینان تو نہیں کر سکتے کہ فی الواقع یہی گفتگو ان حضرات کے درمیان پیش آئی ہو گی۔ مگر اس کے حق میں جانے والے قرائن کو دیکھتے ہوئے اور ابن اثیر وغیرہ کے بیانات کے سلسلے میں یہ دیکھتے ہوئے کہ ایک طرف تو وہ قطعاً ناقابل تصور ہیں جیسا کہ تفصیلی بحث کر کے دیکھا جا چکا۔ اور دوسری طرف سرے سے کوئی سند ہی اپنے ساتھ نہیں رکھتے۔ ہمیں رودادِ گفتگو کی حد تک طبری کا بیان بہرحال قابلِ ترجیح اور واقعیت سے قریب تر

معلوم ہوتا ہے۔

اور اس گفتگو کے بعد جس میں کوئی خاص امید افزا بات نہیں تھی ظاہر ہے کہ حضرت معاویہؓ کو اس نتیجہ پر پہنچ جانا تھا کہ یہ لوگ فی الحال بیعت کرنے والے نہیں ہیں۔ جبکہ اور سب جگہ بیعت ہو چکی ہے۔ تو اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ بیعت اور ولی عہدی توڑی جائے گی کہ رکھی جائے گی؟ اسے مضبوط اور مکمل کیا جائے گا یا ایک غیر منفصل اور غیر یقینی حالت میں رکھا جائیگا؟

حضرت معاویہؓ جیسے ایک مضبوط ارادے کے شخص سے، ایک انتہائی ذمہ دار حیثیت کے شخص سے یہ توقع غالباً نہیں کی جا سکتی کہ وہ ایک ایسے علاقے کے تین، چار افراد کے اختلاف کی بنا پر جس کا سیاسی وزن حضرت علیؓ کے مدینے کو چھوڑ کر کوفہ کو دارالخلافہ بنا لینے کے بعد سے ختم ہو گیا تھا۔ اپنی اب تک کی ساری کارروائی لپیٹ کر رکھ دیں گے اور اپنے بارے میں ایک کمزور اور کوتاہ بیں حکمراں ہونے کا تاثر دیں گے، جبکہ وہ اپنی کارروائی کو ملّت کی ایک ناگزیر ضرورت کی نظر سے بھی دیکھ رہے تھے۔ جیسا کہ آگے آئیگا۔

ہمارے نزدیک قرین قیاس ہے کہ انھوں نے ان حضرات کو (ان کی ذاتی حیثیتوں کے باوجود) نظر انداز کر کے دیگر اہل مدینہ کو خطاب کرنے اور اعتماد میں لینے کا فیصلہ کیا ہو۔ اور یہی وہ خطاب رہا ہوگا جس کا ذکر ابن اثیر کی روایت میں گزرا۔ جس کا خلاصہ ان کے بیان کے مطابق یہ تھا:-

وخطب معاوية بالمدينة	اور معاویہؓ نے مدینے میں خطاب کیا
فذكر يزيد ومدحه	جس میں یزید کا ذکر کر کے اس کی
وقال من احق منه بالخلافة	خوبیاں بیان کیں اور باعتبار عقل
في فضله وعقله وموضعه	فضل اور حیثیت اسے خلافت کے
وما اظن قومًا بمنتهين حتى	لیے موزوں تر بتاتے ہوئے کہا کہ

تصیبھم بوائق تجث اصولھم   جو لوگ مخالفت کر رہے ہیں میں
وقد انذرت ان اغنت   سمجھتا ہوں کہ وہ اپنے آپ کو تباہ
النذر[۱]   کیے بغیر باز آنے والے نہیں ہیں۔

ابن اثیر کے اس بیان کی بھی ایسی کوئی سند نہیں ہے کہ اس کو رد کرنا مشکل ہو۔ بلکہ سرے سے سند ہے ہی نہیں۔ لیکن اس وقت کے جو حالات ہمارے سامنے آرہے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے یہ بات کچھ بعید نظر نہیں آتی کہ حضرت معاویہؓ اِن حضرات کے اختلاف سے تنگ آرہے ہوں اور اپنی ذمہ داری کا تقاضہ سمجھ رہے ہوں کہ سختی کا انداز اختیار کر کے اس اختلاف کو دبایا جائے چنانچہ انھوں نے اپنے اس خطاب میں اس طرح کے جملے بھی کہے ہوں، جن کی ترجمانی ابن اثیر نے مذکورہ بالا الفاظ سے کی ہے۔ مگر سختی کا وہ انداز کہ ان لوگوں کو جلسے میں شریک کر کے زبان بند رکھنے کا حکم دیا جائے اور شمشیر بکف سپاہی ان کے سر پر مسلط کیے جائیں تاکہ خوف کا عالم ان پر طاری رہے۔ یہ قطعی ناقابلِ یقین بات ہے۔ نہ حضرت معاویہؓ کے بیس سالہ دور میں اس جبر و ستم کی ــــ اور خاص طور سے اِن مؤقر حضرات کے ساتھ ــــ کوئی مثال ملتی ہے نہ اہلِ مدینہ سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ جبر کا یہ مظاہرہ دیکھتے ہوئے خاموش رہ جاتے۔ اور نہ ہی اِن بزرگوں کے متعلق تصوّر کیا جا سکتا ہے کہ وہ اتنے بزدل اور پست ہمّت تھے کہ مالک بن انسؒ، احمد بن حنبلؒ اور ابو حنیفہؒ کی مثال بھی پیش کرنے کے اہل نہ ہوئے اور مزید برآں یہ جبر بالکل بیکار تھا۔ اگر ان حضرات کو اس کے بعد پابند نہ کیا جاتا ــــــــــــــــ ــــــــــــ کہ اب یہ اپنا اختلاف کسی پر ظاہر نہ کریں گے۔ مگر اس جبر کے قصّے ہی میں ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جیسے ہی معاویہؓ جلسہ ختم کر کے رخصت ہوئے

[۱] ابن اثیر ج ۳ ص۲۵۱۔

ویسے ہی ان حضرات نے اس بات کی اظہار بھی کر دیا کہ ان کے متعلق جھوٹ بولا گیا ورنہ انھوں نے نہ بیعت کی ہے نہ وہ اس سے راضی ہیں۔

فیصلہ کن بات

واقعہ یہ ہے کہ اس جبر و دباؤ والے قصے کی روایتیں اتنی مختلف قسم کی ہیں کہ اول تو ان کا اختلاف ہی ان کو ناقابل توجہ بنا دینے کے لیے کافی ہے۔ اور وہ کافی نہ ہو تو جبر و دباؤ کے قصے پر جو اشکالات وارد ہوتے اور سوالات اٹھتے ہیں اُن کی تاب یہ قصہ کسی طرح نہیں لاسکتا۔ اور اس سب پر مزید آخری درجے کی اور نہایت واضح فیصلہ کن بات یہ ہے کہ یہ سب ہی مختلف روایتیں یہ بھی بتاتی ہیں کہ جبر کا عمل کر کے بیعت حاصل کرنے کے بعد معاویہ فوراً ہی دمشق کے لیے روانہ ہو گئے اور ان مجبور حضرات کی زبانی سب اہل مدینہ کے سامنے اس جبر کا راز کھل گیا جس میں (ان حضرات پر جبر کے ساتھ) باقی اہل مدینہ سے جھوٹ اور غلط بیانی بھی شامل تھی۔ سوال یہ ہے کہ:-

کیا کوئی عقل باور کرسکتی ہے کہ اہل مدینہ سے جو بیعت ان کی لاعلمی میں ایسے جبر اور جھوٹ کے بل پر لی گئی اس کے خلاف ان کے اندر کوئی ردِ عمل اس وقت نہیں ہوا ہو گا جب انھیں (فوراً ہی) پتہ ہوا ہو گا کہ ان کے امیر المومنین معاویہ ان کے ساتھ کیسا فریب (معاذ اللہ) کر کے گئے ہیں؟ کیا کوئی امکان سوچا جاسکتا ہے کہ ایسی بیعت جوں کی توں قائم رہ جائے ___ ایک آدمی بھی نہ نکلے جو اپنی گردن سے اس دھوکے کی بیعت کو نکال کر پھینکتا ہوا بتایا جائے؟

سب روایتیں بتاتی ہیں کہ جبر کا ماحول فوراً ہی ختم ہو گیا تھا۔ معاویہ اپنے "مسلح سواروں" کو ساتھ لے کر واپس جا چکے تھے۔ لیکن ایک روایت بھی یہ نہیں بتاتی

کہ ادنیٰ شورش اور ادنیٰ ردعمل بھی مدینے کی آبادی میں اس "جبر و فریب" کے خلاف ہوا ہو۔ تب کیا یہ جبر اور جھوٹ کے قصے سوائے جھوٹ کے اور کچھ ہو سکتے ہیں اور ان پر کان دھرنا چاہیے ؟ مگر افسوس یہ خرافاتی باتیں آج کے تحقیق پسند دور میں بھی ٹکسالی سکوں کی طرح چل رہی ہیں۔ کیونکہ ہم ان باتوں کے دہرانے یا سننے کے پشتہا پشت سے عادی ہو گئے۔ اور جس چیز کے ہم قدیم سے عادی چلے آرہے ہوں وہ ایک تو عادت کی وجہ سے نہیں چھوٹتی۔ دوسرے اس کی قدامت جیسے ایک طرح کا تقدس اور ایک وزن اسے بخش دیتی ہے۔ اے اللہ تو ہی مدد فرما۔

باب ششم ۶

یزید کی ولیعہدی پر حضرت معاویہ کو اصرار کیوں؟
اور
دیگر حضرات کو اس سے اختلاف کیوں؟

اصرار اور اس کی بنیاد

ہمارے سامنے ایسی کوئی چیز نہیں ہے جس کی بنیاد پر قطعی انداز میں کہا جا سکے کہ امیر معاویہ کو کیوں اصرار تھا کہ اپنے بعد کے لیے اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنا جائیں ابن کثیر نے لکھا ہے کہ :-

وذالك من شدة محبة الوالد لولده ولما كان يتوسم فيه من النجابة الدنيوية وسيما اولاد الملوك ومعرفتهم بالحروب وترتيب الملك والقيام بأبهته وكان يظن	اور یہ بات اس شدید محبت کی وجہ سے تھی جو ایک باپ کو بیٹے سے ہوتی ہے۔ نیز اس کی دنیوی شرافت و اصالت کی بنا پر اور خاص کر وہ جو بادشاہوں کی اولاد میں فنون جنگ اور نظم مملکت سے واقفیت

ان لا یقوم احدٌ من ابناء الصحابۃ	اور شاہانہ کروفر کی اہلیت ہوتی ہے۔
فی ھٰذا المعنی ولھٰذا	نیز معاویہ سمجھتے تھے کہ اس معنیٰ میں
قال لعبد اللہ بن عمر	صحابہ کی اولاد میں کوئی دوسرا نہیں
فیما خاطبہٗ بہٖ انی خفت	ہے جو کاروبار مملکت سنبھال سکے۔
ان اذر الرعیۃ من بعدی	....چنانچہ عبداللہ بن عمر سے انہوں
کالغنم المطیرۃ لیس	نے کہا تھا کہ میں ڈرا اگر یزید کو نہ بناؤں
لھا راعٍ[1]	تو ڈرتا ہوں کہ رعیت کو اپنے بعد ایسے
	چھوڑ جاؤں گا جیسے بارش میں بکریاں
	کہ جن کا کوئی چرواہا نہ ہو۔

اسی ذیل میں ابن کثیر نے امیر معاویہؓ کی وہ گفتگو بھی نقل کی ہے جو انہوں نے حضرت عثمانؓ کے بیٹے سعید بن عثمانؓ سے اس معاملہ میں کی تھی۔ ابن کثیر نے تو لکھا ہے کہ سعید نے یزید کے مقابلے میں اپنا استحقاق جتایا تھا اس پر امیر معاویہ نے وہ بات کہی تھی، مگر طبری اور ابن اثیر کے مطابق اصل بات یہ تھی کہ اس زمانے میں جب کہ یزید کی ولی عہدی کا قصہ چھڑا ہوا تھا، سعید آئے اور خواہش کی کہ انھیں خراسان کی ولایت دیدی جائے، امیر معاویہؓ نے معذرت کی کہ وہ علاقہ تو ابن زیاد کی تحویل میں ہے۔ اس پر سعید بگڑ گئے اور کہا کہ تم جو کچھ ہوئے میرے باپ کی وجہ سے ہوئے اور آج تم مجھے اس طرح کا جواب دیکر ٹال رہے ہو، جبکہ اپنے بیٹے کے لیے تم خلافت کا بندوبست کر رہے ہو۔ حالانکہ میں کیا اپنی ذات سے اور کیا اپنے ماں باپ سے، ہر لحاظ سے یزید پر فائق ہوں، اس پر امیر معاویہؓ کا جو جواب نقل کیا گیا ہے وہ ابن کثیر نے اپنے مذکورہ بالا بیان ہی کے ذیل میں نقل کیا ہے کہ امیر معاویہؓ نے جواب میں کہا کہ :-

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ صـ۸۶ـ۔

بے شک تمہارے والد کے احسانات ناقابلِ انکار ہیں اور تمہارے باپ بیشک
یزید کے باپ سے بڑھ کر بھی تھے، تمہاری ماں بھی یزید کی ماں سے اس بنا پر
فائق کہ وہ قریشی تھیں اور یزید کی ماں بنی کلب کی۔ لیکن تم جو اپنے بارے
میں کہتے ہو تو سنو کہ تمہارے جیسے اگر اتنے بھی ہوں کہ غوطۂ دمشق بھر جائے
تب بھی یزید مجھے تم سب سے محبوب تر ہوگا۔"[1]

گویا ابن کثیر کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اگرچہ امیر معاویہؓ کے اس فیصلے میں محبت پدری کا بھی دخل تھا مگر تنہا یہ بات نہیں تھی، بلکہ وہ یزید کو کاروبار مملکت کے لیے اہل تر بھی جانتے تھے۔ اسی سیاق میں وہ مزید لکھتے ہیں کہ:-

وروینا عن معاویۃ انہٗ قال یومًا فی خطبتہ: اللّٰھم ان کنت تعلم انّی ولّیتہٗ لانّہ فیما اراہ اھلٌ لذالك فاتمم لہٗ ما ولّیتہٗ وان کنت ولّیتہٗ لانّی احبّہٗ فلا تتمم لہٗ ما ولّیتہٗ۔[2]

ہم معاویہ کے سلسلے میں نقل کر چکے ہیں کہ انہوں نے ایک دن اپنے خطبے میں کہا تھا کہ اے اللہ اگر تو جانتا ہے کہ میں نے اس کو (یزید کو) اس کی اہلیت کی بنا پر ولی عہد بنایا ہے تو اس ولایت کو تو تکمیل تک پہنچا دے اور اگر میرا یہ کام اس لیے ہے کہ مجھے اس سے محبت ہے، تو پھر اسے تو پورا نہ ہونے دے۔

اس دعا کے پیش نظر جو منبر پر اور مجمع میں کی گئی بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس کے بعد اس بدگمانی کی گنجائش نہیں رہتی کہ یزید کی ولی عہدی بر بنائے محبت تھی نہ کہ بر بنائے اہلیت[3]۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس دعا کے ثبوت میں اگر کوئی کلام نہ ہو تو پھر بدگمانی واقعی بڑے دل گردے کا کام ہے۔

---

[1] البدایہ والنہایہ ص۸۸۔ [2] ایضاً۔ [3] حضرت معاویہ اور تاریخی حقائق۔ از مولانا تقی عثمانی۔

الغرض ابن کثیر کے مذکورہ بالا بیان کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ حضرت امیر معاویہ کو یزید کی ولی عہدی پر اصرار اس لیے نہیں تھا کہ وہ ان کا بیٹا ہے بلکہ بنائے اصرار یہ تھی کہ وہ اسے کارِ خلافت کے لیے موزوں ترجان رہے تھے۔ گزشتہ باب (ص۵) میں بھی دو موقعوں پر ہم دیکھ آئے ہیں کہ حضرت معاویہؓ نے ایک تو وفود کی طلبی میں، دوسرے اہلِ مدینہ سے خطاب میں صاف طور پر یزید کی اہلیت اور افضلیت کا حوالہ دیا ہے جس کو بالکل نظر انداز کرنا تو بہر حال مناسب نہیں ہوگا۔

ابن خلدون کا کلام

ابن خلدون نے اپنے شہرۂ آفاق "مقدمہ" میں اس مسئلۂ ولیعہدی پر بہت شرح و بسط سے کلام کیا ہے۔ آئیے دیکھیں اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"امامت اور خلافت کے معنی اصل میں امت کی دینی و دنیاوی مصالح کی نگرانی اور حفاظت کے ہیں۔ پس امام لوگوں کی مصالح کا امین اور ان کی بہبود کا ذمہ دار ہے۔ اور جب وہ اپنی زندگی میں اس کا ذمہ دار ہے اور اسے مسلمانوں کی فلاح و بہبود عزیز ہے تو قدرتی طور پر اس کی خواہش بھی ہونی چاہیے اور اس کا اخلاقی فریضہ بھی ہے کہ اپنی موت کے بعد کے لیے بھی ان کی بھلائی کی فکر کرے اور کسی ایسے آدمی کو قائم مقام کر جائے جو اسی کی طرح ان کے معاملات کی دیکھ بھال کرنے والا ہو اور لوگ اس سے اسی طرح مطمئن رہیں جیسے اس کے پیشرو سے مطمئن تھے (اسی کا نام ولایتِ عہد ہے) اور یہ شرعاً بالکل جائز ہے کیونکہ اسکے جواز پر اور اس طرح امامت کے انعقاد پر امت کا اجماع ہو چکا ہے۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے صحابہؓ کی موجودگی میں عمرؓ کو اسی طرح قائم مقام بنا دیا تھا، جس کو صحابہؓ نے جائز ٹھہرایا اور عمرؓ کی اطاعت اپنے اوپر لازم کر لی۔ بعد ازاں جب

حضرت عمرؓ کی وفات کا وقت آیا تو آپؓ نے اپنا بار عشرۂ مبشرہ میں کے باقی ماندہ چھ اصحاب کو سونپ دیا کہ وہ مشورہ کر کے خلافت کسی ایک کے سپرد کر دیں پھر ان میں سے بعض بعض پر فیصلہ چھوڑتے چلے گئے یہاں تک کہ عبد الرحمٰن بن عوفؓ کو اختیار کلی دیدیا گیا پس انھوں نے بہتر سے بہتر کوشش کی اور عام مسلمانوں کے خیالات کا جائزہ لیا تو عثمانؓ اور علیؓ پر سب کو متفق پایا۔ اب ان دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا تو انھوں نے عثمانؓ کی بیعت کو ترجیح دی کیونکہ وہ نہایت سختی کے ساتھ شیخینؓ (ابوبکرؓ و عمرؓ) کی اقتدا پسند کرتے تھے اور اس باب میں عبد الرحمٰنؓ کے ہم خیال تھے کہ ہر ایک موقع پر اپنی رائے کے بجائے شیخینؓ کی اقتدا کرنی چاہیے۔ چنانچہ عثمانؓ کی خلافت منعقد ہو گئی۔ اور سب نے ان کی اطاعت اپنے اوپر لازم کر لی ـــــ ان دونوں موقعوں پر صحابۂ کرامؓ کی کافی تعداد موجود تھی مگر کسی ایک نے بھی اس بات پر انکار و اعتراض نہیں کیا۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ تمام صحابۂ کرام ولی عہدی کے جواز پر متفق تھے، اور اجماع جیسا کہ معلوم ہے حجّت شرعی ہے پس امام اس معاملہ میں متہم نہیں ہو سکتا اگرچہ وہ یہ کاروائی اپنے باپ یا بیٹے ہی کے حق میں کیوں نہ کرے۔ اس لیے کہ جب اس کی خیر اندیشی پر اس کی زندگی میں اعتماد ہے تو موت کے بعد تو بدرجۂ اولیٰ اسپر کوئی الزام نہیں آنا چاہیے (کیونکہ جو زندگی بھر اپنے آپ کو خیر خواہ ثابت کرے گا مرتے وقت وہ بدخواہی کا الزام اپنے سر لے کر جانا کبھی گوارا نہ کرے گا) بعض لوگوں کی رائے ہے کہ باپ اور بیٹے کو ولی عہد بنانے میں امام کی نیت پر شبہ کیا جا سکتا ہے اور بعض صرف بیٹے کے حق میں یہ رائے رکھتے ہیں۔ مگر ہمیں ان دونوں سے اختلاف ہے۔ ہماری رائے میں کسی صورت میں بھی بدگمانی کی کوئی وجہ نہیں ہے اور خاص کر ایسے مواقع پر کہ جہاں ضرورت

اسی کی داعی ہو مثلاً کسی مصلحت کا تحفظ یا کسی مفسدہ کا ازالہ اس میں مضمر ہو، تب تو کسی طرح کے سوءِ ظن کی کوئی وجہ ہی نہیں! جیسے کہ معاویہؓ کا اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنانے کا واقعہ ہے، تو اوّلاً تو **معاویہؓ کا لوگوں کے عمومی اتفاق کے ساتھ ایسا کرنا اس باب میں بجائے خود ایک حجت ہے** اور پھر انھیں متہم یوں بھی نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے پیش نظر بجز اس کے کچھ نہیں تھا کہ امت میں اتفاق واتحاد قائم رہے۔ اور اس کے لیے ضروری تھا کہ اہل حل وعقد میں اتفاق ہو۔ اور اہل حل وعقد صرف یزید ہی کو ولی عہد بنانے میں متفق ہو سکتے تھے کیونکہ وہ عموماً بنی امیہ میں سے تھے اور بنی امیہ اس وقت اپنے میں سے یا ہر کسی کی خلافت پر راضی نہیں ہو سکتے تھے، (اور ان کی نارضامندی سخت افتراق واختلاف کا باعث ہوتی۔) کیونکہ وہ قریش بلکہ پوری ملت کا سب سے بڑا بااثر اور طاقتور گروہ ان نزاکتوں کے پیش نظر معاویہؓ نے یزید کو ولی عہدی کے لیے ان حضرات پر ترجیح دی جو اس کے زیادہ مستحق سمجھے جاتے تھے اور افضل کو چھوڑ کر مفضول کو اختیار کیا تاکہ مسلمانوں میں جمعیت اور اتفاق باقی رہے جس کی شارع کے نزدیک بیحد اہمیت ہے[1]

مزید لکھتے ہیں کہ :-

خلفائے اربعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے دور میں اور معاویہؓ کے دور میں ایک بہت بڑا فرق ہو گیا تھا اور وہ یہ تھا کہ خلفائے اربعہ کے دور میں (بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ شیخین کے دور میں) مسلمانوں کی طبیعتوں پر دین کی گرفت بہت سخت تھی، ان کی پسند ونا پسند اور رضا وعدم رضا کا معیار صرف دین تھا اور ان کا

---

[1] مقدمہ ابن خلدون، ولی عہدی کا بیان ص ۱۷۶-۱۷۵ مطبوعہ مصر۔

دینی ضمیر اُنھیں ہر اُس بات سے باز رکھنے کے لیے کافی تھا جو دینی نقطۂ نظر سے نامناسب تھی اور ہر اُس بات پر آمادہ کر دیتا تھا جس میں دینی بھلائی ہوتی۔ پس ان حضرات میں سے جس نے اپنے بعد کے لیے خلیفہ کے طور پر کسی کو منتخب کیا تو ایسے کو منتخب کیا جو دینی نقطۂ نظر سے منتخب ہونا چاہیئے تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی وجہ ترجیح ان کے یہاں نہیں تھی، بس یہی کچھ دیکھ کر وہ اپنا بارِ امانت کسی کو سونپ دیتے اور پھر اس شخص کو اس کے دینی ضمیر کے سپرد کر دیتے (جو اس وقت بہت ہی حساس اور قابل اعتماد تھا) لیکن ان کے بعد حالت یہ نہ رہی بلکہ معاویہ کا دور جب سے شروع ہوا تو دو تغیر جو تدریجی طور پر آرہے تھے اس وقت اچھی طرح ظاہر ہو گئے تھے۔ ایک تو وہ عصبیت جو دین کے تقاضوں میں دب گئی تھی بلکہ دینی عصبیت میں تبدیل ہو گئی تھی، اس دباؤ سے نکل کر اپنی طبعی انتہا یعنی ملوکیت پر پہنچ گئی تھی اور دوسرے دینی ضمیر کی روک ٹوک کمزور پڑ گئی لہٰذا اب (امت کی شیرازہ بندی اور جماعت و اطاعت کی بقا کے لیے) شخصی حکومت اور عصبیت کا سہارا لینا ضروری ہو گیا (یعنی یہ کہ سارا اقتدار ایک ایسے فرد واحد کے ہاتھ میں دیدیا جائے جس کو وقت کی سب سے بڑی عصبی طاقت کی پشت پناہی حاصل ہو) پس اگر معاویہ کسی ایسے شخص کو اپنا جانشین بنا جاتے جس کو (بنوامیہ کی) عصبیت نہ چاہتی ہوتی (خواہ دین اسے کتنا ہی پسند کرتا) تو ان کی یہ کاروائی یقیناً الٹ دی جاتی، نظم خلافت درہم برہم ہو جاتا اور امت کا شیرازہ بکھر جاتا........تم نہیں دیکھتے کہ مامون رشید (عباسی خلیفہ) نے زمانے کی تبدیلی کا یہ حکم نظر انداز کر کے علی بن موسیٰ بن جعفر الصادقؓ کو اپنا ولی عہد نامزد کر دیا تھا تو کیا نتیجہ ہوا۔ عباسی خاندان نے پورے معنی میں بغاوت کر دی نظام خلافت درہم برہم ہونے لگا اور مامون کو خراسان سے بغداد پہنچ کر معاملات کو قابو میں کرنا پڑا۔"[1]

---

[1] ایضاً ص۱۷۶

اس کلام پر ایک تنقیدی نظر

ابن خلدون کے کلام سے معلوم ہوا کہ ان کی نظر میں معاملہ کی نوعیت یہ تھی کہ ملت کے جس دور میں یزید کے لیے ولی عہدی کا فیصلہ کیا جا رہا تھا اس دور میں ملت کے اتحاد اور اس کی اجتماعیت کے بقا کے نقطۂ نظر سے اس کے سوا کوئی دوسرا فیصلہ ممکن نہیں تھا کیونکہ اس دور میں دینی ضمیر اصل اجتماعی طاقت نہیں رہا تھا بلکہ قبائلی عصبیت نے پھر سے اصل اجتماعی طاقت کا مقام حاصل کر لیا تھا اور حالات کے اس نقشے میں بنی امیہ کی عصبیت سب سے بڑی عصبی طاقت تھی اور یزید بنی امیہ کا وہ فرد جس کے بارے میں سب سے زیادہ اعتماد کیا جا سکتا تھا کہ یہ عصبی طاقت اس کی اطاعت گزار ہو کر ادارۂ خلافت کی پشتی بان ثابت ہوگی۔

اجتماع و عمران کے معاملے میں ابن خلدون کے تجزیوں اور فیصلوں کو جو اہمیت حاصل ہے اس سے انکار کسی کے لیے ممکن نہیں۔ اس لیے ان کا یہ تجزیہ کسی خوش عقیدگی کی بنا پر نہیں بلکہ سنجیدگی کی بنا پر لائق اعتناء ہونا چاہیے کہ یزید کی ولی عہدی کے پیچھے کوئی اور چیز نہیں بلکہ صرف اس اجتماعی مصلحت کا شعور کام کر رہا تھا کہ اس کے انتخاب کے ذریعہ خلافت کا ادارہ ٹوٹ پھوٹ سے بچ جائے گا۔ اور اس تجزیے کی روشنی میں ہمیں پورے اطمینان کے ساتھ یہ سمجھنے کی گنجائش ہے کہ حضرت معاویہؓ کو جو اپنی تجویز پر اصرار تھا اس کی اصل وجہ ملت کی مصلحت ہی تھی ——— لیکن یہ سمجھنا کہ یہ مصلحت اندیشی بالکل بجا بھی تھی، اور اس میں کوئی کلام نہیں کیا جا سکتا تھا، جیسا کہ بظاہر ابن خلدون کا نقطۂ نظر ہے، سو یہ صرف اس وقت ممکن ہے جبکہ ہم ابن خلدون کا یہ بیان بھی تسلیم کر لیں کہ یزید کی ولی عہدی سے اختلاف کرنے والی صرف ایک شخصیت عبداللہ بن زبیر کی تھی[1]۔

---

[1] مقدمہ ابن خلدون، بیان ولایت عہد ص ۱۷۶

بے شک اگر واقعہ میں ایک عبداللہ بن زبیرؓ کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر شخصیت نہ تھی جس کو یزید کی ولی عہدی کے مسئلے سے اختلاف ہو رہا ہو تو پھر ابن خلدون کی اس رائے سے اتفاق ہی کرنا پڑے گا کہ "ایک آدھ آدمی" کے اختلاف سے بھلا کہاں بچا جا سکتا ہے اور کیونکر اسے کوئی بڑی اہمیت دی جا سکتی ہے[1]۔ مگر ابن خلدون کا یہ بیان تو بالکل ایک نادر بیان ہے۔ چار اہم شخصیتیں (عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ اور حسین بن علی رضی اللہ عنہم) تو ہر تاریخی بیان کے مطابق اس سلسلے میں مخالفت کرنے والی رہی ہیں۔ حتیٰ کہ ابن خلدون نے خود اپنی تاریخ میں ان چاروں کا نام دیا ہے، اور واقعہ کی اس صورت میں کہ یہ چار شخصیتیں بہت صاف اور نمایاں طور پر مخالف تھیں، یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے جو کچھ ازراہ مصلحت اندیشی کیا تھا، وہ واقعہ میں بھی پوری طرح مصلحت اندیشانہ بات تھی۔ کیونکہ ان چار آدمیوں کا اختلاف ہوتے ہوئے یہ بات ماننا مشکل ہے کہ یزید کی ولی عہدی کے ذریعہ ملت کو شقاق و انتشار سے بچانے کا اطمینان کیا جا سکتا تھا۔

یہ کیسے چار آدمی تھے؟ عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ تو اس مرتبے کے لوگ تھے کہ جب حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان "تحکیم" کا قصہ پیش آیا کہ "دو حَکَم بیٹھ کر قرآن کی رو سے فیصلہ کریں کہ اس اختلاف کا حل کس طرح ہونا چاہیے؟ اور ان دو حَکَموں (حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ) کا اجلاس اس فیصلے کے لیے منعقد ہوا تو اس کی غیر معمولی اہمیت کی بنا پر اور اس بنا پر کہ بظاہر اسباب اس کے نتیجہ خیز ہونے پر امت کی فلاح و بقا کا انحصار تھا، جن اہم لوگوں کو حَکَمین نے اس موقع پر بلوانے کی اور اُن سے درخواست کرنے کی ضرورت سمجھی کہ وہ ضرور اس موقع پر موجود ہوں تو ان میں یہی دو (عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ) تھے جن کا نام کے ساتھ تاریخ ذکر کرتی ہے۔

---

[1] ایضاً

فلما اجتمع الحَکمان باَذْرُح	جب حَکمین اَذرُح[1] کے مقام پر جمع ہوئے
واتاھم المغیرۃ بن شعبۃ	تو بہت سے لوگ وہاں پہنچے جن میں
فیمن حضر من الناس فارسل	مغیرہ بن شعبہ بھی تھے نیز ان حکمین نے
الحکمان الی عبد اللہ بن عمر	عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر کے
بن الخطاب وعبد اللہ بن	پاس بلاوا بھیجا کہ وہ اس موقعہ
الزبیر فی اقبالھم فی رجال	پر ضرور آجائیں۔
کثیر[2]	

طبری کی روایت کے یہ الفاظ ذرا الجھے ہوئے ہیں۔ مصنّف عبدالرزاق[3] میں عبارت بہت صاف ہے لہٰذا ہم اسے بھی نقل کرتے ہیں:۔

فلمّا حکم الحکمان فاجتمعا	پس جب دو آدمی حکم بنا دیے گئے اور
باَذْرُح واتاھما المغیرۃ بن	وہ اَذرُح میں جمع ہوئے تو مغیرہ بن شعبہ
شعبۃ وارسل الحکمان الی	بھی وہاں پہنچ گئے اور ان حکمین نے
عبد اللہ بن عمر والی عبد اللہ	عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر کو
بن زبیر وا فارجالٌ کثیر	(بطور خاص) بلاوا بھیجا اور ان کے
من قریش[4]...	علاوہ قریش کے بہت سے لوگ آپہنچے۔

---

[1] یہ شام کے حدود میں ایک مقام کا نام ہے۔ [2] طبری جلد ۶ صـــ۳۲۔ [3] یہ امام ابوبکر عبدالرزاق الصنعانی (م ۱۹۱ء) کا مرتب کردہ مجموعۂ احادیث وآثار ہے۔ امام عبدالرزاق امام بخاری کے استاذ ہیں۔ اس کتاب کے نسخے اب تک قلمی تھے ۱۹۷۲ء میں پہلی بار یہ مطبوعہ شکل میں سامنے آئی ہے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ایڈٹ کیا ہے۔ گیارہ جلدوں میں تمام ہوئی ہے۔
[4] ج ۵ صـــ۴۶۳۔ مزید برآں صحیح بخاری میں بھی ایک روایت ہے جس سے حضرت عبداللہ بن عمر کا اس موقع پر بلایا جانا معلوم ہوتا ہے۔ یہ کتاب المغازی' باب غزوۃ الخندق کی بارہویں حدیث (۴۱۰۸) ہے۔ عن سالم عن ابن عمر، نیز عن عکرمۃ عن ابن عمر۔ صاحب العواصم والقواصم ابوبکر ابن العربی نے یہ حدیث ان واقعات کے سلسلے میں نقل کی ہے جن کا تعلق یزید کی (باقی صـــ۱۳۵ پر)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی مزید برآں ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اس موقع پر حَکَمین کے درمیان ایک متبادل شخصیت کی تلاش میں سب سے پہلا نام عبداللہ بن عمرؓ ہی کا آیا کہ علیؓ اور معاویہؓ دونوں کو چھوڑ کر ان کو خلیفۂ اسلام مان لیا جائے۔

قال عمرو یا ابا موسیٰ أ انت علیٰ ان نسمّی رجلاً یلی امر ھٰذہ الامّة فسمّہ لی فان اقدر علیٰ ان اتابعك فلك علیّ ان اتابعك والّا فلی علیك ان تتابعنی، قال ابو موسیٰ اُسمّی لك عبد اللہ بن عمر وکان ابن عمر فیمن اعتزل۔[1]

عمرو بن العاص نے دوسرے حکم ابوموسیٰ اشعری سے (جبکہ وہ دونوں تنہائی میں گفتگو کو بیٹھے) کہا کہ ابوموسیٰ کیا تم پسند کرتے ہو کہ ہم امت کی سربراہی کے لیے کسی ایک شخص کو نامزد کردیں! اگر پسند کرتے ہو تو نامزد کرو، میرے لیے اگر ممکن ہوا کہ تمہارا دیا نام قبول کرلوں تو میں قول دیتا ہوں کہ قبول کرلوں گا ورنہ پھر میں جو نام دوں تم اسی پر راضی ہوجانا۔ ابوموسیٰ اشعری نے کہا میں عبداللہ بن عمر کا نام تجویز کرتا ہوں۔۔۔ اور ابن عمران لوگوں میں سے تھے جو اس دور کے اختلاف سے الگ رہے تھے۔

الغرض جن افراد کا یہ مقام ہو کہ مسئلہ خلافت کی پیچیدہ گتھی سلجھائے جانے میں ان کی موجودگی بطورِ خاص ضروری سمجھی جارہی ہو، دونوں طرف کے حَکَم ان کا انتظار کررہے ہوں۔

(بقیہ ص۱۳۴ کا) ولی عہدی کیلئے حضرت معاویہ کی کوششوں سے ہے لیکن یہ کوئی غلط فہمی ہے ورنہ اس حدیث کا تعلق ۳۷ھ میں حکمین کے اجلاس سے ہے جیسا کہ مصنّف عبدالرزاق کی مذکورہ بالا عبارت کے اگلے حصّے سے قطعی طور پر معلوم ہوتا ہے۔ دیکھئے مصنّف ج ۵ ص۴۶۶ اور فتح الباری ج ۷ ص۴۰۳ (مطبوعہ سعودیہ)

[1] طبری ج ۶ ص۳۲۔ مصنّف ج ۵ ص۴۶۵۔ **ایک اہم فائدہ** ــــ اس فائدہ کے لیے ملاحظہ ہو ضمیمہ اس باب کے خاتمے پر۔

اور مزید برآں ان میں سے ایک کا یہ درجہ بھی ہو کہ اس کی ذات میں مسئلہ خلافت کی پیچیدگی کا حل دیکھا جا رہا ہو ایسے اشخاص کے اختلاف کے ساتھ کیسے قطعی اُمیّد کی جا سکتی تھی کہ یزید کے ماتحت نظمِ خلافت استوار رہ سکے گا؟ پھر یہ دو ہی نہیں، حضرت حسین بن علیؓ بھی اختلاف کے لیے حتمی طور پر موجود تھے۔ اور تنہا انہی کا اختلاف اس بات کا اندیشہ رکھنے کے لیے کافی تھا کہ یزید کے لیے خلافت کا کاروبار آسان نہیں ہو سکے گا۔ اور اگر عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ بھی ولی عہدی کی کاروائی کے دنوں میں بقیدِ حیات تھے تو وہ تو بالکل شمشیر بے نیام تھے۔ خود حضرت معاویہ کا جو وصیت نامہ یزید کے لیے نقل کیا گیا ہے وہ اگرچہ بعض وجوہ سے مشکوک ہے تاہم اس میں بھی یزید کو ان چار آدمیوں کے اختلاف سے آگاہی اور مناسب ہدایات دی گئی ہیں۔

بہرحال یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت کے حالات میں یزید کے ماتحت ادارۂ خلافت کو کم سے کم خطرہ ہو سکتا تھا۔ لیکن وہ بات جو ابن خلدون نے کہی ہے کہ یزید کی ولیعہدی کے ذریعہ ادارۂ خلافت کو گویا خطرات سے تحفّظ عطا کر دیا گیا، یہ کچھ زاید ہی بات ہے۔ بیشک عبداللہ بن عمر نے اپنی رائے کے اختلاف کو عملی شکل دینا پسند نہیں کیا جیسا کہ ان کا مزاج تھا اور جیسا کہ ان کے بارے میں حضرت معاویہؓ کا اندازہ تھا اور بے شک حضرت حسینؓ کے معاملے میں بھی حضرت معاویہ کا اندازہ صحیح ہوا کہ اگرچہ کوفی انھیں حرکت میں لائے بغیر نہ چھوڑینگے مگر وہی یزید کی طرف سے ان کے لیے کافی بھی ہو جائیں گے، جیسا کہ ان کی پرانی عادت رہی ہے۔ مگر عبداللہ بن زبیر کی سرگرم اور پُرزور محاذ آرائی جس سے حضرت معاویہؓ کو سچ مچ خطرہ تھا حضرت حسین کی شہادت کے اثرات سے مل کر بالآخر یزیدی خلافت کے لیے موت کا پیام بن ہی گئی۔ ایسی موت کہ پھر اس گھرانے میں سے خلافت نکل گئی۔ اس لیے اگرچہ یہ تسلیم کہ حضرت معاویہ کا یزید کو ولی عہد بنانا ملّی مصلحت اندیشی ہی کے ماتحت تھا نہ کہ جذبۂ پدری کے ماتحت، مگر یہ تسلیم کرنا مشکل کہ ایسے اہم افراد کے اختلاف کے

ساتھ، یہ تجویز مصلحت اندیشی کا بہترین نمونہ بھی تھی۔

اہلِ اختلاف کے اختلاف کی بنیاد

یزید کی ولی عہدی سے جن حضرات نے نمایاں اختلاف کیا اور آخر تک اختلاف جاری رکھا، یعنی حضرت عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ اور حضرت حسین بن علیؓ ان کے اختلاف کے سلسلے میں یہ بات بڑی طرح مشہور ہوگئی ہے کہ یزید ایک فاسق و فاجر انسان تھا اس لیے اِن حضرات کو یہ بات قبول نہیں تھی کہ اُسے اسلامی خلافت جیسا مقدس اور محترم منصب دیا جائے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو حضرات حضرت معاویہ کی زندگی میں سرگرم اختلاف فرما رہے تھے، ان کی زبان سے ہمیں کوئی لفظ ایسا نہیں ملتا جس سے اس شہرت عام کی تصدیق ہو سکتی ہو۔ اِن حضرات کا صرف ایک اختلاف ریکارڈ پر ہے کہ "یہ اسلام میں قیصریت و کسرویت کی بنیاد ڈالی جارہی ہے کہ باپ مرے تو بیٹا حکومت سنبھال لے، خلفائے راشدینؓ کے انتخاب کے طرز سے اس کی تائید نہیں ہوتی"۔ باب ۵ میں وہ گفتگوئیں طبری اور ابن اثیر وغیرہ کے حوالے سے گزر چکی ہیں جن میں ان اختلاف کرنے والے حضرات نے حضرت معاویہؓ اور ان کے نمائندوں مروان بن الحکم وغیرہ سے اپنے اختلاف کی بنیاد بیان کی ہے۔ ان گفتگوؤں اور بیانات میں اس بنائے اختلاف کے ماسوا کوئی دوسری بات نہیں۔ مگر جن لوگوں کے طفیل یہ بے بنیاد اور بے اصل بات پھیلی اور بالکل ایک تاریخی واقعہ بن گئی ہے کہ حضرت حسینؓ اور ابن زبیرؓ وغیرہ کے اختلاف کی بنیاد یہ تھی کہ یزید ایک زبردست فاسق و فاجر تھا، ان کی جراتوں کا عالم تو یہ ہے کہ جو افسانہ چاہیں تراشیں اور پروپیگنڈے کے فن سے حقیقت بنا دیں کیونکہ صحابۂ کرامؓ کو مطعون کرنا ان کا دین و ایمان ہے اور اس کام کا بہت آسان راستہ حضرت معاویہؓ کی ذات میں بایں طور ملتا ہے کہ یزید کو ابتدائے عمر ہی سے فاسق و فاجر بتا کر یہ خیال مسلمانوں کے دلوں میں ڈالا جائے کہ ایسی نالائق اولاد کو اس شخص نے جسکو

صحابیٔ رسول کہا جاتا ہے تخت خلافت پر بٹھایا اور اس وقت موجود کتنے ہی اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے بھی دو چار کے سوا کسی کو توفیق نہ ہوئی کہ اس کی مخالفت کرے۔ جناب علی نقی صاحب لکھنوی کی کتاب "شہید انسانیت" کا ذکر پہلے باب میں آچکا ہے۔ ایک افسوسناک غلط بیانی کی مثال وہاں دی گئی تھی اسی طرح کی ایک دوسری مثال اس باب کی یہاں ملاحظہ فرمائیے۔ باب ۵ میں ابن اثیر کے حوالے سے یہ روایت گزری ہے کہ گورنر مدینہ مروان بن الحکم نے حضرت معاویہ کی ہدایت پر اہلِ مدینہ کے سامنے یزید کی ولی عہدی کی تجویز منظوری کے لیے رکھی جس کو حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ نے نہایت سختی سے رد کرتے ہوئے کہا کہ کیا یہ کسرویت و قیصریت کی بنیاد ڈالی جارہی ہے؟ اس تجویز میں ہرگز دین و ملّت کا مفاد ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ اس سے زیادہ حضرت عبدالرحمٰن کا کوئی تبصرہ نہیں تھا، یزید کے کسی فسق و فجور کا ذکر نہیں تھا۔ مگر جناب علی نقی صاحب نے اسی واقعہ کا حوالہ دیتے ہوئے حضرت عبدالرحمٰن کے منہ میں یہ الفاظ بھی ڈالے ہیں کہ:۔

"ہم ہرگز اس شرابی اور زانی کی بیعت نہ کریں گے۔" ص ۱۵۶۔

بھلا کون سمجھے گا کہ قبلہ اپنی طرف سے ایک جھوٹ کا اضافہ کر رہے ہیں؟ مگر واقعہ یہی ہے کہ بالکل خالص جھوٹ ہے جس کا کوئی سر پیر نہیں۔ حضرت ابن ابی بکر نے یہ الفاظ نہیں فرمائے۔ کچھ سنی سنائی باتوں پر اپنا خواہ مخواہ ایک گمان یہ تھا کہ قبلہ علی نقی صاحب ایک علمی شخصیت ہیں (اب یہ قصۂ ماضی ہے، انتقال ہو چکا ہے) اس گمان میں مزید اضافہ لندن کے "مدرسہ سید خوئی" کے لائبریرین صاحب نے کیا جن کے پاس راقم السطور کچھ کتابوں کی تلاش میں پہنچا تھا۔ لائبریرین صاحب (جن کا میں ممنون ہوں کہ چند کتابیں انہوں نے مجھے چند ہفتے کے لیے مستعار دیں، انھوں) نے مجھے کچھ زیادہ ہی اصرار سے یہ مشورہ بھی دیا کہ اس موضوع پر کچھ لکھنے سے پہلے میں مولانا سید علی نقی صاحب کی "شہید انسانیت" ضرور دیکھ لوں۔ یہ مشورہ چونکہ موصوف کے اس خوف و خطر کے پس منظر میں صادر ہوا تھا کہ پتہ نہیں یہ شخص (راقم)

کیا" ستم" ڈھانے کی تیاری کر رہا ہے۔ اس لیے مجھے قدرتی طور پر گمان ہوا کہ "شہید انسانیت" ضرور شیعی نقطۂ نظر کے سلسلے میں کوئی علمی وزن کی کتاب ہوگی۔ اس لیے بطور خاص اس کو باہر سے منگانے کا اہتمام کیا گیا۔ مگر اس کا جو حال نکلا وہ اس کتاب سے دی گئی، ان مثالوں سے ظاہر ہے۔

بہرحال پروپیگنڈے کے فن سے کام لے کر یہ بالکل بے اصل بات ایک "واقعی حقیقت" بنا دی گئی ہے کہ حضرت حسین وغیرہ کو یزید کی ولی عہدی قبول کرنے سے انکار اس کے فسق و فجور کی وجہ سے تھا۔ حالانکہ تاریخ کے بیانات میں اس کا دور دور کہیں بھی پتہ نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ اپنے موقع پر آئے گا ولی عہدی کی بیعت کے چار سال بعد (سنہ ۶۰ھ میں) جب حضرت معاویہؓ کے انتقال پر یزید نے خلافت سنبھالی اور حضرت حسینؓ نے اس کے خلاف کھڑے ہونے کا فیصلہ فرمایا، تب بھی یزید کے ذاتی فسق و فجور کی بات آپ کی زبان پر کبھی نہیں آئی، حتیٰ کہ کوفہ کا سفر اور شہادت، ساری منزلیں گزر گئیں۔ کہیں یہ بات "زانی ہے، شرابی ہے" آپ کی زبان پر نہیں آئی۔ بات صرف اتنی ہی تھی کہ باپ کی طرف سے بیٹے کی ولی عہدی ان حضرات کے نزدیک اسلامی اصولِ خلافت کی رو سے صحیح نہیں تھی، یا مصلحت نہیں تھی۔ مزید برآں اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو وہ یہ ہے (جس کے واضح شواہد و قرائن موجود ہیں) کہ یہ سب حضرات وہ تھے جو دراصل حضرت معاویہ ہی کو اس منصب کا اہل نہیں سمجھتے تھے اور حالات کی پیدا کردہ ایک مجبوری کے طور پر انھیں گوارا کرتے رہے تھے[1] بلکہ صاف کہا جائے تو ان میں سے شاید ہر ایک اپنے آپ کو اُن (حضرت معاویہؓ) کے مقابلے میں فیما بینہ و بین اللہ بہتر سمجھتا تھا۔ حد یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جن کے ورع و تقویٰ اور کسی بھی منافست سے

---

[1] یہ بات کہ یہ حضرات حضرت معاویہ کی داد و دہش سے استفادہ کرتے اور ان کے ماتحت جہاد کرتے رہے ہمارے اس بیان کے خلاف نہیں جانی چاہیے۔ جہاد تو امام فاجر کے ماتحت بھی کیا جائے چہ جائیکہ ایک صحابی امام۔ اور داد و دہش ان کی ذاتی نہ تھی مملکت کے مال اور جہاد کے غنائم سے تھی۔

دوری کی بنا پر یہ سمجھنا مشکل ہو سکتا ہے کہ وہ بھی اس معاملے میں بہتری اور برتری کا احساس رکھتے ہوں ان کے بارے میں بھی خود ان کا اپنا بیان بخاری شریف کی اس روایت میں موجود ہے جس کا ذکر ابھی چند صفحات پہلے ایک حاشیہ میں العواصم والقواصم کے حوالے سے گزر چکا ہے اس روایت کے مطابق حضرت عبداللہ بن عمر نے حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان "تحکیم" کے موقع پر حکمین کے اجلاس میں اپنے جانے کا قصہ بیان کرتے فرمایا:۔

فلما تفرق الناس خطب معاویۃ	اور جب لوگ منتشر ہو گئے [۱] (یعنی تحکیم کا
قال من کان یرید ان یتکلم فی	کا قصہ ختم ہو گیا اور خاص طور سے حضرت
ھٰذا الامر فلیطلع لنا قرنہٗ	علیؓ کے لوگ چلے گئے) تو (ایک وقت میں)
فلنحن احق بہ منہ ومن ابیہ	معاویہؓ نے (باقی لوگوں سے) خطاب کیا
قال حبیب بن مسلمۃ فھلّا اجبتہٗ	اور کہا کہ اگر کسی کو اس معاملۂ خلافت میں
قال عبداللہ فحللت حبوتی	دعویٰ ہو تو اپنا دعویٰ سامنے لائے ہم
وھممت ان اقول احق بھٰذا	ہر دعویدار سے اور اس کے باپ سے زیادہ
الامر منک من قاتلک وابٰاک	حق دار نکلیں گے۔ ابن عمرؓ کا یہ بیان سن کر حضرت
علی الاسلام فخشیت ان اقول	معاویہ کے ایک طرفدار) حبیبؓ بن مسلمہ
کلمۃً تفرق بین الجمع وتسفک	بولے "تم نے کچھ جواب نہ دیا؟ میں نے
الدم ویحمل عنی غیر ذالک	کہا کہ ہاں میں نے اپنی نشست بدلی
فذکرت ما اعدّ اللہ فی	تھی اور چاہا تھا کہوں کہ "تم سے زیادہ حقدار
الجنان [۲]۔	وہ ہے جس نے تم سے اور تمھارے باپ سے اسلام کیلئے
	جنگ کی"۔ لیکن مجھے فوراً خیال ہوا کہ یہ بات

---

[۱] مصنّف عبدالرزاق میں "تفرق الحکمان" ہے اور یہی تعبیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ نے بھی بیان مفہوم میں مصنّف کے الفاظ کا سہارا لیا ہے۔ [۲] کتاب المغازی باب غزوۃ الخندق۔

اس وقت کی اجتماعیت میں تفرقہ ڈال سکتی ہے[1]

خونریزی کی آگ بھڑکا سکتی ہے اور خود میرے

بارے میں غلط فہمی پھیلا سکتی ہے اور اسکے

بعد میں نے اللہ کے وہ انعام و اکرام یاد کیے

جن کا ایسی باتوں سے گریز پر جنت میں دیے جانے کا وعدہ ہے[2]

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جو جواب دینا چاہا تھا مگر پھر روک لیا اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کو بھی اسلام میں سابقیت اور اس کے لیے قربانیوں کا فخر حاصل ہے وہ منصبِ خلافت کے زیادہ حقدار ہیں جن میں خود حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی داخل ہوتے تھے۔ لیکن اسی واقعہ کی ایک دوسری روایت بحوالہ الطبرانی کے بارے میں حافظ ابن حجر شارحِ بخاری بتاتے ہیں کہ اس میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے یہ الفاظ بھی پائے جاتے ہیں کہ:

فما حدّثتنی نفسی بالدنیا	یہ پہلا دن تھا کہ میرے دل میں دنیا طلبی کی بات
قبل یومئذٍ۔ (فتح الباری ج ۷ حدیث ۴۱۸)	آئی۔ (یعنی حکومت کے حق کا دعویٰ پیدا ہوا)

ان الفاظ کی رو سے حضرت معاویہؓ کے مقابلے میں حضرت ابن عمرؓ کے دل میں آنے والی یہ بات (اس وقت) تنہا ان کی اپنی ہی ذات سے متعلق ہو جاتی ہے۔

ان کے علاوہ حضرت حسینؓ جیسے خیالات حضرت معاویہؓ کے بارے میں رکھتے تھے وہ تو کوئی ڈھکی چھپی بات ہی نہیں ہے باب دوم میں ان کا ایک خط خود حضرت معاویہ ہی کے نام گزر چکا ہے جو صاف الفاظ میں بتاتا ہے کہ وہ ان کی حکومت کو کیا سمجھتے تھے۔

بہر حال یہ بات کوئی راز نہیں ہے کہ ان حضرات نے اگرچہ حضرت معاویہ سے بیعت کر لی تھی، مگر ایک مجبوری کے درجے میں کی تھی، پوری طرح اہل سمجھ کر نہیں کی تھی۔ اور بنیادی وجہ

---

[1] یہ بڑا اہم جملہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تحکیم کا معاملہ کسی ایسی صورت پر ختم ہوا تھا جس سے اجتماعیت کے بحال ہونے کی امید ہو گئی تھی۔ مگر افسوس کہ اس کی کوئی تفصیل کہیں نہیں ملتی۔ [2] صحیح بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ الخندق۔

وہی تھی جس کا اظہار حضرت ابن عمرؓ کے مذکورہ بالا بیان سے ہوتا ہے کہ وہ سابقین اور سابقین اوّلین کے ہوتے ہوئے متأخرین کے لیے خلافتِ اسلامی کا حق نہیں مانتے تھے اِلّا یہ کہ دوسرے مصالح کی وجہ سے ان کو مجبوراً قبول کرلیا جائے۔ پس کیا گنجائش تھی کہ وہ یزید کو اپنی اور اپنے جیسوں کی موجودگی میں خلیفۂ اسلام ماننے کے لیے تیار ہوجاتے؟ لہٰذا علاوہ ان حضرات کے اس صریح موقف کے کہ باپ کی طرف سے بیٹے کی نامزدگی (اور گویا خلافت بطور وراثت) ایک غیر اسلامی طریقہ ہے۔ یہ بات بھی تقریباً یقینی ہے کہ وہ یزید کو اس بنا پر بھی منصبِ خلافت کیلئے ناقابلِ قبول سمجھتے تھے کہ وہ اپنے والد معاویہؓ سے بھی قطعی طور پر مفضول تر تھے۔ لیکن یہ بات قطعی جھوٹ اور افتراء ہے کہ یزید کے بارے میں کسی فسق و فجور کا مسئلہ بھی اٹھایا جاتا تھا، یہ مسئلہ اگر اٹھا ہے تو حضرت حسینؓ کی شہادت کے تین سال بعد کچھ اہلِ مدینہ کی طرف سے اٹھا ہے اور اُسے رد کرنیوالے بھی اسی مدینے میں حضرت حسنؓ و حسینؓ کے بھائی حضرت محمد بن حنفیہ بن حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ ایسے حضرات بھی تھے جن کے رد کا وزن نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

یزید اپنے ایک خطبے کے آئینے میں

حضرت معاویہؓ کی وفات کے وقت تک یزید کے مزاج و کردار کا ایک اچھا آئینہ ہمارے خیال میں اُن کا وہ مختصر سا خطبہ ہے جو اہلِ تاریخ کے بیان کے مطابق انھوں نے اپنے والد حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد دیا تھا۔ اس خطبے کے آئینے میں ان کی شخصیت ایک سنجیدہ باوقار اور ذی علم انسان کی نظر آتی ہے نہ کہ شراب و کباب، رقص و سرود اور لہو و لعب کے ایک رسیا کی۔

ابن کثیر لکھتے ہیں کہ "معاویہ کا انتقال ہوا تو یزید حوارین[1] میں تھے۔ ضحاکؓ بن قیس کوتوال شہر نے اطلاع کرائی تب وہ آئے۔ ضحاکؓ نے شہر سے باہر اُن کا استقبال کیا، یزید نے وہاں سے اندرونِ شہر میں جانے کے بجائے قبرستان کا رُخ کیا۔ والد کی قبر پر نمازِ جنازہ ادا کی یہاں

---

[1] یہ مقام شام کے علاقۂ حلب میں ہے۔

سے فارغ ہو کر شہر میں آئے حکم دیا کہ "الصلوٰۃ جامعۃ" کی ندا کرائی جائے۔ پھر اپنی اقامت گاہ خضراء میں داخل ہو کر غسل کیا۔ لباس بدلا۔

ثم خرج فخطب الناس اول خطبۃ وھو امیر المومنین فقال بعد حمد اللہ والثناء علیہ: ایھا الناس! ان معاویۃ کان عبدًا من عبید اللہ انعم اللہ علیہ ثم قبضہ الیہ وھو خیر ممن بعدہٗ ودون من قبلہٗ ولا ازکیہ علی اللہ عزوجل فانہ اعلم بہٖ، ان عفی عنہ فبرحمتہ وان عاقبہٗ فبذنبہ وقد ولیت الامر من بعدہٖ۔۔۔۔۔۔[1]

پھر باہر آئے اور بحیثیت امیر المومنین لوگوں سے پہلا خطاب کرتے ہوئے حمد وثنا کے بعد کہا کہ لوگو! معاویہ اللہ کے بندوں میں سے ایک بندے تھے، اللہ نے انکو اپنی نعمتوں سے نوازا اور پھر اپنے حضور میں بلا لیا وہ اپنے بعد والوں سے بہتر اور پیشروؤں سے کمتر تھے۔ لیکن میں اللہ کے سامنے انکا تزکیہ کرتے (بھلائی کی سند دینے) کیلئے نہیں کہہ رہا، اسلیے کہ وہ انکو زیادہ بہتر جانتا ہے اگر ان سے درگذر فرمائے تو یہ اس کی رحمت سے ہوگا اور اگر گرفت فرمائے تو یہ انکے گناہوں کی وجہ سے ہوگا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ ان کے بعد خلافت کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی گئی ہے الخ[1]

ہمارا خیال ہے کہ اس خطبے کی عبارت، اس کا مضمون اور اس کا لہجہ ہر چیز اس شخص (یزید) کے بارے میں اس عام خیال کی تردید کرتی ہے جو کسی واقعی بنیاد کے بغیر صرف اس لیے پھیلنے میں کامیاب ہوگیا ہے کہ اس شخص کی حکومت کے زمانے میں اسی کے حکام اور لشکریوں کے ہاتھوں ریحانۂ رسولؐ، جگر گوشۂ بتولؓ حضرت حسینؓ کی شہادت کا المناک واقعہ پیش آیا۔ اور اس نے اپنے حکام سے اس پر باز پرس نہ کی، اس لیے ایسے آدمی سے متعلق جو بھی برائی کسی نے سنا دی وہ

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۴۳

قابل یقین ہو گئی۔ مگر یہ ہے واقعی اسلامی انصاف کے خلاف بات کہ کسی کے ایک جرم کی سزا میں، اس جرم سے پہلے کی اس کی زندگی کو بھی خواہ مخواہ بدنام کیا جائے، ہاں جن لوگوں کے نزدیک جھوٹ سچ ہر طریقے سے صحابۂ کرامؓ کو بدنام کرنا ایک کارِ ثواب ہے ان کے لیے بالکل ٹھیک ہے کہ وہ پروپیگنڈے کا یہ تیر بھی جو بہت موقع کا ہے صحابۂ کرامؓ ہی کو نشانہ بنانے کی نیت سے چلائیں۔

یزید کا معاملہ اتنا نازک ہے کہ ان کے حق میں بالکل سیدھی اور معقول بات کہتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے، اس لیے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی جائے کہ مذکورۂ بالا خطبے سے ہم صرف یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ بندروں، ریچھوں کے ساتھ کھیلنے والا، شراب و کباب میں غرق، لہو ولعب میں مست اور زنا و قمار کا رسیا انسان نہیں نظر آتا جیسا کہ بتایا جاتا ہے۔ کیونکہ اس قماش کے لوگ ایسی محتاط، دانشورانہ اور دین و دنیا کی نزاکتوں پر حاوی زبان نہیں بولا کرتے۔ رہا یہ کہ وہ کوئی بڑا متقی و پرہیزگار ہو، یہ اس خطبے سے نہیں نکالا جاسکتا۔ ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا۔ اور بظاہر ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ جس نسل اور جس طبقے سے تعلق رکھتا تھا اس کے بارے میں قرنِ اول کی نسل اور صحابۂ کرام کے طبقے والے اتقاء و پرہیزگاری کی توقع تو بہر حال مشکل ہی سے کی جا سکتی ہے۔

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ:-

وقد كان يزيد فيه خصال محمودة	یزید میں بعض بڑی عمدہ خصلتیں تھیں مثلاً
من الكرم والحلم والفصاحة و	حلم و کرم، شعر و فصاحت، شجاعت اور
الشعر والشجاعة وحسن الرأى	امور سلطنت میں حُسنِ رائے۔ اسی کے ساتھ
فى الملك وكان فيه ايضاً اقبال على	اس میں خواہشات نفس کی طرف ایک گونہ
الشهوات وترك بعض الصلوٰة	میلان اور بعض اوقات ترک صلوٰۃ کا عیب
فى بعض الاوقات داماتتها	بھی تھا اور نمازوں کے بارے میں

فی غالب الاوقات [۱]   بے اہتمامی تو اس سے عموماً صادر ہوتی تھی۔

اس عبارت میں آخری دو باتیں (کبھی کبھی ترک نماز اور اکثر نمازوں کے سلسلے میں بے اہتمامی) کے سوا اور جو کمزوریاں بیان کی گئی ہیں وہ ہمارے نزدیک بالکل بعید نہیں۔ فلسفۂ تاریخ کے مطابق ان کمزوریوں کا دور شروع ہو چکا تھا۔ اور ایسی روایتیں ملتی ہیں جو ذمہ دارانہ جرح و تنقید کے عمل سے گزرنے کے بعد اس طرح کی کمزوری کا یزید کے بارے میں گمان قابلِ قبول بنا دیتی ہیں، البتہ آخری دونوں باتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں ثبوت کی ضرورت ہے۔ جو ابن کثیر نے فراہم نہیں کیا۔ علاوہ ازیں یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ دو اتنے سنگین عیب یزید میں پائے جاتے اور اس کی ولی عہدی سے شدید اختلاف کرنے والے حضرات ان کی طرف اشارہ نہ کرتے، جبکہ یہ چھپے رہنے والے عیب نہیں تھے۔ اور نہ ہی حقیقت میں یہ ہو سکتا تھا کہ حضرت معاویہ ایسے فرزند کو جو ترکِ نماز اور اماتتِ صلوٰۃ کا عادی ہو اس امت پر خلیفہ بنا کر مسلّط کریں جس کی سب سے بڑی پہچان "اقامتِ صلوٰۃ" ہے۔ بہر حال وہ بڑا متقی نہ سہی لیکن ان عیبوں کی نسبت اس کی طرف بڑی زیادتی ہے جو مشہور کر دیئے گئے ہیں اور خاص کر یہ تو بالکل ہی بے بنیاد بات ہے کہ اختلاف کرنے والے حضرات اس کے کچھ عیبوں کو بھی اختلاف کی وجہ بتاتے تھے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمت میں سوال بھیجا گیا کہ "حضرت معاویہؓ نے اپنے رو برو یزید پلید کو ولی عہد کیا ہے یا نہیں؟ ۔۔۔ آپ نے جواب تحریر فرمایا:

"حضرت معاویہؓ نے یزید کو خلیفہ کیا تھا، اس وقت یزید اچھی صلاحیت میں تھا۔"

(فتاویٰ رشیدیہ (ایچ۔ ایم سعید کمپنی کراچی) ص ۲۸۰-۲۸۱)

ایک اور سوال اسی مضمون کا آیا جس پر جواب تحریر فرمایا گیا:

"۔۔۔ یزید اوّل صالح تھا بعد خلافت کے خراب ہوا۔" (فتاویٰ ص ۲۸۱)

[۱] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۲۳۰۔

ضمیمہ

متعلقہ ص ۱۳۵

ایک اہم فائدہ

ہم نے تو یہ روایت صرف یہ دکھانے کے لیے نقل کی ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان کشمکش کی صورت ختم کرنے کے لیے حکمین نے جب یہ طے کیا کہ خلافت کے لیے کسی اور آدمی کا انتخاب کرلیا جائے تو اس کے لیے سب سے پہلا نام حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہی کا لیا گیا۔ لیکن یہ روایت اس لحاظ سے بھی بہت اہم ہے کہ "تحکیم" کے سلسلے میں واقعہ کی شکل اب تک یہ بتائی جاتی رہی ہے کہ حکمین (حضرت ابو موسیٰؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ) کے درمیان یہ بات طے ہوئی تھی کہ نہ علی کی خلافت نہ معاویہؓ کی۔ بلکہ مسلمان کسی تیسرے آدمی کا انتخاب کرلیں، چنانچہ ان دونوں نے اپنی تنہائی کی اس قرارداد کے مطابق یہ طے کیا کہ مجمع کے سامنے آکر علیؓ اور معاویہؓ کی معزولی کا اعلان کردیا جائے اور یہ اعلان پہلے ابو موسیٰؓ نے کیا اس کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ کھڑے ہوئے تو انہوں نے کہا کہ علی کی حد تک میں بھی ابو موسیٰ کے اعلان سے متفق ہوں لیکن معاویہ کو معزول نہیں کرتا ہوں جس پر دونوں میں بڑی تلخ کلامی ہوئی اور جھگڑا ابنارہ گیا۔ یہ روایت بھی طبری ہی میں ہے (ج ۶ ص ۴۰-۳۹) لیکن جو روایت اوپر نقل کی گئی اس کی رو سے واقعہ کی شکل بالکل مختلف ہو جاتی ہے اور وہ اس لحاظ سے زیادہ قابل قبول بھی ہے کہ اوّل تو اس میں حضرت معاویہ کو "معزول کرنے" کی بے تکی بات نہیں پائی جاتی۔ حضرت معاویہؓ کو خلافت کا دعویٰ نہیں تھا کہ ان کو "معزول" کیا جاتا۔ خلافت کا دعویٰ حضرت علیؓ کو تھا، حضرت معاویہؓ کو ان کی خلافت اس وقت تک تسلیم کرنے سے انکار تھا۔ جب تک کہ وہ خون عثمانؓ کا قصاص نہ دلوادیں۔ اس لیے معزولی صرف حضرت علیؓ کی

ہو سکتی تھی نہ کہ حضرت معاویہؓ کی۔ دوسرے، واقعہ کی یہ شکل، جو طبری ج ۶ ص ۳۲ والی روایت کی رو سے سامنے آتی ہے، اس میں اسلامی تاریخ کے ایک ہیرو اور صحابیٔ رسول ﷺ (حضرت عمرو بن العاصؓ) کے دامن پر دھوکہ دہی کا وہ دھبہ بھی نہیں آتا جو نہایت شرمناک اور کسی طرح بھی آسانی سے قابل قبول نہیں کہ ایک بات تنہائی کی مجلس میں طے کی اور مجمع عام میں اس کے خلاف کیا۔

یہاں جو واقعہ کی شکل بیان ہوئی ہے اس کی رو سے حضرت ابو موسیٰؓ نے خلافت کے لیے متبادل نام کے طور پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا نام پیش کیا۔ اس کے آگے کا حصہ روایت میں یوں ہے کہ قال عمرو انی اسمی لك معاوية بن ابی سفیان۔ عمرو بن العاصؓ نے (ابو موسیٰ کا پیش کردہ نام نہ قبول کرتے ہوئے) کہا کہ میں معاویہ بن ابی سفیانؓ کا نام تجویز کرتا ہوں۔ اور اس کے بعد جیسا کہ واقعہ کی دوسری روایت میں، جو کہ مشہور ہے، آتا ہے دونوں حضرات میں تلخ کلامی ہوئی اور حضرت ابو موسیٰ اپنی مغلوبیت کے احساس سے بوجھل ہو کر بجائے حضرت علی کے پاس جانے کے مکے واپس چلے گئے۔

اس روایت کی رو سے حضرت عمرو بن العاصؓ نے کوئی ایسی بات نہیں کی جس کی بنا پر انہیں بد عہدی اور دھوکہ بازی کا وہ الزام دیا جا سکے جو مشہور روایت کی بنا پر عائد ہوتا ہے، انہوں نے حضرت ابو موسیٰ سے کہا تھا کہ آپ نام پیش کریں اگر میرے لیے قابل قبول ہوا تو لازماً قبول کر لوں گا ورنہ میرا دیا ہوا نام آپ قبول کریں گے۔ اس قرارداد کے بعد حضرت عمرو پر ذمہ داری نہیں آتی تھی کہ وہ حضرت ابو موسیٰؓ کا دیا ہوا نام قبول ہی کر لیں۔ البتہ حضرت ابو موسیٰؓ کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ روایت کے ظاہری الفاظ کے لحاظ سے ان پر ذمہ داری آتی تھی کہ حضرت عمروؓ کا دیا نام قبول کر لیں گے کیونکہ انہوں نے حضرت عمرو بن العاصؓ سے پلٹ کر یہ نہیں کہا کہ میں بھی تمہارے دیئے ہوئے نام کو قبول کرنے کا پابند نہیں بلکہ ان کی یہ بات سن کر کہ "ورنہ پھر میں جو نام دوں گا آپ اسے قبول کریں گے" فوراً ایک نام پیش کر دیا۔ البتہ الفاظ کے اس ظاہری مطلب کے برخلاف ہم حضرت ابو موسیٰ کی صفائی میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ "تحکیم" کے خاص ماحول میں انہیں یہ گمان نہیں تھا کہ عمرو بن العاص "معاویہ بن ابی سفیان" کا نام بھی پیش کر سکتے ہیں۔ ان کے خیال میں شاید یہ مناسب نہیں تھا............اس لئے انہوں نے باوجود قول دینے کے اپنے آپ کو اس نام کے قبول کرنے کا پابند نہیں جانا۔ مگر صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ عبارت کا بالکل لفظی مطلب نہ لیا جائے اور سمجھا جائے کہ حضرت

ابو موسیٰ بھی حضرت عمرو کی طرح آزاد تھے کہ حضرت عمرو کی تجویز مانیں یا نہ مانیں۔ رہا یہ خیال، جیسا کہ شاید حضرت ابو موسیٰ کا تھا کہ عمرو بن العاص نے ایک ایسی بات کی جس کی قول و قرار کے الفاظ کی رو سے اگرچہ پوری گنجائش تھی مگر معاملات کے جس خاص ماحول میں حکمین کو اپنی ذمہ داری ادا کرنی تھی اس ماحول کے اعتبار سے یہ بات مناسب نہ تھی تو یہ ایک نقطۂ نظر ہو سکتا ہے، جبکہ دوسرا نقطۂ نظر یہ ہو سکتا ہے اور بظاہر وہی حضرت عمرو بن العاص کا تھا کہ عملی اعتبار سے امت کے مفاد میں اس وقت اس سے بہتر کوئی دوسری شکل دستیاب نہ تھی کہ خلافت ـــــ یا کہیے اسلامی اجتماعیت کی ذمہ داری ـــــ معاویہ بن ابی سفیان کے ہاتھ میں دیدی جائے۔ نظریت کی ترازو میں یہ بات سخت ناروا نظر آنے والی ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ کی موجودگی میں معاویہ بن ابی سفیان کو امت کی باگ ڈور سونپ دینے میں امت کی بھلائی سمجھی جائے۔ مگر جب ان حقائق پر نظر ڈالی جائے جو حضرت عمرو بن العاص کے سامنے پھیلے ہوئے تھے کہ مثلاً علی مرتضیٰؓ کو اپنی خلافت میں اتنا اختیار بھی حاصل نہیں تھا کہ وہ اپنی طرف سے حکم بھی اپنی مرضی کے مطابق مقرر کر سکیں۔ ابو موسیٰ اشعری کے تقرر کے حق میں وہ ایک منٹ کے لیے نہیں تھے۔ ہر ممکن کوشش کی کہ ایسا نہ ہو ان کے بجائے حضرت عبداللہ بن عباس کو مقرر کیا جائے۔ کیونکہ ابو موسیٰ اس ڈپلومیٹک کام کے لیے، اوّل تو، موزوں نہیں تھے، دوسرے حضرت علی کے کیمپ میں ہوتے ہوئے وہ حضرت علی کی جنگ پالیسی کے قطعی خلاف تھے اور لوگوں کو جنگ میں شرکت سے روکتے تھے۔ جس کا ذکر اس مضمون کے شروع میں بھی آچکا ہے۔ مگر بغاوت پر آمادہ ساتھیوں نے مجبور کیا کہ ابو موسیٰ ہی جائیں گے۔ اور وہ مجبور ہو گئے۔

حضرت علیؓ کی طرف سے حضرت ابو موسیٰ کے تقرر پر اس سے بہتر تبصرہ نہیں ہو سکتا جو ابن اثیر کے محقق حاشیہ نگار نے کیا ہے کہ "علیؓ اگر اپنے معاملہ کی نمائندگی کو معاویہ کے ہاتھ میں دے دیتے تو انہیں اتنا نقصان شاید نہ پہونچتا جتنا ابو موسیٰ کے ہاتھ میں معاملہ جانے سے پہونچا۔" (ج ۳ ص ۱۶۹) بہر حال حضرت علیؓ اپنی ان تمام عظمتوں کے باوجود جن کے آگے سر نیاز جھکے بغیر نہیں رہ سکتا اپنے دائرۂ اختیار میں .... روز بروز زیادہ بے اختیار اور عاجز و درماندہ ہوتے جا رہے تھے۔ ان کے ساتھی ان کی کوئی بات چلنے نہیں دیتے تھے حتیٰ کہ وہ تحکیم میں اپنی مرضی کا نمائندہ تک نہیں رکھ سکے تھے۔ اس کے برعکس معاویہ بن ابی سفیان نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ نہ صرف اپنی ذات سے معاملات پر پورا قابو رکھتے ہیں بلکہ انہیں جو قوم اور اعوان و انصار ملے ہیں وہ سب اس معاملہ میں ان کی دل و جان سے مدد کرتے ہیں۔ ایسی

حالت میں حضرت عمرو بن العاصؓ کو یہ بات سوچنے کا پورا حق تھا کہ کم سے کم فلاح و بہبود جو خون میں نہائی ہوئی اور عافیت کے لیے سرگرداں، اس امت کے لیے حاصل کی جاسکتی ہے وہ اب صرف اس صورت میں حاصل کی جاسکتی ہے کہ معاملات کی باگ ڈور پوری طرح معاویہ کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ جو واحد آدمی ہے کہ حالات کو قابو میں کر سکے ....
جیسا کہ ثابت بھی ہوا۔ دوسرا نام حضرت عبداللہ بن عمر کا سامنے آیا تھا۔ ہر واقف کار جانتا ہے کہ اپنی تمام بزرگیوں کے باوجود وہ اس میدان کے سرے سے آدمی ہی نہ تھے۔ اس وقت تو ایک زبردست انتظامی اور قائدانہ صلاحیت رکھنے والے آدمی کی ضرورت تھی، نہ کہ صرف نیک نفس کی۔ یعنی ٹھیک وہی بات جس کا فیصلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے آخری دور میں کیا (اور اوپر باب سوم میں اس کا ذکر آچکا ہے) کہ اجتماعی ذمہ داری اور نظم و نسق کے لیے ایک کم معیاری مگر مضبوط (اور بقول حضرت عمرو بن العاصؓ ڈاڑھ دانت والے) مسلمان کو ترجیح دی جانی چاہیے، اعلیٰ درجہ کے مگر کمزور اور کم موزوں مسلمان کو نہیں۔

طبری کی اس روایت میں جو تحکیم کے قصے میں عام طور پر مشہور ہے اور اس روایت میں جو ہم نے اوپر (طبری جلد ۶ ص ۳۹) سے نقل کی ہے، سند کے وزن کے اعتبار سے بھی بڑا فرق ہے۔ مشہور روایت کی سند ایک منقطع اور نامکمل سند ہے اور جو کُل دو راوی " ابو مخنَّف اور ابو جناب الکلبی " امام ابن جریر طبری نے اپنے سے اوپر ذکر کیے ہیں۔ ان دونوں میں ناقدین فن کو کلام ہے (ملاحظہ ہو لسان المیزان ج ۴ ص ۴۹۲ طبع بیروت اور تقریب التہذیب ج ۲ ص ۳۴۶) اس کے برعکس جو روایت ہم نے اوپر طبری ج ۶ ص ۳۲ کے حوالے سے نیز مصنف عبدالرزاق کے حوالے سے درج کی ہے اس کی سند نہایت صاف اور مکمل ہے۔

حدثنی عبد اللہ بن احمد (ابن حنبل) قال حدثنی ابی قال حدثنی سلیمان بن یونس بن یزید عن الزھری۔

ایسی روایت کے مقابلے میں ایک غلط قسم کی روایت مشہور ہو جانے کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ مشہور روایت "اجتماع حکمین" کے عنوان کے ماتحت آئی ہے اور غیر مشہور روایت " رفع مصاحف" کے زیر عنوان درج ہو گئی ہے۔ یعنی بے جگہ ہے۔ واللہ اعلم۔

☆☆☆

بابِ ہفتم

حضرت امیر معاویہؓ کی وفات ۔ عہدِ یزید کا آغاز

حضرت حسینؓ کی ہجرت

۵۶ھ میں یزید کی ولی عہدی کے مسئلے سے فارغ ہونے کے بعد حضرت معاویہؓ چار سال زندہ رہے۔ رجب ۶۰ھ میں آپؓ نے اس حال میں وفات پائی کہ جن حضرات نے ۵۶ھ میں یزید کی ولی عہدی قبول کرنے سے انکار کیا تھا ان میں سے جو زندہ تھے وہ اپنے اسی انکار پر قائم تھے۔

یزید کو معاویہؓ کی وصیت

بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے موت کے وقت اس سلسلے میں کچھ وصیت بھی یزید کو کی تھی اس وصیت کی روایتیں مختلف ہیں اور وصیت کی روایتوں کے اختلاف سے پہلے اس معاملے میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے کہ یہ وصیت بالمشافہ تھی۔ یعنی یزید اس وقت آپ کے پاس موجود تھے یا اس وقت وہ موجود نہ تھے بلکہ وصیت قلمبند کرا کے ان کے لیے چھوڑی گئی۔ ابن اثیر نے صراحت کے ساتھ عدم موجودگی کی روایت کو ترجیح دی ہے[1] اور ابن کثیر کا بھی رجحان یہی معلوم

---

[1] الکامل ج ۳ ص ۲۶۰

ہوتا ہے، اگرچہ صریح الفاظ میں یہ بات انھوں نے نہیں کہی ہے۔ موقع کی تفصیلات پر نظر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہی فیصلہ اور رجحان صحیح ہے۔ وصیت کی روایتوں میں جو اختلاف پایا جاتا ہے، اس میں کچھ اختلاف ایسا بھی ہے جو جھوٹ اور سچ کی نوعیت کا حامل ہے۔ مثلاً سب سے پہلی روایت جو یزید کو موجود اور بالمشافہہ مخاطب بتاتی ہے اس کے مطابق حضرت معاویہؓ نے کہا کہ:۔

"بیٹے میں نے تمھاری طرف سے پوری دوڑ بھاگ کرلی ہے۔ ہر چیز ہموار کردی ہے، دشمنوں کو زیر کر دیا ہے، کُل عرب کی گردنیں تیرے لیے جھکادی ہیں۔ اور اب سوائے قریش کے چار آدمیوں کے مجھے کسی کی طرف سے اندیشہ نہیں ہے کہ امرِ خلافت میں تجھ سے نزاع کرے۔ یہ چار ہیں حسین بن علی، عبداللہ بن عمر عبداللہ بن زبیر، عبدالرحمٰن بن ابی بکر ــــــ پس عبداللہ بن عمر کی بات تو یہ ہے کہ کثرت عبادت نے اب انھیں کسی کام کا نہیں رکھا ہے جب یہ دیکھیں گے کہ اور سب نے بیعت کرلی تو وہ بھی کرلیں گے، رہے حسین بن علی تو عراق والے انھیں تیرے مقابلے پر نکالے بغیر چھوڑیں گے نہیں اگر ایسا ہی ہو اور وہ خروج کر بیٹھیں اور تم ان پر قابو پاؤ تو درگذر کرنا اس لیے کہ بہت قریبی رشتہ ہے اور بڑا حق ہے۔ تیسرے ابن ابی بکر ہیں وہ بس اپنے ساتھیوں کے نقش قدم پر چلیں گے۔ ان کی حوصلہ مندیوں کا میدان تو بس عورتیں اور ایسی ہی دوسری لذتیں ہیں۔ ہاں وہ شخص جو تجھ پر شیر کی طرح گھات لگائے گا اور لومڑی والی وہ چالیں چلے گا کہ ذرا تو اُسے موقع دے تو وہ تجھ پر جست لگائے وہ عبداللہ بن زبیر ہے۔ اگر وہ ایسا کرے اور تجھے اس پر قابو مل جائے تو ٹکڑے ہی کرڈالنا۔"[1]

اس وصیت میں جھوٹ کی آمیزش کا کھلا نشان حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کا تذکرہ

---

[1] طبری ج ۶ صفحہ ۱۸۰-۱۷۹۔

ہے، ان کے بارے میں بہت تفصیل سے بحث گزر چکی ہے جس کی رو سے ان کی زیادہ سے زیادہ زندگی ۵۸ھ تک مانی جا سکتی ہے۔ حضرت معاویہ ۶۰ھ میں ان کی بابت کوئی وصیت کریں یہ صرف ایک جھوٹ اور جعل ہو سکتا ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔ اور یہ بعد کے زمانے کے کسی ایسے آدمی کی جعل سازی ہے جو اس تاریخی حقیقت سے بے خبر تھا، نیز اس حقیقت سے بھی بے خبر تھا کہ حضرت معاویہ کی وفات کے وقت یزید کی موجودگی ثابت کرنا مشکل ہے۔ اسکے مقابلے میں طبری ہی نے اگلی سطروں میں جو وصیت نامہ درج کیا ہے جو یزید کی غیر موجودگی میں دو اہم اشخاص کے سپرد کیا گیا تھا کہ یزید کو دیا جائے اور جو عبدالرحمٰن بن ابی بکر کے بے محل اور بے حقیقت تذکرے سے بھی پاک ہے اس کا مزاج مذکورہ بالا وصیت سے بہت مختلف اور حضرت معاویہ کے دور اندیشانہ، فراخدلانہ، صلہ رحمانہ اور رعایا پرورانہ مزاج سے پوری طرح جوڑ کھاتا ہے۔ اس لیے اس کے بارے میں یقین کیا جا سکتا ہے کہ وہ فی الواقع حضرت معاویہ ہی کا ہوگا۔ اس وصیت نامہ کی روایت کے مطابق :-

"جب معاویہ کا وقت ۶۰ھ میں پورا ہوا اور یزید اس وقت موجود نہ تھے تو انھوں نے ضحاکؓ بن قیس فہری کو جو اُن کے پولیس افسر تھے اور مسلم بن عقبہ المرّی کو بلایا اور ان سے کہا کہ میری وصیت یزید کو پہونچا دینا کہ اہل حجاز کا خیال رکھو جو تمھاری اصل ہیں۔ ان میں سے جو کوئی تمھارے پاس آوے اس کا اکرام کرو اور جو نہیں آتا ہو اس کی خبر رکھو اور عراق والوں کا بھی خیال رہے کہ وہ اگر تم سے روز ایک عامل (حاکم) معزول کرنے کا مطالبہ کریں تو ان کا مطالبہ پورا کر دو۔ اس لیے کہ ایک عامل کی معزولی اس سے کہیں بہتر ہے کہ ایک لاکھ تلواریں تمھارے خلاف حرکت میں آویں۔ اور اہل شام کا بھی خیال رہے کہ انھیں کو تمھارے رازداروں کا مرتبہ ملنا چاہیے۔ کبھی دشمن کی طرف سے کوئی چیلنج آئے تو ان کی مدد حاصل کرو۔ اور جب مہم تمام ہو جائے تو انھیں ان کے ملک کو واپس کر دو۔ اگر وہ غیر ملک میں زیادہ ٹھہرے تو وہاں کی

خصلتیں اختیار کرلیں گے اور (آخری بات یہ ہے کہ) مجھے قریش میں بس تین آدمیوں کی طرف سے (تمھاری مزاحمت کا) اندیشہ ہے حسین بن علی، عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر ـــــ عبداللہ بن عمر کا جہاں تک سوال ہے تو دین (کی شدّت) نے انھیں بالکل توڑ ڈالا ہے وہ (اپنی ذات سے) تمھارے مقابل کسی شئی کے خواہاں نہ ہوں ہونگے۔ رہے حسین بن علی تو وہ ذرا ہلکے آدمی ہیں اور میرا خیال ہے کہ جن لوگوں نے ان کے باپ کو قتل کیا اور ان کے بھائی کو بے سہارا چھوڑا انھیں کے ذریعہ اللہ تمھاری طرف سے بھی ان کو کافی ہوجائے گا۔ اور یہ یاد رکھنا کہ ان کا بہت قریبی رشتہ ہے، بہت بڑا حق ہے اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی قرابت ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اہل عراق انھیں میدان میں لائے بغیر چھوڑ دیں گے۔ اگر ایسا ہوا اور تم ان پر قدرت پاؤ تو درگذر کرنا کیونکہ اگر میرے اور ان کے درمیان ایسی صورت پیش آتی تو میں درگزر ہی کرتا اور ہاں وہ جو ابن زبیر ہے وہ زبردست داؤں باز ہے۔ وہ سامنے آجائے تو کسر نہ چھوڑو، ہاں اگر صلح چاہے تو ضرور صلح کرلینا اور اپنی قوم (قریش) کا خون جہاں تک تم سے ہوسکے اس کو بہنے سے بچانا۔[1]"

بہرحال ان اختلاف کرنے والے تین حضرات کے بارے میں جو حضرت معاویہ کی وفات تک زندہ تھے، تاریخی روایات کے مطابق حضرت معاویہ نے یزید کو کچھ وصیت کی تھی اور یہ قرین قیاس بھی ہے۔[2]

---

[1] طبری ج ۶ صفحہ ۱۸۰ [2] "خلافت معاویہ و یزید" کے مصنف جناب محمود احمد عباسی مرحوم نے ایسی کسی وصیت سے انکار کرتے ہوئے ایک دوسرا وصیت نامہ اس میں درج کیا ہے جس میں یزید کی خلافت سے کسی کے اختلاف یا اختلاف کرنے والے حضرات کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک یہ مرحوم کے اس غلو کا نتیجہ ہے جو ان کی تصنیف پر چھایا ہوا ہے اور جس کے نتیجے میں وہ بعض قطعی طور پر ناقابل انکار باتوں سے بھی انکار کی کوشش کرجاتے ہیں۔ وہ یہ نہیں ماننا چاہتے کہ یزید کی ولیعہدی کے مسئلے میں جو حضرات اختلاف کررہے تھے اس کی کچھ اہمیت تھی اس لئے اختلاف سے متعلق جو بیانات بدیہی طور سے ناقابل قبول تھے اور ہم نے بھی ان کو رد کیا، ان کی (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

مخالفین سے بیعت کا مطالبہ

والد کے انتقال کی خبر پاکر یزید کے دمشق پہنچنے کا ذکر گزشتہ باب میں آچکا ہے، اس خطبے سے فراغت کے بعد، جو بطور امیرالمومنین انہوں نے دمشق پہنچ کر دیا،[1] مورخین کے بیان کے مطابق ان کا پہلا کام یہ معلوم ہوتا ہے کہ مدینے کے گورنر ولید[2] بن عقبہ بن ابی سفیان (یعنی اپنے چچا زاد بھائی کو) حضرت معاویہؓ کی وفات کی اطلاع بھیجی اور ساتھ ہی یہ حکم بھی کہ عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر، اور حسین بن علی سے بیعت لی جائے۔ لیکن دو مختلف قسم کی روایتیں اس بارے میں ہیں، ایک روایت کہتی ہے:۔

امابعد فخذ حسینا وعبد اللّٰہ	کہنا یہ ہے کہ حسینؓ عبداللہ بن عمر اور
بن عمر وعبد اللّٰہ بن الزبیر	عبداللہ بن زبیر کو بیعت کیلئے پکڑو اس
بالبیعۃ اخذاً اشد یداً لیست فیہ	سختی کے ساتھ کہ اس میں کوئی نرمی
رخصۃ حتیٰ یبایعوا . والسلام[3]	نہیں حتیٰ کہ بیعت کریں۔

لیکن اس سخت ہدایت کے برخلاف ولید کا برتاؤ اس روایت میں اس قدر نرم دکھایا گیا ہے کہ وہ اپنے سے پیشتر کے اور جہاندیدہ گورنر مروان بن الحکم کو اس حکم کی تعمیل میں مشورے کے لیے بلاتا ہے کیونکہ اس پر اس حکم کی تعمیل بھاری ہو رہی ہے۔ اور یہ مشورہ پاتا ہے کہ

(صفحہ گذشتہ کا بقیہ) تردید مرحوم نے اس انداز سے کی کہ اختلاف کی مکمل کہانی ہی اس تردید میں لپیٹ جائے اور پھر جہاں حضرت معاویہ کی وصیت نے اختلاف کی کہانی میں از سر نو جان ڈالدی وہاں انہوں نے اسطرح اسکی تردید کر دی کہ وصیت کے اس مضمون کو بغیر کسی ثبوت، بحث اور قرینے کے جعلی بتا کر ایک دوسرا وصیت نامہ البدایہ والنہایہ کے حوالہ سے درج کر دیا اس وصیت نامہ میں مضمون کے اعتبار سے کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ اس سے اختلاف کرنیکی ضرورت سمجھی جائے مگر جس وصیت کا (جو کہ طبری کی روایت ہے، اور البدایہ والنہایہ میں بھی منقول ہے) عباسی صاحب انکار کرنا چاہتے ہیں اس کے انکار کی کوئی معقول وجہ جبتک نہ ہو اس وقت تک انکار کا کوئی وزن تو نہیں ہو سکتا۔ [1] یہ بھی گذشتہ باب میں نقل ہو چکا ہے۔ [2] یزید کا چچا زاد بھائی۔

---

[1] خلافت معاویہ ویزید طبع چہارم۔ کراچی۔ جون ۱۹۶۲ء۔ | [3] طبری ج ۶ ص ۱۸۸۔

عبداللہ بن عمر کی بات تو کچھ ایسی نہیں ہے البتہ باقی دو کو اسی وقت بلاؤ اور بیعت نہ کریں تو گردن اڑا دو۔ اور جب تک بیعت نہ کرلیں یہ بھی مت بتاؤ کہ معاویہ کا انتقال ہوگیا ہے۔ ورنہ ان کا حوصلہ بڑھ جائے گا[1]۔ یزید کے سخت حکم اور مروان کے سخت ترمشورے کے باوجود روایت یہ کہتی ہے کہ ولید نے کوئی سختی نہیں کی۔ حضرت ابن عمر کو تو بالکل ہی چھوڑ دیا البتہ حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت حسین کو بلانے کے لیے آدمی بھیجا۔ عبداللہ بن زبیر تو اس وقت آئے نہیں مگر حضرت حسین آگئے۔ اور حضرت معاویہ کی وفات پر تعزیتی کلمات کہہ کر مطالبۂ بیعت کے سلسلے میں یہ عذر پیش کیا کہ:-

فان مثلی لا یعطی بیعتہ سرًا ولا	میرا جیسا آدمی تو خفیہ بیعت نہیں کیا
اراك تجتزیٔ بھا منی سرًا	کرتا اور نہ میں سمجھتا ہوں کہ مجھ جیسے
دون ان تظھرھا علی رؤس	سے سری بیعت کو تم کافی سمجھو گے۔ ضرورت ہے
الناس علانیۃ فاذا خرجت	کہ یہ علانیہ سب لوگوں کے سامنے ہو بس
الی الناس فدعوتھم الی	جب تم سب لوگوں کے واسطے بیعت کو
البیعۃ دعوتنا مع الناس	باہر نکل کر بیٹھو گے ہم کو بلوالینا۔ اس طرح
فکان امرًا واحدًا[2]	سب کام ساتھ ہو جائے گا۔

اور یہ عذر ولید نے بلا حیل وحجت قبول کر لیا۔

فقال لہ الولید وکان یحب	پس ولید جو عافیت پسند تھا اس نے کہا
العافیۃ، فانصرف علی اسم اللہ	ٹھیک ہے اللہ کے نام پر آپ جائیے۔
حتیٰ تاتینا مع جماعۃ الناس[3]۔	اور پھر لوگوں کے ساتھ آجائیے گا۔

اسی واقعہ کی دوسری روایت

طبری کی اس روایت کے برعکس ابن کثیر نے محمد بن سعد کے حوالے سے یہ روایت درج

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۸۹ [2] ایضاً ص ۱۸۹ [3] ایضاً۔

کی ہے کہ :-

"۱۵ رجب ۶۰ھ کی شب میں معاویہ کا انتقال ہوا اور لوگوں نے یزید سے بیعت کی۔ اس کے بعد یزید نے عبداللہ بن اویس عامری کے ذریعہ ولید بن عقبہ بن ابی سفیان گورنر مدینہ کو مراسلہ بھیجا کہ اپنے وہاں کے لوگوں سے بیعت لیں اور ابتداءً عمائدین قریش سے کریں ان میں بھی خاص کر حسین ابن علی کو مقدم رکھیں کہ مرحوم امیر المومنین نے مجھے ان کے بارے میں خصوصی طور پر نرمی اور صلح جوئی کی وصیت کی ہے۔ پس ولید نے آدھی رات ہی میں جب کہ یہ پیغام اسے ملا حسین اور عبداللہ بن زبیر کے پاس آدمی بھیجا اور یہ بتاتے ہوئے کہ معاویہ کی وفات ہو گئی ہے ان سے کہا کہ امیر المومنین یزید کے لیے آپ سے بیعت بھی مطلوب ہے۔ ان حضرات نے کہا کہ اس کو صبح پر رکھیے تا کہ اور تمام اہل مدینہ کا رویہ بھی ہمارے سامنے آجائے اور یہ کہہ کر حسین اٹھ پڑے اور ابن زبیر بھی ان کے ساتھ نکلے[1] اور کہا "اس یزید کو ہم جانتے ہیں نہ اس میں عزم ہے نہ مروّت"

وقد کان الولید اغلظ للحسین فشتمہ الحسین واخذ بعمامتہ فنزعہا من رأسہ فقال الولید ان ھجنا بابی عبد اللہ الا شرا فقال لہ مروان۔ او بعض جلسائہ اقتلہ فقال ان ذالک لدم مصنون بہ مصون فی بنی عبد مناف[2]۔	اور یہ بات یوں ہوئی کہ ولید نے حسین کے ساتھ سخت کلامی کی تھی پس حسین نے بھی اسکو سخت سست کہا اور اس کے سر سے عمامہ کھینچ لیا.......... اس پر مروان یا کوئی مصاحب بولا کہ گردن ماردینی چاہیئے۔ ولید نے کہا کہ نہیں، بنی عبد مناف کا یہ خون بڑا قیمتی اور قطعی محفوظ ہے۔

[1] اس روایت کے مطابق دونوں حضرات ولید کے پاس آگئے تھے۔ مگر طبری کی روایت کے مطابق حضرت حسین آئے اور یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ [2] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۶۳۔

اس روایت میں معاملہ برعکس نظر آتا ہے کہ یزید کی طرف سے نرمی کی خصوصی ہدایت ہو رہی ہے، مگر ولید زرش کلامی سے پیش آتا ہے۔ لیکن آخر میں یہ بھی ہے کہ اس کی پگڑی کھینچ لیے جانے کا واقعہ بھی حضرت حسین کے ہاتھوں پیش آگیا اور جس پر مروان یا کسی ہم جلیس نے تلوار اٹھانے کو کہا بھی تو اس نے بالکل وہ جواب دیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے نہ صرف یزید کی ہدایت کا لحاظ تھا بلکہ وہ خود بھی حضرت حسین کے لیے کافی احترام دل میں رکھتا تھا اور یہی بات بعد کے واقعات بھی اس کے لیے ثابت کرتے ہیں، جو آگے آ رہے ہیں[1]۔

---

[1] طبری کی جس روایت کا اوپر حوالہ دیا گیا اس میں یہ بات کہ مدینے کے اموی گورنر اور یزید کے عم زاد ولید بن عتبہ بن ابی سفیان حضرت حسین کے لیے نہایت گہرا احترام دل میں رکھتے تھے اور زیادہ کھل کر آئی ہے اس میں ہے کہ ولید نے جب حضرت حسین کے عذر پر کہا کہ درست ہے، آپ تشریف لے جائیں کل ہی کو سب لوگوں کے ساتھ زحمت دی جائے گی تب مروان نے فوراً ہی کہا کہ "کیا غضب کرتے ہو، یہ اگر اس وقت نکل گئے تو بہت بڑے کشت و خون کے بغیر بیعت کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔" اس پر بھی جب ولید نے اپنا رویہ نہ بدلا اور حضرت حسین کو جانے ہی دیا تب مروان نے پھر ولید سے اپنی بات دہرائی کہ تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے، اب یہ قابو میں آنے والے نہیں۔ تب بھی ولید کے الفاظ طبری نے جواب میں یہ نقل کیے ہیں:-

ویحُ غیرك یامروان انك قد	تیرا بھلا ہو مروان تو نے میرے لیے وہ بات پسند کی
اخترت لی التی فیها هلاك دینی	جس میں میرے دین کی بربادی ہے۔ بخدا پوری
واللّٰه ما احبُّ ان لی ماطلعت علیه	دنیا جس پر سورج طلوع و غروب ہوتا ہے اس کا
الشمس وغربت عنه من مال	ملک و مال بھی مجھے ملتا ہو تو قتل حسین کے بدلے
الدنیا وملکها وانی قتلت حسیناً	میں مجھے یہ پسند نہ ہوگا۔ سبحان اللہ میں حسین کو
سبحان اللّٰه اقتل حسیناً ان قال	بس اس بات پر قتل کردوں کہ وہ بیعت نہیں
لا اُبایع واللّٰه انی لا اظن ان امرأً	کر رہے ہیں۔ واللہ میرا خیال ہے کہ جس کسی شخص
یحاسب بدم حسین لخفیف المیزان	کو خون حسین کا حساب دینا پڑا وہ قیامت میں
عند اللّٰه یوم القیامة۔ (طبری ج ۲، صفحہ ۱۹۰-۱۸۹)	ہلکی میزان والا ثابت ہوگا۔

نتیجۂ بحث

پس حضرت معاویہ کی وصیت کی روشنی میں، ابن سعد کی روایت کی روشنی میں — جو یزید کی طرف سے نرمی کی ہدایت دکھاتی ہے — اور ولید کے اس رویّہ کی روشنی میں جس کی گواہی طبری کی پوری روایت دیتی ہے اور ابن سعد کی روایت کا آخری حصّہ دے رہا ہے ہمارے لیے انصاف پسندی کی رو سے مناسب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ طبری کی روایت میں یزید کی طرف سے جو سختی کی ہدایت پائی جاتی ہے اور ابن سعد کی روایت میں ولید کی طرف جو سخت کلامی منسوب کی گئی ہے، ان دونوں باتوں کو الحاقی کارروائی سمجھا جائے۔ رجب ۶۰ھ سے لیکر محرّم ۶۱ھ تک جبکہ حضرت حسین کا سانحۂ شہادت پیش آیا، ہمیں طبری کی اس ایک موقع کی روایت کے سوا کوئی دوسری روایت نہیں ملتی جو حضرت حسین کے بارے میں یزید کے سخت رویّہ کی شہادت دیتی ہو، حالانکہ وہ اس دوران میں یزید کی بعیت سے بچ کر مدینے سے مکّے چلے گئے، پھر مکّے میں چار پانچ مہینے مقیم رہے جس میں کوفے جانے کی تیاری ہوتی رہی، حتیٰ کہ پھر کوفے کا سفر بھی شروع ہو گیا۔ مگر سمجھانے بجھانے کی کوشش کا ذکر تو یزید اور اس کے حکّام کے بارے میں ملتا ہے، سختی یا داروگیر کا قطعاً نہیں ملتا جبکہ اس کے برعکس حضرت عبداللہؓ بن زبیر کے ساتھ اُسی دن سے جس دن سے وہ حضرت حسین کی طرح مدینے سے مکّے کے لیے نکلے ہر طرح کی سختی کی ہدایتیں یزید کی طرف سے چلتی رہیں۔ اور اس کے حُکّام کی طرف سے داروگیر کی کوششیں مسلسل ہوتی رہیں۔ جیسا کہ آگے آئیگا۔

امام باقرؒ کی روایت

اور کسی کی نہیں خود حضرت امام باقر کی روایت بھی اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ یزید کی بعیت کے سلسلے میں حضرت حسین پر کوئی سختی روا نہیں رکھی گئی۔ ابن جریر طبری

اپنی سند بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :-

قال حدّثنا عمار الدّھنی قال	ہم سے عمّار دہنی نے بیان کیا کہ میں
تلت لابی جعفر حدّثنی	نے ابو جعفر (امام باقر) سے عرض کی کہ
بمقتل الحسین کانی حضرتہٗ	مجھے قتل حسین کا قصہ اس طرح سنائیے
قال مات معاویۃ والولید بن	کہ جیسے میں وہاں موجود تھا، اسپر آپنے
عتبۃ بن ابی سفیان علی المدینۃ	فرمایا معاویہ کا انتقال ہوا اور ولید بن
فارسل الی الحسین بن علی	عتبہ بن ابی سفیان اس وقت حاکم مدینہ
لیأخذ بیعتہٗ فقال لہٗ اخّرنی	تھے پس انہوں نے یزید کی بیعت کیلئے
وارفق فاخّرہٗ فخرج الیٰ	حسین کو بلاوا بھیجا۔ آپ نے کہا کہ ذرا
مکّۃ [1]	مؤخر کردو اور نرمی برتو، اس نے مؤخر
	کردیا تب آپ مکّے کے لیے نکل گئے

مکّہ کو روانگی

بہرحال حضرت حسین کی فرمائش پر کہ بیعت کا معاملہ مؤخر کردیا جائے (کیونکہ ان کا جیسا آدمی تنہائی میں بیعت کرے یہ کوئی مناسب بات نہیں بلکہ جب تمامی اہلِ مدینہ بیعت کے لیے بلائے جائیں اسی وقت وہ بھی آجائیں گے اور سب کام ساتھ ہی ہوجائیگا) ولید نے آپ کو رخصت کی اجازت دیدی اور آپ نے جیسا کہ ابھی حضرت امام باقر کی روایت سے گزرا مکہ کی راہ لے لی۔ مکہ کو آپ کی یہ روانگی ۲۷ یا ۲۸ رجب ۶۰ھ یکشنبہ کی رات میں ہوئی [2]

اوپر طبری کے حوالے سے گزر چکا ہے کہ ولید نے حضرت عبداللہ بن عمر کو تو چھوڑ دیا

---

[1] طبری ج ۲ ص ۱۹۴ [2] ایضاً ص ۱۹۰ ۔

تھا۔ مگر حضرت حسین اور حضرت عبداللہ بن زبیر کے پاس بیک وقت آدمی بھیجا تھا، جس پر حضرت حسین نے تو اسی وقت ولید سے ملنے کا فیصلہ کر لیا اور تشریف لے گئے مگر حضرت زبیر نے اس کو مصلحت نہ جانا اور پھر بار بار تقاضوں کو ٹالتے ہوئے رات ہی میں مکہ کے لیے نکل گئے اور پھر اگلی رات میں حضرت حسین نے بھی مکّے کی راہ لی[1]۔ طبری میں ہے کہ ابن زبیر کے نکل جانے کی وجہ سے حکومت کی تمام تر توجہ چونکہ ابن زبیر کی تلاش پر مرکوز رہی اس لیے اس صبح کو وہ حضرت حسین کی طرف توجہ ہی نہ کر سکے اور شام کو جب توجہ کی تو آپ نے فرمادیا کہ اب تو رات ہو رہی ہے صبح کو دیکھیں گے اور پھر اسی رات آپ بھی مکے کیلئے نکل گئے[2]۔

پورے کنبے کے ساتھ

بتایا گیا ہے کہ حضرت حسین نے اپنے پورے گھرانے کو ساتھ لیا۔

خرج ببنیه واخوته وبنی	آپ نکلے اپنے بیٹوں اور بھائیوں اور بھتیجوں
اخیه وجُلّ اهل بیته	کے ساتھ اور گویا تمام کنبہ ہی ساتھ تھا
الّا محمد بن الحنفیة۔[3]	سوائے بھائی محمد بن حنفیہ کے۔

جبکہ حضرت عبداللہ بن زبیر نے (غالباً وقت کی تنگی اور اندیشوں کی زیادتی کی وجہ سے) صرف ایک بھائی جعفر بن زبیر کو ساتھ لے کر سفر کیا۔ ان کے بارے میں یہ بھی تصریح کی گئی ہے کہ

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۹۰، ابن اثیر ج ۳ ص ۲۶۴، ابن اثیر نے طبری کی مذکورہ روایت کو جن الفاظ میں درج کیا ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بلانے کا واقعہ دن میں پیش آیا تھا اور ابن زبیر اسی رات کے آخری حصہ میں مکے کیلئے نکل گئے۔ ابن کثیر کی روایت جو اوپر درج کی گئی اس کی رو سے بلاوا آدھی رات کو ہوا تھا اور پھر اگلی رات کو ابن زبیر مدینے سے نکلے۔ اور چونکہ یہ مسلّم ہے کہ حضرت حسین ان سے ایک رات بعد نکلے ہیں اسلیے گویا حضرت نے بلاوے کے بعد دو دن اور ایک رات مدینے میں گزاری۔ طبری کے الفاظ صاف نہیں ہیں اسلیے ہماری نظر میں ترجیح ابن اثیر کے بیان کو ہے۔

[2] ایضاً۔ [3] ایضاً۔

"طریق اعظم" (شاہراہ) سے بچ کر ایک ذیلی راستے (طریق الفرع) سے سفر کیا تھا اور یہ کہ جیسے ہی پتہ چلا کہ وہ مدینے سے نکل گئے ہیں اور اندازہ کیا گیا کہ سوائے مکّہ کے اور کہیں نہیں جا سکتے تو تقریباً اسّی سواروں کے ایک دستے کے ذریعہ ان کی تلاش اور تعاقب کیا گیا مگر چونکہ وہ عام راستے سے نہیں بلکہ غیر معروف راستے سے گئے تھے اس لیے تعاقب ناکام رہا۔[۱]

شاہراہ سے سفر

حضرت عبداللہ بن زبیر کے بارے میں متقابلانہ انداز سے کی گئی اس تصریح سے کہ انھوں نے مکہ اور مدینہ کی شاہراہ (طریق اعظم) سے بچ کر کسی ذیلی اور اجنبی راہ کو اپنایا، از خود بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت حسینؓ نے بچ بچا کر جانے کے بجائے عام راستے سے سفر کیا، مزید برآں چند صفحوں کے بعد طبری کی ایک روایت میں اس کی تصریح بھی آتی ہے کہ آپ کے اہل بیت نے مشورہ دیا تھا کہ شاہراہ سے بچ کر سفر کیا جائے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن زبیر نے کیا مگر آپ نے اسے منظور نہ فرمایا اور کھلی شاہراہ سے ہی سفر کیا۔[۲] آپ کے سفر کے سلسلے میں کسی تعاقب کا ذکر نہیں ہے۔ ۳ شعبان ۶۰ھ شب جمعہ میں آپ بخیر و عافیت پورے قافلے کے ساتھ مکہ معظمہ پہنچ گئے۔[۳]

خیر خواہوں اور عقیدتمندوں کے مشورے

۱۔ اوپر ذکر آیا کہ حضرت حسین کے قافلے میں آپ کے بھائی محمد بن حنفیہ[۴] ساتھ نہیں ہوئے، اس روایت میں وہیں ان کی زبان سے یہ بھی کہلوایا گیا ہے کہ :-

---

[۱] طبری ج ۶ ص ۱۹۰ [۲] طبری ج ۶ ص ۱۹۶ [۳] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۵۸۔ [۴] حضرت حسین کے یہ بھائی حضرت فاطمہؓ سے نہیں بلکہ حضرت علیؓ کی ایک دوسری اہلیہ سے تھے۔

"اے جانِ برادر، آپ مجھے دنیا میں سب سے بڑھ کر عزیز ہیں، آپ سے زیادہ اور کوئی نہیں ہے جس کے لیے خیر خواہی بچا کر رکھوں۔ میری گذارش ہے کہ آپ جا تو رہے ہیں مگر ایک دم سے کسی شہر کا ارادہ مت کیجئے گا بلکہ شہروں سے دور رہتے ہوئے اپنے آدمی مختلف علاقوں میں بھیجئے اور اپنی بیعت کی دعوت دیجئے اگر لوگ قبول کرلیں تو اللہ کا شکر کریں۔ نہ قبول کریں اور آپ کے بجائے کسی دوسرے پر اتفاق کرلیں تو اس سے نہ آپ کے دین کو کوئی بٹہ لگے گا نہ عقل کو اور نہ آپ کی شان و منزلت میں کوئی فرق آئے گا۔ مجھے ڈر ہے کہ مبادا آپ بڑے شہروں میں سے ہی کسی شہر کا رخ کریں اور پھر وہاں کے لوگوں میں دو گروہ ہو جائیں اور جنگ برپا ہو جس کا پہلا نشانہ خود آپ ہی بن جائیں۔۔۔۔۔۔۔
کسی شہر میں اگر جانا ہے تو بس مکے کا رخ کریں، وہاں حالات اگر آپ کے لیے اچھے ہیں تو فبہا ورنہ پھر سفر اور صحرا نوردی کے لیے کمر باندھ لیجئے۔ شہروں سے دور رہتے ہوئے علاقہ در علاقہ گھومیے۔ حتیٰ کہ پتہ چلے کہ حالات کیا ہیں، لوگ کیا سوچ رہے ہیں۔ اس کے بعد جو رائے قائم ہوگی وہی صحیح رائے ہوگی۔ صحیح اور دانشمندانہ رائے وہی ہوتی ہے جو حالات کی چھان بین کے بعد قائم کی جائے اس کے برعکس جو رائے حالات کی طرف پشت کرتے ہوئے قائم کی جائے اس سے زیادہ باعث پریشانی کوئی دوسری رائے نہیں ہو سکتی۔"[1]

اگر یہ روایت صحیح ہے تو ایک طرف پختہ کاری اور دانشمندی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ دوسری طرف ایک چھوٹے بھائی کی طرف سے مشاورت اور اظہار رائے میں حسن ادب اور لطافت بیان کا بھی بہترین نمونہ۔ حضرت محمد بن حنفیہ حضرت حسن و حسین کے تیسرے بھائی ہیں شجاعت اور جسمانی طاقت میں اپنے والد ماجد کے خلف تھے۔ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کے لیے

---

[1] طبری ج ۶ صفحہ ۱۹۱-۱۹۰ (قدرے اختصار کے ساتھ)

بیحد محبت اور خلوص رکھتے تھے۔ جنگ جمل اور جنگ صفین میں جہاں تینوں بھائی حضرت علی کے دوش بدوش ہوتے تھے وہاں حضرت علی خود جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں پھولوں (رَیحانتیَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی حفاظت پر نظر رکھتے تھے وہاں محمد بن حنفیہ کو بھی ہدایت فرماتے کہ ان کو اپنے سے جدا اور آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دینا۔ حالانکہ وہ عمر میں چھوٹے تھے مگر جسمانی طاقت اور قد و قامت میں غیر معمولی جس کے بعض یادگار قصے ہیں، مذکورہ بالا عبارت میں حسنِ ادب اور لطافتِ بیان کے پردے میں صاف جھلک رہا ہے کہ وہ حضرت حسینؓ کے اندر خیالات کے طوفان کو سمجھ رہے ہیں اس طوفان کے اندر کوفے کی سمت سفر بھی انھیں نظر آ رہی ہے، جبکہ وہ دونوں باتوں کے حق میں نہیں ہیں۔ مگر اس انداز سے حقِ خلوص اور امانتِ مشورہ ادا کرتے ہیں کہ ادب اور لطافت بلائیں لیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت محمد بن حنفیہؒ حضرت حسنؓ کے ہم رائے تھے اور پختگی کے ساتھ رائے قائم کر چکے تھے کہ ان کے والد کی شہادت حالات کے جس دھارے میں ہوئی ہے اسکو سامنے سے روکنے اور موڑنے کی کوشش میں نقصانات ہیں فائدہ کوئی نہیں[1] چنانچہ آپ نہ صرف یہ کہ حضرت حسینؓ کے ساتھ نہیں نکلے بلکہ اپنی اولاد میں سے بھی کسی کا نکلنا پسند نہیں کیا[2]۔ اور اس سے بھی آگے کی بات یہ ہے کہ جب شہادتِ حسینؓ کے تین سال بعد تقریباً پورا

---

[1] حضرت عائشہؓ صدیقہ کو حُجر بن عدی کے قتل کی خبر پہنچائی گئی (جو حضرت معاویہؓ پر کیے جانے والے اعتراضات میں سے ایک بہت نمایاں اعتراض ہے) آپؓ کو اس خبر سے بہت صدمہ ہوا مگر ساتھ ہی یہ فرمایا کہ اگر یہ بات نہ ہوتی کہ ہم نے جس برائی کو بھی روکنے اور بدلنے کی کوشش کی نتیجہ میں اس سے بھی بڑی برائی پیدا ہو گئی تو حُجر کے قتل پر بھی ہم کچھ کیے بغیر نہ رہتے۔" لولا انّا لم نغیّر شیئًا الاصارت بنا الامور الی ما ھوا شدّ منہ لغیرنا قتل حجر"۔ (ابن اثیر ج ۳ ص ۲۴۲) بظاہر یہی نقطۂ نظر حضرت حسنؓ اور حضرت محمد بن حنفیہؒ کا تھا۔ حُجر بن عدی کے قتل پر حضرت عائشہؓ کا مذکورہ تأثر ذکر میں آ جانے کے بعد یہ بات بھی ذکر کر دینا مناسب ہے، کہ اس قتل کے سلسلے میں حضرت عائشہؓ نے حضرت معاویہؓ کا یہ عذر قبول کر لیا تھا کہ" حجر کی زندگی سے جس فتنہ و فساد کا اندیشہ تھا اس کا سدِّباب انکی ایک جان کے مقابلے میں زیادہ قابلِ لحاظ تھا۔ (حوالہ سابق)، [2] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۶۵

مدینہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے زیر اثر یزید کے خلاف بغاوت کا علم اٹھا کے کھڑا ہوگیا تب بھی حضرت محمد بن حنفیہ ہی اہل مدینہ میں سے وہ تیسرے بزرگ تھے جن کا نام حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ آتا ہے کہ وہ صاف طور پر اس بغاوت کے مخالف رہے۔ تیسرا نام حضرت زین العابدین بن علی بن الحسینؓ کا بھی اسی فہرست میں ہے[1]

ایک اور روایت

البدایہ والنہایہ میں مزید برآں ایک روایت اور ہے کہ مکے پہنچنے کے بعد حضرت حسینؓ نے کسی کو مدینے بھیجا تاکہ بنی عبدالمطلب میں سے جو افراد ان کے ساتھ آنے سے رہ گئے ہیں وہ بھی آجائیں۔ چنانچہ جن کو آنا تھا وہ آئے اور بعد ازاں حضرت محمد بن حنفیہ بھی (غالباً حج کے موقع پر) مکہ تشریف لے آئے۔

فادرك حسيناً بمكة فاعلمه ان	اور وہاں حسینؓ کو موجود پایا تو ان سے کہا
الخروج ليس له براي يومه	کہ ان کی رائے میں اس وقت خروج کا خیال
هذا فابى الحسين ان يقبل	بالکل مناسب نہیں ہے (یعنی یزید کے خلاف
فحبس محمد بن حنفية ولده	اقدام کے خیال سے کوئی کا ارادہ) حسین
فلم يبعث احداً منهم حتى	نے یہ رائے قبول نہیں کی۔ اور محمد بن حنفیہ نے
وجد الحسين في نفسه على محمد	اپنی اولاد میں سے کسی کو ان کے ساتھ
وقال ترغب بولدك عن	نہیں بھیجا جس پر حسین کو ان سے رنج
موضع أصاب فيه، فقال وما	ہوا اور کہا کہ تم اپنی اولاد کو میری جان سے
حاجتي الى ان تصاب ويصابون	زیادہ عزیز رکھ رہے ہو؟ آپ نے جواب
معك وان كانت مصيبتك	دیا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں تو آپ

[1] دیکھئے ۶۳ھ کے واقعات کا بیان۔ البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۲۱۸۔

اعظم عند نا منهم [1] | اور کیوں وہ آپ کے ساتھ مصیبت میں پڑیں۔ اگرچہ یہ اپنی جگہ واقعہ ہے کہ آپ کی مصیبت میرے لیے انکی مصیبت سے بڑھ کر ہے۔

دونوں روایتوں کے لہجے کا فرق

طبری کی روایت میں جو لطافتِ اظہار اور حسنِ ادب ہم نے محسوس کیا تھا البدایہ والنہایہ کی اس روایت کا لہجہ اس سے بالکل مختلف ہے، ہوسکتا ہے اس میں کچھ دخل کسی راوی کی بے احتیاطی کا ہو لیکن فی نفسہٖ لہجے کے فرق کی وجہ سمجھنا کچھ ایسا مشکل بھی نہیں ہے، پہلی روایت کا لہجہ اس وقت کا ہے جب حضرت حسینؓ کا مدینہ چھوڑنا ان کی سلامتی کیلئے ضروری یا کم ازکم مناسب سمجھا جاسکتا تھا اور مکّہ سے بہتر کوئی جگہ اس کے لیے نہیں ہوسکتی تھی؛ چنانچہ حضرت محمد بن حنفیہ نے مکّے ہی کا مشورہ دیا تھا۔ کوفے کے ارادہ کی بات حضرت محمد بن حنفیہ کے لیے اس وقت بس ایک اندیشے اور امکان کے درجہ کی تھی۔ چنانچہ آپ نے کافی سمجھا کہ اشاروں کنایوں کے لطیف انداز میں اس کے خلاف رائے دیدی جائے۔ مگر اس دوسری روایت والی گفتگو کا وقت وہ ہے جب حضرت محمد بن حنفیہ دیکھتے ہیں کہ حضرت حسینؓ ان کے بیحد مخلصانہ، محبّانہ اور دور اندیشانہ مشورے کو نظر انداز کر کے نہ صرف خود کوفے کا عزم کر رہے ہیں بلکہ خاندان کے چھوٹے بڑے اور عورت مرد ہر فرد کو ساتھ لیے جارہے ہیں — جو ان کے نزدیک موت کے منہ میں جانے والی بات تھی — تو ان کی شدتِ خلوص کا تقاضا اب یہ ہوا کہ لہجے کی ادبی لطافتیں ہٹا کر بے لوچ صراحت سے کام لیا جائے جو شاید کام کر جائے۔ محبت کرنے والا چھوٹا اگر بڑے کو موت کے منہ میں جاتا ہوا دیکھے گا تو ذرا البعید نہیں کہ وہ

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۶۵

اس انجام کو روکنے کے لیے بے ادب صاف گوئی کی جرأت بھی کر جائے۔ بعض روایتیں بتاتی ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ بڑے ہونے کے باوجود حضرت حسنؓ و حسینؓ کے نسبی احترام میں چھوٹے بن جایا کرتے تھے مگر آگے آئیگا کہ جب دیکھا کہ حضرت حسینؓ ان کی سنتے ہی نہیں ہیں، خاص کر یہ کہ عورتوں بچوں کو چھوڑنے کے مشورہ پر بھی توجہ نہیں کرتے تو حضرت ابن عباسؓ کے خلوص اور غمخواری کا لہجہ بھی ایسا ہی تیز اور تیکھا ہو گیا تھا ـــــ بہر حال یہ تو قطعی واقعہ ہے کہ حضرت ابن حنفیہ کی اولاد میں سے کوئی فرد حضرت حسینؓ کے قافلے میں شامل نہیں تھا۔ اور یہ خود ایک سخت موقف کی دلیل ہے۔

۲ـــ طبری کے سلسلۂ روایات میں دوسرا نام حضرت عبداللہ بن مطیع کا آتا ہے۔ یہ اُن کم عمر صحابہؓ میں ہیں جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں سن تمیز کو نہیں پہنچ پائے تھے۔ یعنی حضرت حسینؓ سے کچھ چھوٹے تھے۔ واقعۂ کربلا (سنہ ۶۱ھ) کے بعد سنہ ۶۳ھ میں جو واقعۂ حرہ پیش آیا ہے۔ جو یزید کے خلاف اہل مدینہ کی بغاوت اور معرکہ آرائی کا نام ہے اس کے دو[۱] نمایاں قائدوں میں سے ایک یہی عبداللہ بن مطیع تھے۔ اس معرکہ کی ناکامی کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے پاس مکے چلے گئے اور وہاں آپؓ ہی کے ساتھ حجاج سے مقابلہ میں شہید ہوئے[۱]۔ ان عبداللہ بن مطیع کے بارے میں آتا ہے کہ جب حسینی قافلہ مدینے سے مکے جارہا تھا تو یہ بھی کہیں سے (شاید مکے ہی سے) آتے ہوئے ملے اور سفر کا قصہ جاننے کے بعد بصد ادب والحاح گزارش کی کہ کوفہ کا قصد ہرگز نہ فرمائیے گا۔ ان لوگوں کے کردار کو بھول نہ جائیے گا[۲]۔

۳۔ ابن سعد کی روایت یہ ہے کہ حضرت حسینؓ اور حضرت ابن زبیرؓ ایک ہی رات میں مدینۂ منورہ سے مکہ معظمہ کیلئے نکلے تھے۔ اس روایت کے حوالے سے ابن کثیر نقل کرتے ہیں کہ اثنائے راہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی عمرہ سے واپس آتے ہوئے ملے اور ان دونوں صاحبان سے کہا کہ:-

---

[۱] الاصابہ فی تمیز الصحابہ ج ۵ ص ۶۶-۶۵   [۲] طبری ج ۶ ص ۱۹۶

اذکر کما اللہ الاّ جعتما ان خلتما	میں اللہ کا واسطہ دیکر تم دونوں سے
فی صالح ما ید خل فیہ	کہتا ہوں کہ لوٹ چلو تاکہ جو مناسب بات
الناس ننظر فان اجتمع	اور لوگ اختیار کریں تم بھی اس کو اختیار
الناس علیہ نلم تشذ ادان	کرلو اور دیکھو۔ پھر اگر لوگ پوری طرح
افترقوا علیہ کان الذی	ایک بات پر متفق ہو گئے تو تم انحراف
تریدان [۱]	کرنیوالوں میں سے نہیں ہو گے اور اگر اختلاف
	ہوا تو تمہاری مراد پوری ہو جائیگی۔

نیز خاص طور سے حضرت حسین رضؓ سے کہا کہ :۔

"اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو اختیار دیا تھا کہ دنیا اور آخرت میں سے جس ایک کو چاہیں پسند کرلیں، آپ نے آخرت پسند فرمائی اور تم آپ ہی کا ٹکڑا اور آپ کی ذات کا حصہ ہو اسلیئے تمھیں دنیا نہ مل سکے گی۔ پس یہ ارادۂ خروج چھوڑ دو۔" یہ کہکر آپ نے حضرت حسین کو گلے سے لگایا اور رو پڑے [۲]۔"

اس سلسلۂ بیان میں آگے بتایا گیا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ رنج و قلق کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ :۔

"غلبنا حسین بن علی بالخروج" حسین بن علیؓ نے کوفے کے قصد کے معاملے میں ہماری بات مان کر نہ دی، حالانکہ انہوں نے اپنے باپ اور بھائی کا عبرت انگیز حال دیکھا تھا کہ کیسے فتنے اٹھائے گئے تھے اور عین میدان میں انکا ساتھ دینے سے انکار کر دیا گیا تھا [۳]۔ انہیں تو عمر بھر کسی خروج کا نام نہ لینا تھا اور لوگوں کے عمومی فیصلے میں شامل ہو جانا تھا اسلیے کہ جماعت میں خیر ہے [۴]۔"

---

[۱] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۶۲۔ [۲] ایضاً ص ۱۶۳۔ طبری میں یہ واقعہ اس وقت کا بتایا گیا ہے جب حضرت حسینؓ مکے سے کوفے کیلئے روانہ ہو گئے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ حج پر آئے تھے انھیں بعد فراغتِ حج یہ اطلاع ملی تو آپ تیزی سے اُن کے پیچھے روانہ ہوئے اور راہ میں مل کر یہ بات کی۔ طبری ج ۶ ص ۱۹۳۔ [۳] حضرت حسینؓ نے کربلا کے میدان میں جب اپنے بلانیوالوں ہی کو اپنے مقابل صف آرا پایا کر انھیں مخاطب کیا تو ان میں یہ دو نام بھی لیے تھے شبث ابن ربعی اور قیس ابن اشعث۔ ان میں سے شبث تو خود ان افراد میں تھا جن کی طرف حضرت ابن عمرؓ کا اشارہ ہے۔ اور قیس کے والد اشعث صفین میں ایسے سب لوگوں کے سربراہ تھے۔ حضرت حسینؓ کا خطاب آگے اپنی جگہ پر آئیگا۔ [۴] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۶۳۔

باب ہشتم

مکہّ میں ورود ۔۔۔ اہلِ کوفہ کے خطوط ۔۔۔ اور وفود

مسلم بن عقیل کا مشن

بہرحال حضرت حسینؓ شعبان ۶۰ھ کی ۴ تاریخ کو مکے پہنچ گئے اور دارِ عباسؓ میں قیام کیا[۱]۔ جیساکہ ہونا ہی چاہیے تھا آپ کے پاس لوگوں کی آمدورفت شروع ہو گئی۔ ان میں اہلِ مکہّ بھی تھے اور عمرہ وغیرہ کے لیے آنے والے بیرونی لوگ بھی۔ خبر کوفے بھی پہنچ گئی۔ اور رمضان میں وہاں سے شیعانِ علیؓ کے خطوط لیکر ان کے قاصد پہنچنا شروع ہو گئے ۔ ایک کے بعد ایک چار پانچ کھیپوں میں کم سے کم کوئی ڈیڑھ سو خطوط پہنچے جو نمایاں لوگوں کے تھے، یہ خطوط دعوتی تھے کہ آپ یہاں تشریف لے آئیے جانثاران چشم براہ ہیں۔ پہلے خط کا مضمون جو طبری نے دیا ہے اس طرح ہے :۔

"سلیمان بن صرد، مسیّب بن نجبہ، رفاعہ بن شدّاد، حبیب بن مظاہر اور دیگر شیعانِ کوفہ کی طرف سے حسین بن علیؓ کے نام ۔ بعد از سلام! خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے آپ کے دشمنِ جابر کا قصہ پاک کیا جس نے ناحق حکومت پر قبضہ کر رکھا تھا[۲]۔ اب اس وقت ہمارا کوئی امام نہیں ہے۔ آپ تشریف لے آئیے کہ شاید اللہ

---

[۱] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۶۲ ۔ [۲] بظاہر حضرت معاویہؓ کے انتقال کی طرف اشارہ ہے۔

آپ کے ذریعہ ہم لوگوں کو حق پر جمع کر دے۔ یہاں جو اموی گورنر نعمان بن بشیر ہیں ہم ان کے پیچھے جمعہ اور عید تک نہیں پڑھتے اور اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ آپ ادھر کے لیے روانہ ہو گئے ہیں تو ہم انشاء اللہ ان کا بستر باندھ کر انھیں شام بھیج دیں گے۔"[1]

اس طرح کے خطوط کی جو بارش ہوئی اور طبری کے بیان کے مطابق ہر دو دن کے فصل سے ایک کھیپ روانہ ہوئی[2] تو حضرت محمد بن حنفیہ کا ڈھکا ہوا اور عبداللہ بن مطیع کا کھلا ہوا نہایت اخلاص اور الحاح کے ساتھ مشورہ کہ کوفے کا رُخ ہر گز نہ کیجئے گا، بے اثر ہو گیا اور ان حضرات نے جس قدر زور دیکر یہ بات کہی تھی اس سے لگتا ہے کہ ان کو خطرہ بہت تھا کہ کوفے والے بلائیں گے اور حسینؓ اپنے آپ کو روک نہ پائیں گے۔ بہر حال ان بلاوں کا اثر ہوا اور تاریخ کے بیان کے مطابق آپ نے طے کیا کہ اپنا ایک آدمی کوفہ بھیج کر اطمینان کریں کہ کیا واقعی یہ لوگ جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ قابل اعتماد ہے؟

مسلم بن عقیلؓ کوفے کو

اس مقصد کے لیے آپ نے اپنے چچیرے بھائی مسلم بن عقیلؓ کا نام طے کیا اور کوفے کے جو لوگ خطوط لیکر آئے ہوئے تھے انکو اس مضمون کا جواب لکھ کر روانہ کر دیا کہ "میں اپنے چچیرے بھائی مسلم بن عقیل کو آپ لوگوں کے پاس بھیج رہا ہوں کہ یہ میرے قائم مقام بن کر حالات کو دیکھیں اور مجھے اطلاع دیں۔ پس اگر انہوں نے اطمینان ظاہر کیا اور لکھا کہ آپ لوگ جو کچھ مجھے لکھ رہے ہیں اس پر آپ کے تمام معززین اور اہل رسوخ و اہل رائے کا اتفاق ہے تو میں بلا تاخیر چلا آؤں گا۔ اس لیے کہ قسم میری جان کی امام تو وہی ہے جو کتاب اللہ پر عامل، انصاف کا خوگر، حق کا تابع اور اپنے آپ کو ذات حق سے وابستہ رکھنے والا ہو۔

---

[1] ج ۶ ص۱۹۷

والسلام[1]!،، اور فوراً ہی پھر مسلم بن عقیل کو دو کوفیوں کے ساتھ ان کے مشن پر روانہ کر دیا۔

والئ کوفہ حضرت نعمان بن بشیرؓ کا انتباہ

مسلم بن عقیل کوفہ پہنچے تو ان کی آمد زیادہ دن مخفی نہیں رہ سکی، نہ ان کی سرگرمیاں مخفی رہیں جو وہ حضرت حسینؓ کے واسطے لوگوں سے بیعتِ امامت لینے کے سلسلے میں کر رہے تھے۔ حضرت نعمان بن بشیرؓ جو انصار مدینہ میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی تھے، وہ حضرت معاویہؓ کے وقت سے کوفے کے گورنر سے چلے آرہے تھے۔ ان کو اطلاع ملی تو مسجد میں لوگوں کو جمع کرایا اور تقریر کی کہ :-

"اے لوگو فتنہ آرائی اور تفرقہ انگیزی میں مت پڑو۔ اس میں ناحق جانیں جاتی ہیں خون بہتا ہے اور مال چھنتے ہیں۔ میری پالیسی اس معاملہ میں سن لو کہ جبتک مجھ پر حملہ نہیں ہوگا میں کسی پر حملہ نہیں کروں گا، نہ تمہیں برا بھلا کہوں گا، نہ شبہے اور تہمت میں پکڑوں گا۔ لیکن تم نے اگر اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنایا، بیعت توڑی اور امام (یزید) کے خلاف کھڑے ہوئے تو قسم ہے خدائے پاک کی میں تم پر تلوار چلاؤں گا جب تک بھی میرا ہاتھ اس کے قبضہ پر رہے گا، چاہے تم میں سے کوئی بھی میرا ساتھ دینے والا نہ ہو۔ ویسے مجھے امید یہ ہے کہ تم میں وہ لوگ زیادہ ہونگے جو حق کا حق پہچانتے ہیں، بہ نسبت ان لوگوں کے جو باطل کیلئے حق کا نام لیتے ہیں[2]۔،،

امیر یزید کو شکایت

عبداللہ بن مسلم حضرمی نامی ایک صاحب جو بنی اُمیّہ کے حلیفوں میں سے تھے انھوں نے گورنر کی یہ تقریر سن کر کہا یہ تو مناسب پالیسی نہیں، نہایت کمزور پالیسی ہے جو فتنہ انگیزوں کو

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۹۸ [2] طبری ج ۶ ص ۱۹۹

تیر کردے گی۔ حضرت نعمان بن بشیرؓ اس کے باوجود بھی اپنی پالیسی میں تبدیلی کرنے کو تیار نہ ہوئے۔ بنی امیہ کے خیر خواہ نے یہ صورت حال امیر یزید کو لکھ کر بھیجی اور لکھا کہ اگر تمہیں کوفہ پر حکومت رکھنے کی ضرورت ہے تو فوراً کسی مضبوط آدمی کو یہاں بھیجو، نعمان کمزور آدمی ہیں یا دانستہ کمزوری دکھا رہے ہیں۔ اور بھی چند لوگوں نے اسی مضمون کے خط یزید کو لکھے[1]

عبیداللہ بن زیاد کا تقرر

یزید نے ان اطلاعات کے بعد اپنے اہل مشورہ کی رائے کے مطابق حضرت نعمان بن بشیرؓ کی جگہ عبیداللہ بن زیاد کا تقرر کیا۔ اس سے پہلے وہ بصرہ کا حاکم تھا۔ اب بصرے کے ساتھ کوفے کی حکومت بھی اس کے سپرد کی گئی اور ہدایت دی گئی کہ فوراً پہنچ کر مسلم بن عقیلؓ کی گرفتاری کا بندوبست کرے۔ وہ ایک جوان اور اپنے باپ کی طرح سخت گیر منتظم تھا۔ بصرے والوں کو دھمکا کر کہ کوئی شخص کسی مخالفانہ حرکت کا مرتکب نہ ہو، وہ سیدھا کوفے پہنچا اور وہاں کے لوگوں کو جمع کرکے تقریر کی کہ :-

کوفے میں تقریر

" امیرالمومنین نے تمہارے شہر اور اس کے متعلقات کا انتظام میرے سپرد کیا ہے۔ مجھے حکم دیا ہے کہ مظلوم کے ساتھ انصاف کروں، محروم کو اس کا حق دوں، اطاعت گزاروں کے ساتھ بھلائی کروں اور فتنہ پردازوں کے ساتھ سختی۔ اور سن لو کہ میں ٹھیک ٹھیک ان کے حکم کے مطابق کروں گا۔ نیکو کاروں کیلئے میں مہربان باپ کی طرح رہوں گا اور فرمانبرداروں کیلئے ہمدرد بھائی۔ میری تلوار اور میرا کوڑا صرف اسکے لیے ہے جو میرے حکم کی خلاف ورزی کرے گا۔ بس ہر آدمی اپنا بُرا بھلا سمجھ لے"[2]

---

[1] حوالہ سابق [2] الکامل فی التاریخ (از ابن اثیر) ج ۴ ص ۲۴ مطبوعہ دار صادر بیروت ۱۹۶۵ء۔

عملی کاروائی

اس تقریر کے بعد اس نے تمام لوگوں اور بالخصوص قبائل کے ذمہ داروں (چودھریوں) کو حکم دیا کہ کسی کے یہاں کوئی پردیسی ٹھہرا ہوا ہو، امیرالمؤمنین کا اشتہاری مجرم ہو یا کوئی خارجی اور مخالفِ حکومت خیالات پھیلانے والا، تو لازم ہے کہ ایسے لوگوں کے ناموں سے تحریری طور پر مطلع کیا جائے، جو کوئی ایسا کر دے گا وہ ان لوگوں کے اعمال کی ذمہ داری سے بری ہوگا۔ جو ایسا نہ کرے وہ اس بات کی تحریری ذمہ داری دے کہ اُس کے حلقے اور اس کی جماعت سے حکومت کے خلاف کسی طرح کی کوئی شورش نہیں ہوگی جو کوئی ایسا نہیں کرے گا اس سے ہم بری الذمہ ہوں گے، اس کا مال اور اس کی جان حلال ہوگی۔ جس عریف (چودھری) کے حلقے میں امیرالمؤمنین کی حکومت کا کوئی ایسا قانونی مجرم پایا گیا جس کی رپورٹ نہیں کی تھی تو اُس عریف کے دروازے پر ہی اُسے پھانسی دیجائیگی، اس کے حلقے کا وظیفہ بند کر دیا جائے گا، اور عریف کو شہر بدری کی سزا دیجائے گی۔[1]

مسلم کی تبدیلیٔ مکان

مسلم کوفہ پہنچے تھے تو مختار بن ابی عُبید کے گھر پر اترے تھے۔[2] جب ابن زیاد کوفے پہنچا اور اس کی یہ سخت آگاہی حضرت مسلم کے کان تک پہنچی تو آپ نے جائے قیام تبدیل کر دی اور ہانی بن عُروہ نامی شخص کے مکان میں آ گئے۔[3]

ایک معمّہ

ہماری جو تاریخ کی کتابیں ہیں وہ صرف روایات اور بیانات کا مجموعہ ہیں۔ اِن

---

[1] تاریخ طبری ج ۶ ص ۲۰۰ [2] ایضاً ص ۱۹۹ [3] ایضاً ص ۲۰۳

روایات میں بہت سے پہلو ایسے آجاتے ہیں جن پر کچھ گفتگو یا توضیح و توجیہہ کی ضرورت ہوتی ہے، یہ چیز ان کتابوں میں کہیں مشکل ہی سے اور وہ بھی بس نام کو ملتی ہے۔ مختار بن ابی عبید ہماری تاریخ کے اُس دور کا جس میں واقعۂ کربلا پیش آیا بڑا معروف نام اور ایک پُر اسرار کردار ہے۔ یہ شخص واقعۂ کربلا کے پانچ سال بعد ایک بجلی کے کڑکے کی طرح مسلم خانہ جنگی کے میدان میں آیا اور بس سال بھر میں ایک قیامت مچا کے گذر گیا۔ یہ خون حسین کے انتقام کے نام پر اٹھا تھا اور واقعی کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ ابن زیاد اور عمرو بن سعد وغیرہ تمام قاتلان حسین اسی کے حصّے میں آئے۔ اور اس کا تعلق بھی کوفے ہی سے تھا۔ اس لیے قدرتی طور پر خیال ہوتا ہے کہ یہ مختار بن ابی عُبید جس کے گھر پر مسلم بن عقیل ٹھہرے تھے یہ وہی مختار تو نہیں ہے؟ ۔ لیکن پھر خیال ہوتا ہے کہ یہ وہی مختار کیسے ہو سکتا ہے؟ اس نے تو حضرات حسنین رضؓ کے ساتھ بڑے ہی خراب کردار کا ثبوت دیا تھا جبکہ حضرت علی رضؓ کے بعد حضرت حسن رضؓ جانشین ہوئے تھے، حضرت علی رضؓ کی شہادت ایسے وقت پیش آئی جبکہ آپ نے حضرت امیر معاویہ سے ایک فیصلہ کن جنگ کی تیاری کی ہوئی تھی۔ اُس چالیس ہزار کی فوج کو لے کر جو حضرت علی رضؓ نے تیاری کی تھی حضرت حسن رضؓ روانہ ہوئے تو مدائن کے قریب پڑاؤ تھا کہ لشکر کے کچھ مفسد ایک افواہ کا بہانہ پاکر حضرت حسن رضؓ کے خیمہ ہی پر ٹوٹ پڑے، لوٹ مار مچائی، زخمی کر دیا۔ مدائن میں حضرت علی رضؓ کی طرف سے حاکم اس مختار کے چچا سعد بن مسعود ثقفی تھے۔ یہ واقعہ پیش آنے کے بعد حضرت حسن رضؓ مدائن میں اُن کی قیام گاہ پر آگئے تو جیسا کہ تاریخ کا بیان ہے، مختار نے خالص "کوفی" روایت کے مطابق، چچا سے کہا کہ "چچا اگر دولت اور عزّت کی ضرورت ہو تو انھیں باندھو اور معاویہ کے پاس پہنچا دو"۔ چچا شریف تھے، انھوں نے کہا کہ تجھ پر خدا کی لعنت۔ ابن بنت رسول اللہ کے ساتھ میں یہ حرکت کروں گا۔"[1]

---

[1] طبری ج ۶ ص ۹۲ اس شخص کا کیریکٹر واقعتہً یہی تھا یعنی دولت و عزت کیلئے سب کچھ روا ہے۔ چنانچہ اوّلا اس نے عبداللہ بن زبیر کے ساتھ اقتدار میں حصّہ بٹانے کی کوشش کی جبکہ وہ اموی حکومت سے برد آزما تھے (باقی آئندہ صفحہ پر)

ایک اور معمّہ

اس قصّے کے علاوہ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ جن لوگوں نے حضرت حسینؓ کو خطوط بھیجے تھے جن کے نتیجے میں مسلم بن عقیلؓ کو کوفہ بھیجا گیا تھا، ان کے ناموں میں کوئی نام مختار بن ابی عبید نہیں ہے۔ قاعدے سے تو مسلم کا قیام انہی لوگوں میں سے کسی کے گھر ہونا چاہیے تھا[1]! اور پھر اسی طرح ہانی بن عروہ کا نام بھی ان ناموں میں نہیں ہے۔ تو مختار کے گھر سے منتقل ہوئے تب بھی اسی جیسے ایک کے گھر پہنچے! یہ آخر قصّہ کیا ہے؟ ان آٹھ دس آدمیوں میں سے کسی کے گھر میں کیوں جگہ نہیں تھی جنھوں نے دعوتی خطوط لکھے تھے؟

مزید برآں

اور پھر بات اتنی ہی نہیں، ہانی بن عروہ کے گھر بالکل تن تنہا اور ایک قطعی ناخواندہ مہمان کی طرح پہنچتے ہیں۔ ابن جریر (طبری) ہوں یا ابن اثیر یا ابن خلدون سبھی لکھتے ہیں کہ:-

"مسلم کے کان تک جب ابن زیاد کی تقریر پہنچی تو وہ مختار کے مکان سے نکل کر ہانی ابن عروہ کے مکان تک پہنچے، ہانی نکل کر آئے اور مسلم کو دروازے پر دیکھا تو بڑا بُرا منھ بنایا۔ مسلم نے کہا بھائی میرے، تمھارے پاس پناہ کے لیے آیا ہوں، تمھارا مہمان ہونا چاہتا ہوں۔ ہانی نے جواب دیا "تم نے تو مجھے بڑی مصیبت میں ڈال دیا ہے، اگر میرے احاطے کے اندر نہ آ گئے ہوتے تو میں کہتا کہ مجھے معاف کرو۔ لیکن اب تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آجاؤ"[2]

(بقیہ صفحۂ گذشتہ) وہاں دال نہیں گلی تو حضرت حسینؓ کے نام پر خود ایک محاذ کھول دیا اور وہ وہ سوانگ بھرے اور جھوٹ بولے کہ اللہ کی پناہ۔ تفصیل کے لیے تاریخ دیکھیے۔

[1] ایک دوسری روایت یہ بھی ملی ہے کہ ان کا قیام مسلم بن عوسجہ کے یہاں ہوا تھا۔ طبری ج ۶ ص ۱۹۴ مگر روایتِ مختار یہی ہے کہ قیام مختار کے یہاں فرمایا۔ "شہید انسانیت" کے مصنف جناب علی نقی صاحب نے بھی اسی روایت کو اختیار فرمایا ہے۔

[2] طبری ج ۶ ص ۲۰۳ ابن اثیر ج ۳ ص ۲۶۹ دار الفکر بیروت۔

کیا ہونا چاہیئے تھا؟

مسلم بن عقیلؓ جیسا معزز مہمان جو حضرت حسینؓ کا قاصد ہی نہیں اُن کا بھائی بھی ہے جس کے آتے ہی شیعان علیؓ و حسینؓ کی سرگرم آمد و رفت اس کے پاس شروع ہو گئی تھی۔ اٹھارہ ہزار آدمی اس کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے، وہ ابن زیاد کی دھمکی سن کر احتیاطاً اپنی جائے قیام بدلنے کا فیصلہ کرتا ہے تو اس فیصلے میں کوئی مقامی آدمی شریک تک نظر نہیں آتا، ایک غریب الدیار بے یار و مددگار کی طرح خود ہی منہ اٹھا کر کہیں کو چل دیتا ہے اور ایسے ناروا سلوک سے دوچار ہوتا ہے!

یہ چند در چند سوالات ہیں جن کا کوئی جواب ہمیں اپنی ان تاریخی کتابوں میں نہیں ملتا لیکن ان روایتوں کا تعلق کسی ایسی بات سے نہیں ہے جس کی وجہ سے کسی راوی کے متعلق جھوٹ کا گمان کیا جائے۔ البتہ یہ خیال ہوتا ہے کہ مختار کے گھر سے ان کا بے یار و مددگار حال میں ہانی کے گھر پہنچنا اور ہانی کے یہاں ایک "آفت و مصیبت" کہہ کر ان کا استقبال کیا جانا، ان میں سے کوئی ایک بات بھی اس کے لیے کافی تھی کہ کوفیوں کے بارے میں یہ فیصلہ کیا جاتا کہ یہ ہرگز ہرگز قابلِ اعتبار نہیں ہیں۔ اور اسی وقت کوفے سے نکل جانے کی کوئی تدبیر سوچی جاتی۔ یا کم از کم حضرت حسینؓ کو یہ صورتِ حال بتا دینے کی سعی کی جاتی جن کو اس سے پہلے بالکل مختلف صورتِ حال کی اطلاع کی جا چکی تھی۔

لیکن قضا و قدر کے فیصلے کون بدل سکتا ہے؟ جناب مسلم نے ان حالات میں بھی ہانی بن عروہ کے گھر میں پناہ گیری ہی قبول نہیں کر لی بلکہ بظاہر اپنے مشن کے بارے میں بھی اُن کی رائے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہ حضرت حسین کو خط بھیج چکے تھے کہ فوراً آجائیے۔ یہاں حالات بالکل سازگار ہیں، بس آپ کے آنے کی دیر ہے۔ اپنی اس رائے میں تبدیلی انہوں نے اس وقت کی جب کہ وہ دشمن کے پنجے میں گرفتار ہو گئے[1] اور یہ ٹھیک وہ دن تھا جس دن حضرت

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۱۱

حسینؓ ان کے خط پر مکّے سے روانہ ہو رہے تھے۔ یعنی ۸ ذی الحجہ سنہ ۶۰ھ جو تاریخی روایتوں میں مکّہ سے حضرت حسینؓ کی کوفہ کو روانگی کا دن بتایا گیا ہے۔[1]

جناب مسلم کا انجام

کوفے کے ایسے نا وفادار اور طوطا چشم ماحول میں عبیداللہ بن زیاد جیسا چُست، چالاک اور سخت گیر منتظم پہنچ جائے تو مسلم بن عقیل جیسے ایک سادہ مزاج، پردیسی اور اجنبی کی کہاں خیر۔ اس نے ان کا پتہ نکال لیا کہ ہانی بن عروہ کے گھر پر مقیم ہیں۔ ہانی کے والد عُروہ پر عبیداللہ کے والد زیاد کا بڑا احسان تھا۔ زیاد نے سنہ ۵۰ھ میں حضرت مغیرہ بن شعبہ کے بعد کوفہ کی گورنری سنبھالی تھی تو حضرت علیؓ کے حامی سرداروں کو سختی سے دبایا تھا لیکن عروہ کو جانے کیوں اس نے اپنے احسان و کرم کا نشانہ بنایا۔[2] عروہ کے بیٹے ہانی کے ساتھ بھی اس نے یہی معاملہ رکھا اور اسی کے مطابق اپنے باپ کے بعد ابن زیاد نے معاملات رکھے۔ اس لیے اُس کو اس انکشاف سے بڑی چوٹ لگی کہ مسلم جو اس کے آقا یزید بن معاویہؓ کا تختہ اُلٹنے کی مہم پر آئے ہیں، ہانی کے گھر میں مقیم ہیں۔ اور وہی گھر ان کی خفیہ سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ اس نے ہانی کو بلوایا جو بڑی مشکل سے آنے کو تیار ہوئے۔ ان کو دراصل ابن زیاد کے کوفہ پہنچنے پر اور بحیثیت گورنر پہنچنے پر از خود ہی اس کے پاس آنا چاہئے تھا لیکن جناب مسلم کے قیام کی شرم ہی بظاہر دامن گیر تھی جو وہ ملنے نہیں آئے۔ اس چیز سے ابن زیاد کو اس اطلاع پر اور زیادہ بھروسہ ہوا ہوگا کہ مسلم بن عقیل ہانی کے گھر پر مقیم ہیں اور وہیں سے حضرت حسینؓ کی حمایت کے لیے بیعت کا سلسلہ چلایا جا رہا ہے اور اسی سے اس روایت کو تقویت ملتی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ جناب مسلم جب مختار کے گھر سے نکل کر ہانی کے گھر پناہ لینے پہنچے تو ہانی ان کو دیکھ کر اتنے پریشان ہوئے کہ اپنی پریشانی بے حجابانہ ظاہر کر ڈالی اور

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۱۱ [2] اسی سلوک کے لیے ایک دوسرا نام حُجر بن عدی کا بھی عروہ کے ساتھ لیا گیا ہے جن کا قصہ بعد میں کچھ اور ہوا۔

عربوں کی روایت مہماں نوازی بھی بھلا بیٹھے۔

بہر حال ہانی کسی طرح آئے تو ابن زیاد نے بہت ہی آڑے ہاتھوں لیا۔ اور اپنے اور اپنے باپ کے احسانات یاد دلاکر کہا کہ تمہارے گھر میں امیر المومنین کی حکومت اور عامۃ المسلمین کے امن و امان کے خلاف فتنہ و فساد کی یہ کھچڑی پک رہی ہے؟ ہانی نے انکار کرنا چاہا مگر یہ نہ چلا تو ایک بار پھر انہوں نے وہی کمزوری دکھائی جو جناب مسلم کو اپنے دروازے پر پاکر دکھائی تھی۔ کہا کہ واللہ میرا یقین کرو، میں انکو اپنے گھر نہیں لایا تھا، ہاں وہ میرے دروازے پر آکر کھڑے ہوئے تو میں انھیں دھتکار نہ سکا۔ تم مجھے موقع دو، میں ابھی جاکر انھیں رخصت کرتا ہوں کہ وہ جہاں چاہیں چلے جائیں۔ ابن زیاد نے کہا، یہ نہیں ہو سکتا۔ ہاں تم اس کام کے لیے جاسکتے ہو کہ انھیں میرے پاس لے کر آؤ۔

شکر ہے کہ ہانی کو اس مرحلے پر اپنے مہمان اور پناہ گیر کا حق یاد آگیا اور وہ ابن زیاد کی یہ فرمائش پوری کرنے کو تیار نہیں ہوئے۔ نتیجۃً ان کے ساتھ سختی کا معاملہ ہوا اور اس کی خبر کچھ مبالغے کے ساتھ جیسا کہ ایسے موقعوں پر ہوتا ہے، ہانی کے گھر پہنچی تو عورتوں کی آہ و فغاں نے مسلم بن عقیل کو مجبور کیا کہ وہ اپنے محسن کو ابن زیاد کے پنجے سے نکالنے کی تدبیر کریں۔ انکی سمجھ میں جو تدبیر آئی وہ یہ تھی کہ جن لوگوں سے انہوں نے حضرت حسینؓ کے لیے جانثاری کی بیعت لی تھی، جن کی تعداد عام طور سے اٹھارہ ۱۸ ہزار بتائی گئی ہے، ان کی طلبی کیلئے مقررہ نعرہ بلند کرائیں اور انھیں لے کر دارُالاَمارۃ ــــ گورنر ہاؤس ــــ پر حملہ کردیں۔ اس نعرہ پر عام روایتوں کے مطابق چار ۴ ہزار آدمی اسی وقت جمع ہوگئے۔ اور جناب مسلم کی سرکردگی میں دارالامارۃ پر جاپہنچے۔

حملے کی پسپائی اور مسلم بن عقیلؓ کی بے کسی

مگر یہ چار ہزار بہر حال کوفی ہی تھے، ابن زیاد نے صرف حسن تدبیر سے یہ ساری

جمعیت آناً فاناً منتشر کردی۔ سرداران قبائل جو خواستہ یا ناخواستہ گورنر کے دباؤ میں رہتے تھے، کچھ اس "فوج" کے سامنے آ گئے کہ خود سمجھائیں، کچھ اپنے قبیلوں میں چلے گئے کہ ان لوگوں کی ماؤں بہنوں کو باہر بھیج دیں جو انھیں سمجھا کر لے جائیں۔ بہرحال تھوڑی دیر میں بھیڑ چھٹ گئی اور جو کچھ رہ گئے تھے وہ بھی رات کے اندھیرے میں اضافے کے ساتھ کم ہوتے ہوتے جناب مسلم کو بالکل اکیلا چھوڑ گئے کہ وہ خود ہی اپنے لیے جو کچھ کر سکتے ہوں کریں۔

رات کو تو، روایت کے مطابق کہیں پناہ مل گئی مگر دن کا اُجالا ہونے پر ان کا پتہ نشان ابن زیاد تک پہنچ گیا اور اُس نے انھیں ایک فتنہ جُو اور مفسد قرار دے کر سر قلم کرا دیا اور پھر یہی انجام ہانی بن عُروہ کا بھی کرایا۔ یہ واقعہ ۹ ذی الحجہ کا بتایا گیا ہے[1]

---

[1] جناب مسلم اور ہانی کا یہ پورا قصہ کچھ اور زیادہ تفصیلات کے ساتھ طبری ج ۶ میں ص۲۰۵ سے ۲۱۱ تک بیان ہوا ہے

باب نہم ۹

قافلۂ حسینؓ اپنی آخری منزل کی طرف

مسلم بن عقیلؓ جب ۸ ذی الحجہ ۶۰ھ کی صبح گرفتار کیے گئے تو جو صاحب اُن کی گرفتاری کے لیے فورس (FORCE)[1] لے کر آئے تھے یہ محمد بن اشعث کہلاتے تھے اور یہ جناب مسلم کے گھرانے کے لیے اجنبی نہ تھے۔ ان کے والد اشعث بن قیس حضرت علیؓ کے بہت نمایاں ساتھیوں میں تھے۔ لیکن جنگِ صفّین کی خونریزی دیکھ کر حضرت علیؓ کے بہت سے ساتھیوں میں جو ایک برگشتگی آئی یہ اس میں بہت نمایاں ہوئے اور تحکیم کے لیے حضرت علیؓ کی طرف سے بادلِ ناخواستہ حضرت ابو موسیٰ اشعری کی نامزدگی زیادہ تر انہی کے دباؤ کا نتیجہ تھی۔ کیونکہ حضرت ابو موسیٰ کا جو رویّہ اس خانہ جنگی کے بارے میں شروع ہی سے رہا تھا اُس کی بنا پر ان کے بارے میں یہ یقینی تھا کہ وہ ہر قیمت پر آئندہ جنگ کا سدِّباب ہی کریں گے۔ یہ محمد بن اشعث اُس مجلسِ خواص کے شرکاء میں بتائے گئے ہیں جو مسلم بن عقیلؓ کی کوفے میں آمد پر دارِ مختار میں پہلے دن ہوئی۔ لیکن ان کے بارے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جبکہ اور شرکاء تن من دھن سے جناب مسلم کے مشن میں تعاون کی پُرجوش یقین دہانی کر رہے تھے، یہ بالکل خاموش رہے تھے۔ اور پوچھے جانے پر کہا تھا کہ میں دل سے آپ لوگوں کی تمنّاؤں میں شریک ہوں، مگر قتل

---

[1] مشہور روایات کے مطابق اس گرفتاری کے لیے بڑی فورس بھیجی گئی تھی اور بڑا معرکہ رہا، مگر طبری کی صـ۲۲۱ کی ایک روایت کے مطابق ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔

قتال کا معاملہ ہو تو اس میں شرکت کا روادار نہیں[1]

بہر حال جب ابن زیاد کے صریح اور محکم عزم کے آگے وہ لوگ بھی اپنا قبلہ بدلنے پر تیار ہو گئے جنھوں نے حضرت حسینؓ کو کوفے کی دعوت بھیجی تھی[2] تو محمد بن اشعث تو پہلے ہی کنارے پر کھڑے تھے انھیں حکم ہوا تو مسلم بن عقیلؓ کی گرفتاری کا فریضہ طوعاً یا کرہاً انھیں ادا کرنا کیوں کچھ زیادہ مشکل ہوتا؟

روایت میں ہے کہ گرفتاری کے بعد لے جائے جا رہے تھے تو رونے لگے، محمد بن اشعث کو تعجب ہوا کہ اتنے بڑے مشن کا آدمی روئے دے رہا ہے، جواب دیا کہ رونا اپنے لیے نہیں ہے، حسینؓ اور ان کے قافلے کے لیے ہے جو آج ہی میرے خط کی بنا پر مکے سے چل رہے ہوں گے۔ تم اگر احسان کر سکو تو اتنا کر دینا کہ انھیں میرے واقعہ کی اطلاع کرا دو تاکہ وہ اب ادھر کا ارادہ ختم کر دیں۔ روایت کے مطابق محمد بن اشعث نے اس کا وعدہ کر لیا تھا لیکن ظاہر ہے کہ اس پیغام کو پہنچنے میں تو ابھی کافی وقت لگنا تھا۔[3]

حج سے ایک دن پہلے روانگی

سیدنا حسینؓ جو آثار و قرائن کی روشنی میں بظاہر کوفے ہی کا خیال لے کر مدینے سے نکلے تھے، وسط رمضان میں مسلم بن عقیلؓ (چچیرے بھائی) کو کوفہ بھیجنے کے بعد منتظر تھے کہ وہاں سے مناسب حالات کی خبر آئے تو اپنی منزل کی طرف روانہ ہوں، غالباً ذوالقعدہ میں یہ خبر آگئی[4] آپ نے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۹۹ ۔ [2] شبث بن ربعی اور حجار بن ابجر عجلی وغیرہ کا خط ہو طبری ج ۶ ص ۱۹۷ اور ص ۲۰۸

[3] یہ خط حضرت حسینؓ کو راستہ میں آخر ذی الحجہ یا شروع محرم میں ملا جبکہ کوفہ قریب آ رہا تھا۔ یہ اس بنا پر کہا جا رہا ہے کہ سفر کی جس منزل پر اس خط کے ملنے کا ذکر روداد سفر میں آگے آ رہا ہے اس منزل پر آپ کے پہنچنے کا وقت حساب سے یہی بنتا ہے۔ [4] اس خط کے پہنچنے کی تاریخ بتانے والا کوئی بیان ہماری نظر سے سوائے البدایہ والنہایہ کے کہیں نہیں گزرا۔ ج ۸ ص ۱۷۰ پر ہے کہ وکان کتاب مسلم قد وصل الیہ قبل ان یقتل بسبع وعشرین لیلۃ۔ لیکن اس میں اشکال یہ ہے کہ خط کے قتل سے

(بقیہ صفحۂ آئندہ پر)

ضروری تیاری کی اور ٹھیک حج سے ایک دن پہلے یعنی ۸ ذی الحجہ کو جو کہ "یوم الترویہ" کہلاتا ہے اور حجاج کے قافلے اس دن مکّے سے منیٰ کو روانہ ہوتے ہیں۔ آپ اپنے قافلے کے ساتھ کوفے کی سمت روانہ ہو گئے اور جیسا کہ ابھی گزرا یہ وہی دن تھا جب کوفے میں مسلم بن عقیلؓ اہلِ کوفہ کی روایتی غدّاری کا شکار ہو کر زیاد کے ہاتھوں گرفتار ہو رہے تھے۔

خیر خواہ ایک بار پھر روکتے ہیں

حضرت محمد بن حنفیہ، عبداللہ بن مطیع اور عبداللہ بن عمر کی کوشش کا ذکر پہلے آچکا ہے کہ ہر ایک نے کوفے کے ارادے سے باز رہنے کی ہر ممکن فہمائش اور درخواست کی مگر جیسے کہ تقدیر الٰہی میں ایک بات طے ہو چکی ہو، کسی کی بات مؤثر نہ ہوئی۔ آپ نے اہلِ کوفہ کی دعوت کو مشروط طور سے قبول کر کے مسلم بن عقیلؓ کو حالات کی تصدیق کے لیے وہاں بھیجا۔ اور ان کی تصدیق آتے ہی روانگی کا عزم کر لیا۔ اس عزم کی اطلاع دوسرے لوگوں کو کس طرح ہوئی، اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ شاید سفر کی تیاریاں اور کچھ دوسری علامات قرینہ بن گئیں۔ بہرحال اس آخری موقع پر کچھ اور لوگ بھی روکنے کے لیے سامنے آئے۔

۱۔ حضرت عبداللہ بن عبّاسؓ

حضرت عبداللہ بن عباس بزرگِ خاندان تھے۔ انھیں کے آبائی مکان میں آپ ٹھیرے ہوئے بھی تھے۔ انھیں ارادۂ سفر کی اطلاع نہ ہونے کا سوال ہی کیا۔ علاوہ ازیں ایک روایت یہ بھی ہے کہ یزید نے حضرت حسینؓ کے مکہ آجانے پر حضرت ابن عباسؓ کو بزرگِ خاندان کی

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) بلکہ ۲ دن پہلے پہنچنے کی بات کہی جا رہی ہے اور بظاہر عبارت قتل سے قتل حسین مفہوم ہوتا ہے۔ اور یہ مانا جائے تو گویا ۱۲ ذی الحجہ کو خط ملا۔ حالانکہ روانگی کی روایت ۸ ذی الحجہ کی ہے اور اس میں یہ بھی ہے کہ خط ملنے کے بعد ہی روانگی ہوئی تھی۔ البتہ قتل سے قتلِ مسلم مراد لے لیں تو کسی درجہ میں بات بن جائے گی۔

حیثیت سے لکھا بھی تھا کہ آپ انھیں سمجھائیں کہ وہ جو کچھ سوچ رہے ہیں وہ مناسب نہیں ہے۔ البدایہ والنہایہ ج ۸ میں ص۱۶۴ پر اس خط کا اور اس کے جواب کا تذکرہ خلاصۂ مضمون کے ساتھ ہے[1]۔ جواب کا خلاصہ یہ دیا گیا ہے کہ :-

انی لأرجوا ان لا یکون خروج	مجھے امید ہے کہ حسین کا (مدینے سے)
الحسین لامرٍ تکرھه ولست	نکلنا کسی ایسی بات کے قصد سے نہیں ہوا
اَدع النصیحة لهٗ فی کل ما تجتمع	ہوگا جو تمھارے لیے باعث تکلیف ہو اور
بہ الالفة وتطفی بہ الثائرة ۔	اور میں (پھر بھی) کوئی دقیقہ انھیں اس بات
	کے سمجھانے میں نہیں چھوڑونگا جس سے
	ہم لوگوں کی الفت باہمی برقرار رہے اور
	فتنہ دبے[2]

اس خلاصۂ جواب کے بعد بتایا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت حسینؓ کے پاس آئے اور بڑی دیر تک گفتگو کی جس میں آپ نے کہا کہ " خدا کے لیے عراق کا ارادہ نہ کرو اور اپنی جان کھونے کو وہاں نہ جاؤ اور نہیں تو کم از کم اتنی بات مانو کہ موسمِ حج گزر جانے دو، حج میں آنے والے لوگوں سے مل کر وہاں کے حالات کا اندازہ کرو اور پھر طے کرو جو کچھ طے کرنا ہو[3]۔ اس کے آگے کا جملہ ہے کہ "یہ واقعہ عشرۂ ذی الحجہ کا ہے"۔ یعنی بالکل اس وقت کا جبکہ روانگی ہونے والی تھی۔

حضرت ابن عباسؓ کی مذکورہ گفتگو کو اگر ہم یزید کی اور آپ کی خط و کتابت کا نتیجہ سمجھیں، جیسا کہ البدایہ کی طرزِ تحریر سے ظاہر ہوتا ہے، تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ یزید نے حضرت ابن عباسؓ کو بالکل آخری مرحلہ میں لکھا جبکہ ذی الحجہ کا مہینہ شروع ہو چکا تھا اور حضرت حسینؓ روانگی کی تیاری کر رہے تھے۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ یہ گفتگو اگرچہ البدایہ والنہایہ میں اس

---

[1] دونوں کا تفصیلی متن "حیاۃ الامام حسین بن علی" از باقر شریف القرشی جلد ثانی میں ہمارے سامنے ہے۔

[2] اس جواب ہی سے یزید کے خط اور اسکی اسپرٹ کا اندازہ ہو جاتا ہے یعنی اسی اسپرٹ کا خط اسکا بھی تھا۔ [3] البدایہ ج ۸ ص۱۶۴

طرح درج کی گئی ہے جیسے کہ اوپر کی خط و کتابت کا نتیجہ ہو لیکن واقعہ میں یہ گفتگو اس سے الگ بالکل آخری مرحلے کی ہو۔ جبکہ یزید کا خط بظاہر اُس مرحلے میں آیا ہوگا جب حضرت حسینؓ کے مکے آنے کے بعد وہاں کوفیوں کی آمد شروع ہوئی اور مسلم بن عقیل کوفے پہنچ گئے۔ ہمارے نزدیک قرینِ قیاس یہی بات ہے۔ یعنی یہ مذکورۂ بالا گفتگو دوسری بار کی ہے ورنہ اصل گفتگو آپ نے خط آنے کے فوراً بعد ہی کی ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ اس وقت جو گفتگو حضرت ابن عباس اور حضرت حسین کے درمیان ہوئی وہ ریکارڈ میں نہ آئی ہو۔ البتہ جب حضرت حسین کوفے کے قصد پر مُصر رہ کر پا بہ رکابی کے مرحلے میں داخل ہو گئے ہوں تب حضرت ابن عباسؓ نے ایک بار پھر انھیں سمجھانے کی کوشش کی ہو اور وہ روایت ہو کر ابن کثیر تک پہنچی ہو۔ بہر حال آگے روایت کا بیان یہ ہے کہ حضرت حسین نے حضرت ابن عباس کا مشورہ قبول نہیں فرمایا فابی الحسین الا ان یمضی الی العراق (حسین عراق جانے کے ارادے پر مُصر ہی رہے) فقال لہٗ ابن عباس (اس پر حضرت ابن عباس نے ان سے فرمایا:۔

واللہ انی لاظنك ستقتل	واللہ مجھے لگتا ہے کہ تم کل اپنی بیویوں
غدًا بین نسائك و بناتك	اور بیٹیوں کے درمیان اسی طرح قتل
کما قُتِل عثمان بین نسائہ	کیے جاؤ جیسے عثمان اپنی بیویوں اور
و بناتہ واللہ اِنّی لاخافُ	بیٹیوں کے درمیان قتل ہوئے تھے
ان تکون انت الذی یقادُ بہ	واللہ مجھے تو یہ بھی خوف ہے کہ تم قصاصِ
عثمان فانّا للہ و انّا الیہ	عثمان میں قتل کیے جانے والے بنو۔ پس[1]
راجعون	(تم نہیں مانتے تو) اناللہ وانا الیہ راجعون[2]

لیکن حضرت حسین کے لیے یہ مکرر تفہیم بھی کچھ مؤثر نہ ہوسکی بلکہ جیسا کہ آگے روایت میں ہے

---

[1] طبری کی روایت میں یہ آخری جملہ نہیں ہے اور حضرت ابن عباس کی زبان کے ساتھ اس جملے کا جوڑ قابل یقین بھی نہیں ہے۔ یزید کے بارے میں انکے اس طرح کے خیالات ہونیکا کہیں ثبوت نہیں ملتا۔ [2] البدایہ والنہایہ ج۸ ص۱۶۴

آپ نے اس اندازِ تفہیم پر ایک گونہ ناگواری کا اظہار فرمایا۔

۲۔ **ابوبکر بن عبدالرحمٰن**: یہ مدینے کے مشہور فقہائے سبعہ میں سے تھے، ان کے والد عبدالرحمٰن بن الحرث بن الہشام بن المغیرہ المخزومی القرشی خود بڑے صاحبِ فضائل تھے۔ غالباً حج کو آئے ہوئے تھے کہ حضرت حسین کے قصدِ کوفہ کا چرچا سنا تو از راہِ خلوص و محبت حاضرِ خدمت ہوئے۔ اور حسب روایت طبری[۲] عرض کیا کہ:۔

"آپ ایک ایسے ملک کا ارادہ فرما رہے ہیں جو خالی نہیں پڑا ہوا ہے بلکہ وہاں اس کے امراء و حکام موجود ہیں جن کے ہاتھ میں خزانے ہیں اور لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ روپے پیسے کے بندے ہیں۔ پس وہی لوگ جنھوں نے آپ کی مدد کا وعدہ کیا ہے وہ آپ کے خلاف لڑنے کو آجائیں گے۔" الخ

مسعودی کی روایت میں ان کا پیرایۂ بیان کچھ اور زیادہ مؤثر ہے۔ فرمایا کہ:۔

"دیکھیے آپ کے والد ماجد آپ سے زیادہ حوصلہ اور طاقت رکھتے تھے۔ لوگ ان کی بات سنتے بھی زیادہ تھے۔ اہل شام کو چھوڑ کر باقی سب ان کی شخصیت پر جمع ہو گئے تھے۔ وہ ان کو لیکر معاویہ کے مقابلے پر چلے۔ معاویہ کی ان کے مقابلے میں کچھ حیثیت نہ تھی۔ مگر پھر بھی لوگ دنیا اور دنیوی زندگی کی محبت میں اُن کا حق بھول گئے۔ انھیں خون رُلایا حتیٰ کہ اسی حالت میں وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ پھر جو کچھ ان لوگوں نے آپ کے بھائی کے ساتھ کیا وہ سب بھی آپ جانتے ہیں۔ اور پھر انہی غداروں کا بھروسہ کر کے آپ اُن لوگوں سے لڑنے جا رہے ہیں جو آپکے مقابلے میں زیادہ قوی اور تیار ہیں لوگ ان سے امیدیں بھی زیادہ کر سکتے ہیں اور ڈرتے بھی زیادہ ہیں۔[۳]"

---

[۱] ان کا نام مؤرخ مسعودی کے ماسوا اور لوگوں نے عمر بن عبدالرحمٰن لکھا ہے مگر صحیح نام ابوبکر ہی معلوم ہوتا ہے۔ اصابہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو الاصابہ لابن حجر ج ۵ ص ۶۶۔ [۲] ج ۶ جزو ۶ ص ۲۱۶۔
[۳] مروج الذہب (دار اندلس بیروت ج ۳ ص ۵۶

۳۔ **کئی اور مخلصین** :۔ اسی طرح اور کئی نام آتے ہیں جن کا تعلق مخلصین کے زمرے سے تھا کہ انہوں نے یا اس عنوان سے کوفے کے قصد کی مخالفت کی کہ کوفی بالکل ناقابلِ اعتبار ہیں، اور حالات ناسازگار، یا اس عنوان سے کی کہ اس اقدامِ خروج کا کوئی جواز نہیں ہے۔ ابن کثیر نے ایک ہی جگہ یہ نام اور ان کے اقوال جمع کر دیئے ہیں[1]۔ حضرت ابوسعید الخدری، جابر بن عبداللہ، واثلہ بن واقد اللیثی اور مسوَر بن مخرمہ جو سب اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اور یہ سب مخلصین حضرت علی ہی سے تھے۔ حضرت ابوسعید خدری کے متعلق بتایا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا:۔

"اپنی جان کے بارے میں اللہ سے ڈریئے، اپنے گھر ہی میں رہیے اور اپنے امام پر خروج مت کیجئے۔"

حضرت جابر بن عبداللہؓ نے فرمایا:۔

"اللہ سے ڈریئے اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے مت ٹکرائیے۔"

واثلہ بن واقد اللیثیؓ نے فرمایا کہ:۔

"آپ کا خروج بجا نہیں ہے آپ صرف اپنی جان دینے جا رہے ہیں اس سے باز رہیئے"

مسوَر بن مخرمہ نے لکھا کہ

"اہلِ عراق کے خطوط سے دھوکہ میں نہ آئیے اور نہ ابن زبیر کے اس قول سے کہ وہ لوگ آپ کی مدد کریں گے۔"

لیکن سب ہی کی خواہشیں، منّتیں اور دلیلیں ناکام ہوگئیں اور حضرت حسین ۸ ذی الحجہ کو دوپہر کے وقت جبکہ حجاج منیٰ کے لیے روانہ ہوئے عمرہ کے ارکان ادا کر کے کوفے کی سمت روانہ ہوگئے[2]۔ گویا آپ نے احرام باندھا ہوا تھا مگر وہ احرام حج کا نہیں عمرے کا تھا۔

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۶۳۔

[2] طبری ج ۶ ص ۲۱۷۔ اپنے عزم وارادے پر حضرت حسین کی اس درجہ پختگی بھی ایک حل طلب سوال ہے دم تحریر سامنے نہیں لیکن یاد آتا ہے کہیں یہ روایت نظر سے گزری ہے کہ آپ نے کوئی (بقیہ صفحۂ آئندہ پر)

عبداللہ بن جعفر کی سعی

حضرت کے عم زاد عبداللہ بن جعفرؓ حجاز کی بڑی اہم شخصیت تھے۔ عم زاد ہونے کے علاوہ حضرت کی ہمشیرہ حضرت زینب کبریٰ کے شوہر بھی تھے۔ قیام مدینے میں رہتا تھا۔ غالباً حج کے لیے آئے ہوں گے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت حسین کی روانگی سے پہلے اُن کی کسی مداخلت کا ذکر کیوں نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے حضرت حسین کے اس رُخ سے جو وہ یزید کے سلسلے میں اختیار کر رہے تھے، ناخوش ہوں، کیونکہ وہ حضرت معاویہ کے زمانے سے اس خاندان کے ساتھ بہتر تعلقات رکھتے آئے تھے۔ جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ کا بھی معاملہ تھا۔ اور عمر میں حضرت حسین سے بڑے بھی تھے، بہر حال جو بھی وجہ ہو۔ روایت ہے کہ ان کو اطلاع ملی کہ حسین روانہ ہو گئے تو وہ اپنے دو بیٹوں کو حضرت حسین کے تعاقب میں روانہ کر کے کہ ذرا آگے بڑھ کر ان سے کہو کہ اول تو لوٹ آئیں ورنہ کم از کم ذرا سا ٹھہریں میں آرہا ہوں، اور یہ کہہ کر وہ خود سیدھے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) خواب دیکھا تھا جس میں اس ارادے کے لیے تائیدی اشارہ پایا جاتا تھا۔ پس گویا یہ اسی خواب کا اثر تھا کہ آپ اس ارادے پر نظر ثانی کے لیے تیار نہ تھے۔ مگر جب ہم آگے چل کر دیکھتے ہیں کہ آپ اس ارادے کو فسخ کر کے درمیان راہ سے واپسی پر بھی تیار ہو گئے تھے مگر تقدیر الٰہی معاون نہ ہوئی اور واپسی ممکن نہ ہو سکی۔ تو یہ روایت کچھ معتبر نہیں رہتی اور اس کے بعد جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ تاریخی بیانات کی روشنی میں، جن میں سے کچھ اس کتاب کے پچھلے ابواب میں مذکور بھی ہوئے ہیں، آپ کے خیالات کے مطابق حضرت معاویہ کا دور بھی محض حالات کی مجبوری سے قبول کیا جانے والا دور تھا، نہ کہ خوشی سے۔ اور پھر جب آخر میں یزید کی ولیعہدی کا مسئلہ سامنے آگیا تب تو روایات کی رو سے یہ سوال بھی آپ کے سامنے آنے لگا تھا کہ "میں معاویہ کے خلاف جہاد نہ کر کے اللہ کو کیا جواب دے سکوں گا"، پس گمان یہ ہوتا ہے (بلکہ اس کا بھی روایتوں سے تقریباً ثبوت ہی ملتا ہے) کہ یزید کی ولیعہدی عمل میں آجانے کے بعد گویا آپ نے طے کر لیا تھا کہ اس کی اگر خلافت کی نوبت بھی آتی ہے تو بشرطِ حالات آپ اس خلافت کو الٹ دینے کی کوشش میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں گے۔ بظاہر یہی تہیہ تھا جسے آپ ایک دینی تقاضا سمجھتے تھے اور اس لیے اس وقت تک اس میں کسی تبدیلی کے روادار نہ ہوئے جب تک ایسے حالات سامنے نہ آ گئے کہ ان میں آپ نے اپنے لیے عنداللہ عذر سمجھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

والئ حرمین عمرو بن سعید کے پاس گئے کہ دیکھو حسین چلے گئے ہیں، تم مجھے ایک خط اُن کیلئے لکھ کر دو کہ وہ لوٹ آئیں اور یہ کہ تم ان کے ساتھ حسنِ سلوک اور صلہ رحمی سے پیش آؤ گے، کسی طرح کی کاروائی اُن کے خلاف نہیں ہوگی۔ روایت کہتی ہے کہ عمرو نے عبداللہ بن جعفر سے کہا کہ تم خود خط لکھ لو اور مجھ سے دستخط کرالو۔ چنانچہ یہی ہوا۔ پھر ابن جعفر نے کہا کہ مزید اطمینان کے لیے اپنے بھائی یحییٰ کو میرے ساتھ کرو اور یہ خط تمھاری طرف سے وہی حسین کو دیں۔ چنانچہ یہ بھی ہوا۔ یہ دونوں صاحبان حضرت حسین کے پاس پہنچے۔ مگر دوسرے تمام لوگوں کی طرح ناکام ہی رہے۔[1]

والئ حرمین کی طرف سے بجبر روکے جانے کی روایت

حضرت عبداللہ بن جعفر اور والئ حرمین عمرو بن سعید کے بارے میں جو روایت ابھی مذکور ہوئی اس کی روشنی میں طبری ہی کی یہ دوسری روایت کسی طرح قابلِ اعتبار نظر نہیں آتی کہ "جیسے ہی قافلہ مکّے سے نکلا حاکم مکہ عمرو بن سعید کے فرستادے ان کے بھائی یحییٰ بن سعید کی قیادت میں ان کا راستہ روکنے اور بجبر مکہ واپس لانے کے لیے پہنچے۔ مگر یہ لوگ کامیاب نہیں ہو سکے تھوڑی سی زور آزمائی اور مار پیٹ کے بعد یہ فرستادے نامراد لوٹنے پر مجبور ہوئے"[2]۔ دونوں روایتوں میں اتنا تضاد ہے کہ کوئی ایک ہی ٹھیک ہو سکتی ہے۔ دونوں بیک وقت نہیں ہو سکتیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ دوسری والی روایت، پہلی والی روایت میں مذکور واقعہ ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے اور کچھ نہیں۔ ویسے بھی کیا تُک تھا کہ جس حاکم نے سوا چار مہینے حضرت حسین سے پلٹ کر نہیں پوچھا کہ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ جبکہ اُسے معلوم تھا کہ آپ نے مدینہ کیوں چھوڑا ہے۔ رمضان تک تو وہ خالی حاکم مکہ ہی تھا رمضان میں مدینے کی حکومت بھی اس کے سپرد کر دی گئی تھی۔ اور اس سپردگی کے ساتھ ہی اس نے عبداللہ بن زبیر کے

---

[1] طبری ج ۶ صفحہ ۲۱۹-۲۲۰ [2] ایضاً صفحہ ۲۱۷-۲۱۸

خلاف ـــ جو حضرت حسین ہی کے ساتھ مکے میں آئے تھے ـــ گرفتاری کے لیے کاروائی بھی شروع کر دی تھی[1] اس کے برخلاف کوئی ایک بھی روایت نہیں ملتی کہ اُس نے حضرت حسین کو چھیڑا ہو، ان کے معاملات میں کسی طرح کا دخل دیا ہو۔ حالانکہ اہلِ کوفہ کے وفود اُن کے پاس آ رہے تھے، اُن کے فرستادے کوفے جا رہے تھے، وہ سفر کی تیاریاں کر رہے تھے۔ تقریباً اسّی نوّے آدمیوں کا قافلہ جانے کو تھا اس کی تیاریاں دو چار دن پہلے سے تو بالکل صاف نظر آنے ہی لگی ہوں گی۔ اب اس تمام مدت میں تو حاکمِ مکّہ ان سے تعرض نہیں کرتا۔ مگر جب وہ مکّہ سے نکل جاتے ہیں تو اُن کی پکڑ کو آدمی دوڑاتا ہے۔ کوئی تُک کی بات تو یہ ہے نہیں۔

نیز خود اس روایت کا ایک دوسرا جز و بجائے خود اس بات کی دلیل بن سکتا ہے کہ حاکمِ مکّہ کی طرف سے تعاقب کی کہانی درست نہیں ہے۔ وہ دوسرا جز و یہ ہے کہ قافلہ حاکمِ مکّہ کے فرستادوں کو پسپا کر کے آگے بڑھا تو ایک قافلہ ملا جو یمن سے (سالانہ معمول کے مطابق) دارالخلافہ دمشق کے لیے بہت سے قیمتی سامان لیے جا رہا تھا، حضرت حسین نے اس پر قبضہ کر لیا اور شتربانوں سے کہا کہ تم میں سے جو چاہے یہاں سے لوٹ جائے اور جو چاہے ہمارے ساتھ کوفے تک چلے ہم دونوں کو معاوضہ دیں گے ـــ ہمارا خیال یہ ہے کہ روایت کے دونوں جزو ل میں سے کوئی ایک ہی ٹھیک ہو سکتا ہے، ورنہ کیسے یہ بات قابلِ تصوّر ہے کہ ابھی حاکمِ مکّہ کے آدمیوں سے ٹکراؤ ہوا تھا (جس کے بعد پورا اندیشہ ہونا چاہیے تھا کہ شاید وہ مزید کمک لے کے آتے ہوں) اور ابھی ایک ایسا کام کیا جانے لگا (یعنی سرکاری قافلے کے اموال پر قبضہ کرنا) کہ پسپا شدہ لوگ کسی کمک کے ساتھ دوبارہ نہ بھی آتے ہوں تو اس نئے واقعہ کے بعد حاکم پر بالکل فرض ہو جائے کہ وہ سرکاری مال کی بازیابی اور شتربانوں کی امداد کے لیے کوئی مؤثر کاروائی کرے۔ اور جب روایت میں یہ بھی ہے کہ جن شتربانوں نے آگے جانا قبول نہیں کیا ان کا وہیں حساب کر دیا گیا[2] تب تو حاکمِ مکّہ کو واقعہ کی فوری اطلاع ہونے کا بھی سامان ہو گیا تھا اور

---

[1] طبری ج ۶ ص ۹۲-۱۹۳

[2] طبری ج ۶ ص ۲۱۸

کسی کارروائی کا اندیشہ نہ ہونے کا سوال ہی نہ تھا۔ بہر حال روایت کے دونوں اجزاء میں سے ایک ضرور غلط ہے اور اس صورتِ حال کے نتیجہ میں یہ بھی سوچا جاسکتا ہے کہ دونوں ہی غلط ہوں[۱]

نوٹ کرنے کی بات

بہر حال نہ صرف یہ کہ جبر و اکراہ والی یہ روایت کسی طرح قابلِ قبول نظر نہیں آتی۔ بلکہ یہ بات بھی نوٹ کی جانی چاہیے کہ جس طرح حاکم مدینہ ولید بن عتبہ بن ابی سفیان نے حضرت حسین کے ساتھ قاعدہ و قانون کے بجائے لحاظ و احترام کا معاملہ کیا۔ اور حضرت عبداللہ بن زبیر کے برخلاف آپ کو بالکل آپ کے حال پر چھوڑ دیا۔ اسی طرح حاکمِ مکّہ ــــ اور بعد میں حاکمِ حرمین ــــ عمرو بن سعید بن العاص ــــ المعروف اَشْدَق ــــ نے آپ کے ساتھ یہی معاملہ رکھا، کوئی تعرض آپ سے نہیں کیا اور کیا تو وہ بھلائی کا معاملہ کیا جو عبداللہ بن جعفرؓ نے ان سے چاہا تھا۔ ہمارے خیال میں یزید کے بارے میں حضرت حسین کے سخت مخالفانہ رویّے کی روشنی میں یہ بات نہیں سوچی جاسکتی کہ مقامی حکّام احترام، نرمی اور چشم پوشی کا یہ معاملہ مرکزی حکومت اور دار الخلافہ دمشق کی مرضی کے بغیر کر رہے ہوں۔ لازماً یہ رویّہ وہیں کے ایماء پر ہونا چاہیے اور حضرت عبداللہ بن عباس کے نام کے خط سے بھی، جس کا اوپر تذکرہ ہوا، یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یزید کی طرف سے حضرت حسین اور حضرت عبداللہ بن زبیر کے معاملہ میں وہی فرق تھا جس فرق کی حضرت معاویہ نے اُسے وصیت کی تھی۔[۲]

---

[۱] "شہیدِ انسانیت" کے مصنّف جناب علی نقی صاحب نے اسی اشکال یا کسی دوسرے اشکال سے بچنے کی راہ یہ اختیار فرمائی ہے کہ قافلہ کو محض ایک قافلہ بتایا ہے یمن کا سرکاری قافلہ نہیں بتایا۔

[۲] شیعہ مصنّفین نے مدینے سے حضرت حسین کے خفیہ کوچ کا بدیہی جواز ثابت کرنے کے لیے اور اسی طرح مکہ سے قبلِ حج کوچ کے لیے عجیب عجیب الزامات حُکّامِ مکہ و مدینہ اور حکومتِ دمشق پر لگائے ہیں مگر سب بے بنیاد اور محض افتراء ہیں۔ چنانچہ ان کے لیے کوئی حوالہ نہیں دیا گیا ہے (باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

ذی الحجہ کی ۸ ریا ۱۰ ر

محمود احمد عباسی مرحوم نے اپنی کتاب (خلافت معاویہ و یزید) میں ایک خاص بحث یہ کی ہے کہ حضرت حسینؓ کے قافلے کا سفر ۸ ر ذی الحجہؔ کو حج سے پہلے شروع ہوا تھا یا ۱۰ ر کو؟ وہ کہتے ہیں کہ ۸ ر کی جو روایت عام طور پر مؤرخین کے یہاں پائی جاتی ہے وہ صحیح نہیں ہے صحیح ۱۰ ر ذی الحجہؔ ہے۔ یعنی آپ حج کر کے روانہ ہوئے تھے۔ اس کے انہوں نے بہت سے دلائل جمع کیے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ دمشق کو جانے والے یمنی قافلے کو پکڑنے کی جو روایت آئی ہے اس میں اس واقعہ کا مقام تنعیم کو بتایا گیا ہے۔ جو مکہ مکرمہ سے شمال مغرب کی جانب ۴ میل کے فاصلے پر مشہور جگہ ہے۔ اس کو چھوٹا عمرہ بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ عمرہ کا احرام باندھنے کے لیے حدود حرم سے باہر جو جانا پڑتا ہے تو اس کام کے لیے یہ قریب ترین جگہ ہے)۔ عباسی صاحب کہتے ہیں کہ تنعیم کا محلِّ وقوع اس سمت جنوب مشرق سے، جس سمت میں آدمی مکّے سے کوفے کو جاتا ہے، بالکل مخالف سمت، شمال مغرب، میں راہِ دمشق پر ہے۔ تو مکّے سے کوفے کو جاتے ہوئے تنعیم کا یہ واقعہ کیسے پیش آگیا؟ اور کیسے یہ قافلہ جو حج کے ایام میں مکّہ سے گزر رہا تھا بغیر حج کیے ہوئے مکہ سے آگے بڑھ کر تنعیم پہنچ گیا ہوگا؟ عباسی صاحب کا یہ سوال تو بالکل صحیح ہے مگر اس کے ذریعہ جو وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ہاں حج کے بعد ۱۰ ر ۱۱ ر ذی الحجہ میں حضرت حسین کا سفر مانا جائے تو یہ

(باقی حاشیہ صفحۂ گذشتہ کا) مثلاً شہید انسانیت" صفحہ ۲۲۸ پر ہے کہ ولید حاکمِ مدینہ نے یزید کو حضرت حسین کے بیعت سے انکار کی خبر دی تو اس نے حکم بھیجا کہ بیعت کرنے اور نہ کرنے والوں کی فہرست بھیجو جس کے ساتھ حسین کا سر بھی ہونا چاہیے۔"

یہ اگر واقعہ ہوتا تو آخر مکہ بھی تو یزید کی قلمرو میں شامل تھا پھر کیوں اس نے مکّے کے حاکم کو فرمان بھیجا کہ حسین مدینے سے نکل کر مکہ پہنچ گئے ہیں تم ان کو گرفتار کرو۔ حالانکہ وہاں آپ کا تین مہینے سے اوپر قیام رہا تھا۔۔؟

واقعہ ممکن ہو سکتا ہے، یہ بالکل بھی قابلِ قبول بات نظر نہیں آتی۔ کیونکہ حج کرنے کی صورت میں حضرت حسینؓ اور ان کا قافلہ تنعیم سے، اسی مخالف سمت میں جس سمت میں راہِ کوفہ ہے، اس وقت کے مقابلے میں اور زیادہ دور ہو جاتا تھا جس وقت آپ ۸ ذی الحجہ کو مکہ مکرمہ میں تھے۔ حج کے ارکان منیٰ، مزدلفہ اور عرفات میں ادا ہوتے ہیں، اور یہ مقامات مکہ سے بجانب مشرق (یا جنوب مشرق) ۲½ میل سے لیکر ۱۳ میل تک کے فاصلے پر ہیں۔ جبکہ تنعیم مکہ سے خود عباسی صاحب کے قول کے مطابق بھی ــــ بجانب شمال مغرب ۳۔۴ میل کے فاصلے پر ہے۔ پس مکہ سے ۳۔۴ میل مخالف سمت میں اگر اس واقعہ کا تصور مشکل ہے تو اسی مخالف سمت میں ۱۵۔۱۶ میل کا فاصلہ ہو جاتے پر اور بھی زیادہ مشکل ہو جانا چاہیے۔

دوسری دلیل عباسی صاحب نے البدایہ والنہایہ کے الفاظ "وذالك فی عشر ذی الحجۃ" کو بنایا ہے جس کا مطلب ان کے خیال میں یہ ہوتا ہے کہ حضرت حسینؓ ۱۰ ذالحجہ کو روانہ ہوئے۔ مگر اسی البدایہ والنہایہ میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ :

فاتفق خروجه من مكة ايام التروية قبل مقتل مسلم بيوم واحد۔ فان مسلماً قتل يوم عرفة۔[1]	پس آپ کا مکہ سے خروج ایام ترویہ میں قتل مسلم سے ایک دن پہلے ہوا مسلم کا قتل یوم عرفہ میں ہوا تھا۔

پس اس کی روشنی میں "عشر ذی الحجۃ" کا مطلب ۱۰ ذی الحجہ نہیں بلکہ "عشرۂ ذی الحجہ" لیا جائے گا۔

علاوہ ازیں معاملہ کا یہ پہلو بھی عباسی صاحب سے نظر انداز ہو گیا کہ اگر حضرت حسینؓ نے سفر کا آغاز حج کے بعد کیا ہوتا تب وہ ۱۲ تاریخ سے پہلے سفر نہیں کر سکتے تھے، حاجی کو کم از کم ۱۲ تک منیٰ میں رک کر رمی جمرات کرنا ہوتی ہے۔ اور اس صورت میں عباسی

[1] ج ۸ ص ۱۵۹۔

صاحب کے دیئے ہوئے پیمانۂ رفتارِ سفر کے مطابق وہ ۱۰ محرم کو کربلا میں نہیں پہنچ سکتے تھے جو وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

ہمیں بذاتِ خود ۸ یا ۱۰ ذی الحجہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ لیکن عباسی صاحب کے قارئین میں سے کسی کی نظر سے ہمارے یہ صفحات گزرے تو اُسے خیال ہوسکتا ہے کہ ایک سوال جو حضرت حسین کی تاریخِ روانگی کے سلسلے میں اتنی اہمیت سے ایک مصنّف نے اٹھایا تھا بعد والے دوسرے مصنّف نے اس سے بالکل اعتنا ہی نہیں کیا۔ اس لیے اپنا نقطۂ نظر اس بارے میں عرض کرنا مناسب سمجھا گیا۔

کربلا تک کی رودادِ سفر اور یوم شہادت کی روایتیں

آغاز سفر کے ساتھ جس طرح کی روایتیں ابھی آپ کے سامنے آئیں کہ ایک کا مضمون دوسرے کی نفی کر رہا ہے۔ بلکہ خود ایک ہی کے اندر کے دو حصّے ایک دوسرے سے تضاد رکھتے ہیں۔ ان کے بعد جو اور روایتیں کربلا تک کے سفر اور یوم شہادت کی روداد بیان کرتی ہیں، وہ بعینہٖ اس کیفیت کی حامل اگرچہ نہ ہوں مگر دوسرے متعدد اسباب سے ان کا بیشتر حصّہ مشکوک اور نا قابلِ اعتبار ہے اور کوئی خاص اہمیت بھی اس پوری روداد کے بیان کی ہے نہیں، مثلاً آپ راستے میں کہاں کہاں ٹھہرے؟ کیونکہ اکثر یہ جگہیں وہ ہیں جو قاری کے لیے ایک جائے مجہول کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کا علم اُسے ہو یا نہ ہو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یا کتنی دیر تک دو منزلوں کے بیچ میں چلے اور کتنی دیر اور کون سے وقت آپ کس منزل پر ٹھیرے، اور کتنا پانی کہاں سے بھر کے لیا تھا لیا۔ اور کس منزل کی کیفیت کیا تھی؟ یہ سب باتیں وہ ہیں جو اس واقعہ کے بارے میں اُس خاص نقطۂ نظر کے ساتھ جو شیعہ حضرات کا ہے اور جو اعتقادات حضرت حسین اور ان کے اہل بیت کے بارے میں شیعہ حضرات رکھتے ہیں اُن اعتقادات کے ساتھ تو ان تفصیلات میں جانے کے

کوئی معنی ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان اعتقادات اور اس نقطۂ نظر کے بغیر ان تفصیلات میں جانا کوئی بامعنی کام نہیں ہوگا اس لیے ہم تفصیل برائے تفصیل کے بجائے اس روداد کی صرف وہی باتیں یہاں بیان کریں گے جن میں ہر اعتقاد اور ہر نقطۂ نظر کے لیے کوئی افادیت کا پہلو ہے۔

فرزدق سے ملاقات

فرزدق عربی شاعری کا مشہور نام ہے۔ حضرت علی اور آپ کے اہل بیت کے حامیوں میں سے تھا۔ عراق ہی وطن تھا۔ طبری نے دوران سفر حضرت حسین سے اسکی ملاقات بتانے والی دو روایتیں دی ہیں۔ ایک بتاتی ہے[1] کہ مقام صفاح پر اس کی ملاقات ہوئی (جو کہ حدودِ حرم سے باہر تقریباً دس میل کی مسافت پر ہے) اور اس ملاقات کے راوی ایسے دو کوفی ہیں جو یوم ترویہ میں مکہ مکرمہ پہنچے جو کہ حضرت حسین کی روانگی کا دن تھا۔ اور آپ کو رخصت کر کے حج کے قافلوں میں شامل ہو گئے۔ اس سفر کی بہت سی روایتیں انہی دو کے حوالے سے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم حج سے فارغ ہو کر تیزی سے حضرت حسین کے تعاقب میں نکلے ــــ شریک سفر ہونے کے لیے نہیں بلکہ تماشہ دیکھنے کے لیے کہ کیا ہوتا ہے۔ ہم "صفاح" پہنچے تو دیکھا کہ فرزدق ہے جو حضرت حسین سے مل رہا ہے۔ اور ان دونوں کی بات چیت ختم ہوئی تو حضرت حسین نے اپنی سواری کو حرکت دی اور السلام علیکم کہہ کر دونوں الگ ہو گئے۔ ان الفاظ سے صاف طور پر یہی مفہوم ہوتا ہے کہ فرزدق عراق کی طرف سے آرہا تھا جدھر کو حضرت حسین تشریف لے جا رہے تھے۔

عراق کی سمت سے آنے کا یہ کون سا وقت تھا۔ جبکہ حج ہو چکا ہے؟ اور حضرت کو صفاح پہنچتے پہنچتے جو کہ بمشکل دس میل پر ہے ایسے کتنے دن لگ گئے کہ وہ دو کوفی

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۱۸۔

(عبداللہ بن سُلیمؔ اور المذری بن مشمعل جو واقعہ کے راوی ہیں) حج کرنے کے بعد حضرت حسین کے پیچھے نکلے تو اُس وقت تک حضرت حسین کا قافلہ صفاح تک ہی پہنچا تھا؟ جبکہ یہ دونوں حج کے ارکان ادا کرنے کے بعد ۱۲ ذی سے پہلے نہیں روانہ ہو سکے ہوں گے۔ یعنی حضرت حسین کی روانگی کے چار دن بعد ان کی روانگی ہوئی ہو گی!

دوسری روایت[1] جس کا راوی خود فرزدق کو بتایا گیا ہے، وہ بتاتی ہے کہ فرزدق ۶۰ھ کے ایام حج میں (اپنی والدہ کو حج کرانے کے واسطے لیے ہوئے) حرم (یعنی حدودِ حرم) میں داخل ہوا تو اسے ایک قافلہ مکّے سے نکلتا ہوا ملا جو تلواروں اور ڈھالوں کے ساتھ تھا۔ معلوم کرنے پر کہ یہ کس کا قافلہ ہے پتہ چلا کہ حضرت حسین بن علیؓ کا۔ فرزدق نے لپک کر دعا سلام اور کچھ بات چیت کی۔ جس میں یہ سوال بھی تھا کہ اے ابن رسول اللہ آپ حج چھوڑ کے کہاں جارہے ہیں؟

پس پہلی روایت کے رو سے حج (یوم عرفہ) ہوئے بھی قریب چار پانچ دن ضرور ہو چکے تھے جب فرزدق عراق سے آتے ہوئے (صفاح کے مقام پر) حضرت حسین سے ملا۔ اور دوسری روایت کی رو سے فرزدق ۸ رذی الحجہ کو حرم شریف پہنچ گیا تھا اور حضرت حسین سے ملاقات مکہ سے آپ کے نکلتے وقت ہوئی۔

اور ایک تیسری روایت بھی ہے جو بعض شیعہ مصنفین نے اپنے مآخذ سے لی ہے[2]۔ وہ اس ملاقات کے واقعہ کی ایک تیسری شکل بتاتی ہے کہ فرزدق حج کر کے لوٹ رہا تھا۔ تب ایک پڑاؤ پر ملاقات ہوئی۔ غرض "شُد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیرہا" کا مضمون ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ یا کہہ لیجئے "اندھوں کی فیل شناسی" کہ جس اندھے نے ہاتھی کے جس حصّے کو چھوا اسی کی شکل وصورت اور سائز کو پورے ہاتھی کی شکل اور سائز بنا دیا۔

روداد سفر کی روایتوں کا یہی وہ حال ہے جس کی بنا پر عرض کیا گیا کہ بالکل قابلِ اعتبار

---

[1] ایضاً۔ [2] عبدالرزاق الموسوی المقرّم نے "مقتل الحسین" میں ص۱۷۵ پر۔

نہیں ہیں۔ فرزدق کی ملاقات کے سلسلے میں طبری کی دونوں روایتیں یہ بتاتی ہیں کہ حضرت حسین نے فرزدق سے پوچھا کہ "اپنے پیچھے (یعنی عراق میں) کیا حال چھوڑ کر آئے ہو؟" فرزدق نے جواب دیا کہ:

"دل آپ کے ساتھ ہیں اور تلواریں بنی امیہ کے ساتھ اور قضا و قدر اللہ کے ہاتھ میں۔ جس پر آپ نے فرمایا "سچ کہتے ہو" اور رخصت ہو گئے۔[1]"

یہاں قدرتی طور پر حیرت ہوتی ہے کہ حضرت حسین نے تو یہ سفر پوری طرح اس اطمینان پر شروع کیا تھا کہ کوفے کے لوگ آپ کی حمایت پر مستعد اور آپ کی آمد کے لیے چشم براہ ہیں پھر فرزدق کی اس سے بالکل مختلف بات پر اظہارِ تعجب کیے بجائے آپ نے تصدیق و تصویب فرمائی! بعد میں آنے والی کچھ اور روایات بھی ایسی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ فرزدق والی گفتگو کی شاید کوئی اصلیت نہیں ہے۔ یہ روایات آگے آرہی ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ فرزدق سے ملاقات سے کافی دنوں بعد تک حضرت حسین کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ اب کوفہ ان کے ساتھ نہیں ہے

انجامِ حضرت مُسلم کی خبر

حضرت حسین کا قافلہ کوفے کی طرف سرگرمِ سفر تھا۔ مُسلم بن عقیل کا خط ملنے کے بعد سے وہاں کے حالات میں جو تبدیلی ہوئی تھی مثلاً خود جناب مُسلم اور ہانی بن عروہ کو دی جانے والی سزائے موت، اس کا کوئی علم کسی ذریعہ سے نہ ہوا تھا۔ راہ میں ایک منزل زُبالہ آتی ہے جہاں سے کوفہ زیادہ دور نہیں رہتا۔ اس منزل پر آپ کو وہ قاصد[2] ملا جسے کوفے سے محمد بن اشعث نے مسلم بن عقیل کی وصیت کے مطابق ان کا یہ پیغام دے کر بھیجا تھا:

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۱۸   [2] طبری ج ۶ ص ۲۲۶۔

"میں یہاں گرفتار کیا جا چکا ہوں۔ آپ شاید چل بھی نہ پائیں کہ میرا قتل ہو جائے۔
پس آپ جہاں بھی یہ پیغام پائیں لوٹ جائیں۔ کوفہ والوں کا بھروسہ نہ کریں، ان
لوگوں نے آپ سے بھی جھوٹ بولا تھا اور مجھ سے بھی جھوٹ ہی بولا۔ اور یہ
تو آپ کے والد کے وہ ساتھی ہیں کہ جن کی وجہ سے وہ موت یا قتل کی تمنا کرنے
لگے تھے۔[۱]"

ایک روایت کے مطابق آپ نے درمیان سفر میں مقام حاجر سے اپنے رضاعی بھائی عبداللہ بن یقطر کے ہاتھ (یا حسب اختلاف روایت ایک دوسرے شخص کے ہاتھ) اہلِ کوفہ کے نام اپنی روانگی کی اطلاع بھی روانہ کی تھی۔ اسی منزل زُبالہ پر ان کے بارے میں بھی خبر ملی کہ وہ کوفے سے پہلے قادسیہ کے مقام پر گرفتار کر لیے گئے اور پھر مقتول ہوئے[۲]۔

ساتھیوں کو آگاہی

کہا گیا ہے اور بالکل قرین قیاس ہے کہ زُبالہ کی منزل پر یہ پوری صورت حال کو بدل دینے والی جو اطلاعات حضرت حسینؓ کو موصول ہوئیں تو آپ نے ضروری سمجھا کہ ساتھیوں کو آگاہ کریں اور اجازت دیں کہ اس نئی صورت حال میں جو شخص قافلے سے علاحدہ ہونا چاہے وہ علاحدہ ہو جائے۔ یہ بات روایات کے مطابق آپ نے خاص طور پر ان ساتھیوں کے پیش نظر کہی تھی جو راستے کی منزلوں پر آپ کے بارے میں یہ سمجھ کر ساتھ ہو گئے تھے کہ کوفہ آپ کے تابع ہے اور آپ وہاں حکومت کرتے جا رہے ہیں۔ اور یہ زیادہ تر بدوی لوگ تھے۔ جو منفعت کی امید میں ساتھ لگ گئے تھے۔ چنانچہ ایسے سب ہی لوگ یہ خبر سن کر منتشر ہو گئے اور آپ کے ساتھ شریک سفر صرف وہی لوگ رہے جو مکّہ سے ساتھ تھے[۳]۔

---

[۱] طبری ج ۶ ص ۲۱۱ [۲] ایضاً ص ۲۲۶ [۳] ایضاً

واپسی کا مشورہ

طبری نے اسی صفحہ (۲۲۶) پر اگلی روایت دی ہے کہ زبالہ کے بعد والی منزل بطن عقبہ پر قیام ہوا تو وہاں ایک شخص نے آپ کے حالات جاننے کے بعد باصرار مشورہ دیا کہ برائے خدا آگے نہ جائیے ان حالات میں آگے جانا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ آپ نے اس رائے سے اتفاق کیا مگر فرمایا کہ "اللہ کے ارادوں پر کوئی غالب نہیں ہو سکتا" اور سفر جاری رکھا۔

ایک صفحہ قبل یعنی (۲۲۵ پر) طبری نے ایک اور روایت بھی ایسے ہی مشورے کی نقل کی ہے، یہ مشورہ ان دونوں کوفیوں نے دیا تھا جن کا ذکر ہم نے فرزدق کی ملاقات والی روایتوں کے ضمن میں کیا ہے کہ یہ حج کے بعد سے حضرت حسین کے قافلے کے پیچھے بطور متلاشی لگ گئے تھے۔ ان کی روایت ہے کہ زَرُود کے مقام پر کوفے سے آنے والے ایک شخص سے ہم کو مسلم اور ہانی کے مارے جانے کی خبر ملی جو ہم نے ثَعْلَبِیَّہ[1] کی منزل پر حضرت حسین کی خدمت میں راز داری کے ساتھ پہنچائی اور پھر ذرا ساوقفہ دیکر عرض کیا کہ " للہ آپ آگے نہ جائیے۔ اب کوئی گنجائش نہیں ہے"۔ کہتے ہیں کہ سنتے ہی بنو عقیل چلائے کہ ہرگز نہیں والله ہم اس کے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یا تو اپنے بھائی مسلم کا انتقام لیں اور یا ہم بھی انکے والے انجام سے دوچار ہو جائیں"۔ کوفی راوی کہتے ہیں کہ اس پر آپ نے ہماری طرف دیکھا اور فرمایا کہ ان (بچوں) کے بعد بھلا زندگی میں کیا مزہ؟ یعنی آپ نے سفر جاری رکھنے کا فیصلہ فرمالیا۔ ص۲۲۶ والی روایت میں جو الفاظ بطن عَقَبَہ کی منزل کے آئے ہیں کہ "تم ٹھیک کہتے ہو مگر اللہ کے ارادوں پر کون غالب آسکتا ہے"؟ ان الفاظ کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ غالباً کوفیوں والی وہ روایت صحیح ہے جو ابھی گزری جس کے مطابق بظاہر آپ (دو منزلیں پہلے ثَعْلَبِیَّہ کے مقام پر) یہ فیصلہ کر لینا چاہتے تھے کہ آگے نہ بڑھا جائے مگر بنو عقیل

---

[1] ثَعْلَبِیَّہ اس راہ کی مشہور منزلوں میں ہے۔ مکہ کی طرف سے جانے میں زبالہ سے ایک منزل پہلے پڑتی ہے۔

کا رُخ دیکھ کر اس کو مناسب نہ سمجھا اور ان کے اصرار کو آپ نے سمجھا کر یہ تقدیرِ الٰہی ہے۔

حضرت محمد الباقر کی روایت

طبری نے روداد سفر اور واقعۂ شہادت کے سلسلے میں دوسری بہت سی روایتوں کے ساتھ ایک مسلسل روایت ٹکڑوں میں بانٹ کر حضرت حسین کے پوتے حضرت محمد الباقر کی بھی درج کی ہے، اس روایت کے پہلے ٹکڑے کا ایک اقتباس ہم پیچھے دے چکے ہیں (باب ۷) اس کے دوسرے ٹکڑے میں آتا ہے۔

فاقبل حسین بن علی بکتاب	حسین بن علی، مسلم بن عقیل کا خط پانے
مسلم بن عقیل کان الیہ حتیٰ	کے بعد کوفے کی طرف متوجہ ہو گئے حتیٰ کہ
اذا کان بینہ وبین القادسیۃ	جب آپ وہاں پہنچے کہ قادسیہ[1] کے اور
ثلثۃ امیال لقیہ الحر بن یزید	آپ کے درمیان بس تین میل کا فاصلہ
التمیمی فقال لہ این ترید	تھا تو وہاں حُر بن یزید التمیمی سے ملاقات
قال اریدھٰذا المصر قال	ہوئی۔ حُر نے دریافت کیا، کہاں
لہ ارجع فانی لم ادع لک	کا ارادہ ہے؟ فرمایا اسی شہر کا۔ حُر
خلفی شیئًا ارجوہ فھمّ ان	نے عرض کی، آپ لوٹ جائیں اسلیے
یرجع وکان معہ اخوۃ مسلم	کہ میں (جو وہیں سے آرہا ہوں) آپ
بن عقیل فقالوا واللہ لانرجع	کے لیے کوئی اچھی صورت حال چھوڑ کر
حتی نصیب بثأرنا	نہیں آرہا ہوں۔ اس پر آپ نے واپسی
او نقتل، فقال لاخیر فی	کا ارادہ فرمایا۔ لیکن مسلم بن عقیل کے

---

[1] قادسیہ اسلامی تاریخ فتوحات کا نہایت مشہور نام ہے۔ کوفے سے تقریباً ۴۵۔۵۰ میل بجانب جنوب مغرب اس کا محل وقوع ہے، اس میں گزر کر ہی کوفے کا سیدھا راستہ مکے سے تھا۔

حیاتنا بعد کم فساد ... [1] | بھائی آپ کے قافلے میں تھے، وہ بولے کہ خدا کی قسم ہم تو بغیر بدلہ لیے یا اپنی جان دیئے نہیں واپس ہوں گے، تب آپ نے فرمایا کہ تمہارے بعد میرے لیے زندگی میں کیا مزہ ہے؟ اور یہ کہکر آپ آگے کو چل دیئے۔

حضرت محمد الباقر کی اس روایت کے بعد۔ جو اگر سنداً صحیح روایت ہے، اور یقیناً انہوں نے اپنے والد ماجد حضرت علی بن الحسین (زین العابدین) سے سنی ہوگی جو اس سفر میں اپنے والد ماجد حضرت حسین کے ساتھ تھے [2] ۔ یہ بات بالکل یقینی ہو جاتی ہے کہ حضرت حسین نے حالات کے مکمل انقلاب کا علم و یقین حاصل ہو جانے کے بعد واپسی کا ارادہ فرمایا تھا۔ اگرچہ وہ برادرانِ مسلم کی وجہ سے عمل میں نہ آسکا۔

سمتِ سفر کی تبدیلی اور نزول کربلا

جیسا کہ اوپر کی روایت میں آیا آپ نے برادرانِ مسلم کی بات سن کر واپسی کا ارادہ ترک کیا اور آگے کو چل دیئے۔ مگر پھر یہی روایت بتاتی ہے کہ آگے کو بڑھتے ہی ابن زیاد کا گھڑسوار دستہ سامنے آگیا ـــ جو قادسیہ میں متعین تھا ـــ اسے دیکھ کر آپ نے اپنا رُخ قادسیہ اور کوفے سے ہٹا کر کربلا کی طرف کر دیا [3] ۔

---

[1] طبری ج ۶ صفحہ ۲۲۰   [2] خود محمد الباقر بھی اُس وقت دو ڈھائی سال کی عمر کے تھے، یعنی قافلۂ کربلا میں شامل تھے۔   [3] کربلا قادسیہ سے بجانب شمال اور کوفے سے بجانب شمال مغرب ۱۲۔۱۰ کلومیٹر آگے ہے۔ اور حضرت حسین جنوب مغرب سے کوفہ کی طرف کو بڑھ رہے تھے۔

فسار فلقيه اوائل خيل عبيد الله فلما رأى ذالك عدل الى كربلاء فاسند ظهره الى قصباء وخلا كي لا يقاتل الا من وجه واحد فنزل وضرب ابنيته وكان اصحابه خمسة واربعين فارسا ومائة راجل [1]

(پس آپ آگے کو چل دیئے) مگر چلتے ہی آپ کو عبید اللہ بن زیاد کا مقدمۃ الجیش نظر آیا۔ اسے دیکھ کر آپ نے کربلا کی طرف رُخ موڑ لیا۔ وہاں آپ نے بانس اور نرکل کے جنگل کو اپنی پشت پر لیا اور مضبوطی سے جم گئے تاکہ دشمن سوائے ایک طرف کے کہیں اور سے حملہ نہ کر سکے۔ یہاں نزول فرما کر آپ نے اپنے خیمے لگوا دیئے اور آپ کے ساتھی پینتالیس ۴۵ سوار اور سو ۱۰۰ پیادے تھے۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۲۰

بابِ دہم ۱۰

کربلا کی سرگذشت

عمرو بن سعد کی آمد

حضرت محمد الباقر کی جس روایت کے الفاظ پر گذشتہ باب بند ہوا ہے، اسی روایت میں آگے بیان ہوا ہے کہ عمر بن سعدؓ بن ابی وقاص جن کو ابن زیاد رَےؔ[1] کا حاکم بنا کر بھیج رہا تھا، حضرت حسین کا معاملہ سامنے آجانے پر اپنی ابن سعد کو یہ حکم ہوا کہ پہلے تم اس معاملے سے نپٹتے جاؤ (عربی کے الفاظ ہیں اکفنی ھٰذا الرجل) انھوں نے اس خدمت سے معافی چاہی، مگر مجبور ہونا پڑا اور حضرت حسین کے نزول کربلا کی اطلاع پاکر کربلا کا رُخ کیا۔

صلح کی بات اور ناکامی

فلمّا اتاہ قال لہٗ الحسین	پس جب ابن سعد وہاں پہنچ گئے تو
اختروا احدٰۃ امّا ان تدعونی	حضرت حسین نے اُن سے کہا کہ تین باتوں[2]
فاصرف من حیث جئت	میں سے ایک قبول کرلو یا تو میں جہاں
اما ان تدعونی فاذھب	سے آیا ہوں وہاں واپس ہوجانے دو
الیٰ یزید واما ان تدعونی	یا یزید کے پاس چلا جانے دو اور یا

[1] فارس کا ایک اہم شہر جو اب تہران سے تین میل کے فاصلے پر ایک مضافاتی بستی ہے۔

فالحق بالثغور[۱] | کہو تو سرحدوں کی طرف (جہاں میدان جہاد گرم ہے) نکل جاؤں۔

عمرو نے آپ کی اس پیش کش کو قبول کر کے ابن زیاد کو اطلاع بھیجی۔ مگر وہاں سے جواب آیا کہ یوں نہیں، بلکہ انھیں پہلے "میرے ہاتھ میں ہاتھ رکھنا ہوگا" "لا ولا کرامۃ حتی یضع یدہٗ فی یدی۔"

فقال لہٗ الحسین لا و اللہ لا یکون ھٰذا ابداً[۲] | اس پر حسین نے کہا کہ نہیں، یہ تو بخدا کبھی نہیں ہوگا۔

ایک دوسری روایت سے تائید

حضرت محمد الباقر کی روایت کے بعد طبری نے انہی کی روایت کی طرح کی ایک جامع روایت (جس میں اول سے آخر تک کا قصہ اختصار سے بیان کیا گیا ہے) اور درج کی ہے اس کے راوی حُصَین بن عبدالرحمٰن ہیں[۳] اس سے بھی واقعہ کی صورت تقریباً یہی معلوم ہوتی ہے جو مندرجہ بالا روایت سے سامنے آئی۔ اس میں ہے کہ "حضرت حسینؓ اپنی منزل کی طرف وہاں کے حالات سے بالکل بے خبر گامزن تھے۔

حتیٰ لقی الاعراب فسألھم فقالوا واللہ ماندری غیر انّا لانستطیع ان نلج ولا نخرج | یہاں تک کہ کچھ اعرابی ملے اور آپ نے ان سے حالات کی بابت سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ حضور ہمیں

---

[۱] طبری ج ۶ ص ۲۲۰ [۲] ایضاً۔ [۳] حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی صاحب لکھنوی (م ۱۳۸۱ھ) جو پیش نظر موضوع پر اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں اُن کی تحقیق کے مطابق واقعہ کربلا کی تمام روایتوں میں صرف حضرت محمد الباقر کی اور حُصین بن عبدالرحمٰن ہی کی یہ دو روایتیں سند کے اعتبار سے صحیح اور بے عیب ہیں۔

فانطلق يسير نحو طريق الشام نحو يزيد فلقيتهٔ الخيول بكربلاء فنزل يناشدهم الله والاسلام قال وكان بعث اليه عمر بن سعد و شمر بن ذی الجوشن وحصين بن نُمير فناشدهم الحسين الله والاسلام ان يسيّروهٗ الیٰ امیر المؤمنين فيضع يدهٗ فی يدهٖ فقالوا الا الا علیٰ حکم بن زیاد۔[2]

اندر کی تو خبر نہیں البتہ اتنا جانتے ہیں کہ نہ ہم اِدھر سے اُدھر جا سکتے ہیں اور نہ اُدھر سے اِدھر آسکتے ہیں[1]۔ اس پر آپ نے شام کے راستے کی طرف یعنی یزید کی طرف کو چلنا شروع کیا اور اسی اثنا میں مقام کربلا میں آپ کو گھڑ سوار دستوں کا سامنا ہوا۔ پس آپ اترے اور انھیں اللہ اور اسلام کا واسطہ دیکر سمجھانے لگے۔ راوی کا مزید بیان ہے ابن زیاد نے عمر بن سعد، شمر بن ذی الجوشن اور حُصین بن نُمیر کو کربلا بھیجا تھا۔ سو آپ نے انکو اللہ اور اسلام کا واسطہ دیکر کہا کہ آپکو امیر المؤمنین (یزید) کے پاس جانے دیں، وہاں آپ اپنا ہاتھ انکے ہاتھ میں دیدیں گے۔ مگر ان لوگوں نے کہا کہ نہیں پہلے آپ کو ابن زیاد کا حکم ماننا ہوگا (یعنی ان کے پاس چلنا ہوگا)

---

[1] یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ یہ بات چیت قادسیہ کے قریب ہی کہیں ہو رہی ہے جو کوفے کا ناکہ تھا اور جہاں روک تھام کے انتظامات تھے۔

[2] طبری ج ۶ ص ۲۲۲ اس روایت میں تین صورتوں کے بجائے صرف یزید کے پاس جانے والی صورت کا ذکر ہونے کی وجہ شاید یہ ہو کہ یہ تینوں صورتوں میں سب سے زیادہ اہم اور قابل ذکر چیز تھی۔ واللہ اعلم۔

اس روایت میں اس بات کا ذکر نہیں ہے، جو اوپر والی روایت میں تھا کہ عمر بن سعد نے تو حضرت حسین کی پیش کش (یامصاحتی فارمولہ) قبول کر لیا تھا مگر ابن زیاد نے اُسے رد کر کے واحد صورت یہ تجویز کی کہ وہ کوفے آکر پہلے اُس کے ہاتھ میں ہاتھ دیں۔ بعد میں ان کے مستقبل کا فیصلہ ہوگا۔ مگر یہاں اس بات کا ذکر نہ ہونا کہ عمر بن سعد نے تو قبول کیا تھا مگر ابن زیاد نے رد کر دیا۔ صرف بر بنائے اختصار ہی سمجھا جانا چاہیے، ورنہ ایسی کوئی ایک روایت بھی نہیں ہے جس کی بنا پر یہ خیال کرنے کی گنجائش ہو کر عمر بن سعد کو لڑائی ٹالنے سے نہیں بلکہ برپا کرنے سے دلچسپی تھی۔ ابن سعد سے متعلق تمام روایتیں اس کی شہادت دیتی ہیں کہ وہ ہر ممکن طریقے پر خواہش مند تھا کہ اسکے نامۂ اعمال میں قتلِ حسینؓ نہ لکھا جائے۔ اگرچہ اس معاملے میں حکومت کو ناراض کرنے کی حد تک جانے کو تیار نہ تھا۔

جنگ اور شہادت

حضرت محمد الباقر کی روایت میں اوپر گزر چکا ہے کہ ابن زیاد کی طرف سے یہ شرط کہ "پہلے حسین اُس کے قیدی بن کر کوفے آئیں بعد میں ان کی سرزنجی پیش کش پر غور کیا جائے گا" حضرت حسین کو منظور نہیں ہوئی اور فرمایا "لا واللہ لا یکون ھٰذا ابداً" اس کے بعد بیان ہوا ہے

فقاتلہ فقتل اصحاب الحسین	جس پر عمر نے آپ سے جنگ کی (یا آپ
کلھم وفیھم بضعۃ عشر شاباً	نے عمر سے جنگ کی) اور اس میں تمام
من اھل بیتہ وجاء سھمٌ	رفقائے حسین شہید ہوئے اور ان میں
فاصاب ابناً لہٗ معہٗ فی حجرہ	۱۵۔۲۰ کے درمیان جوان آپ کے
فجعل یمسح الدم عنہ	اہلبیت میں سے تھے۔ اور ایک تیر آکے

ويقول اللهم احكم بيننا وبين	آپ کے ان صاحبزادے کو لگا جو آپ کی گود
قوم دعونا لينصرونا نقتلونا	میں تھے، آپ صاحبزادے کا خون پونچھتے
ثم امر بحبرة فشقها	جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے کہ اے
ثم لبسها وخرج بسيفه	اللہ تو ہی انصاف کیجئے ہمارے اور ان
فقاتل حتى قتل. صلوات	لوگوں کے درمیان جنھوں نے ہماری
الله عليه۔[1]	مدد کے وعدے پر ہمیں بلایا اور پھر
	قتل کیا، پھر آپ نے ایک چادر طلب کرکے
	اُسے پھاڑا اور اپنے اوپر لپیٹا پھر تلوار
	لیکر نکلے اور قتال کیا حتی کہ شہید ہوئے۔
	صلوات اللہ علیہ۔

حُصین بن عبدالرحمٰن کی روایت میں اس موقع پر ذرا سی اور تفصیل ہے، اُس میں کہا گیا ہے کہ ابن زیاد نے جو لشکر حسینی قافلہ کی گرفتاری کے لیے بھیجا تھا اس میں ایک صاحب حُرّ بن یزید حنظلی بھی تھے جو ایک سوار دستے کے سالار تھے۔ انھوں نے جب یہ صورت حال دیکھی کہ حضرت حسینؓ کی بات رد کی جارہی ہے تو معاملہ میں مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ یہ کیا غضب ہے!

والله لوسألكم هذا الترك	یہ بات تو اگر تم سے تُرک اور دُیلَم (کے
والديلم ما حل لكم ان	کافر) بھی مانگتے تو اُن کا سوال بھی رد
تردوه۔[2]	کرنا تمہیں روا نہ تھا۔

مگر ہائی کمان کے ان تینوں افراد (عمر، شمر، حُصَین) نے اپنی بات پر اصرار جاری رکھا[3] جس پر

[1] طبری ج ۶ ص ۲۲۰ [2] ایضاً ص ۲۲۲۔ [3] بعض دوسری روایات میں یہ بات اس طرح بیان ہوئی ہے کہ حُرّ نے یوم عاشورہ کی صف آرائی کے وقت ابن سعد (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

حُرّ نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی، اور حضرت حسین کی صفوں میں پہنچ گیا اور وہاں سے پلٹ کر ابن زیاد کے لشکر پر حملہ آور ہوا۔

فصرف الحرّ وجه فرسه	ایسر حُرّ نے اپنے گھوڑے کا رخ پھیرا
وانطلق الی الحسین واصحابه	اور حسین اور انکے ساتھیوں کی طرف چلا
فظنّوا انّه انّما جاء لیقاتلهم	اُن لوگوں نے گمان کیا کہ یہ شخص اُن سے
فلمّا دنا منهم قلّب ترسه	لڑنے آرہا ہے مگر قریب پہنچ کر حُرّ
وسلّم علیهم ثمّ کرّ علی اصحاب	نے اپنی ڈھال کو اُلٹ دیا (جو دوست،
ابن زیاد فقاتلهم فقتل منهم	نہ کہ دشمن ہونے کی علامت تھی) اور
رجلین ثم قتل رحمة الله	سلام کیا اس کے بعد وہ اصحابِ ابن
علیه[1]	زیاد پر پلٹا اور حملہ کر کے دو آدمی مارے
	اور پھر خود بھی جان دیدی۔

حُصین بن عبدالرحمٰن کی روایت کے اس زائد حصّے سے یہ سمجھنا ممکن ہوتا ہے کہ کربلا کی جنگ کا آغاز شاید حُرّ بن یزید کی تلوار سے ہوا مگر کسی دوسری روایت سے اس کی تائید نہیں ہوتی بلکہ اس سے مختلف شکل سامنے آتی ہے جبکہ اس روایت کا بیان اتنا تشنہ ہے کہ محض اس کی بنیاد پر اس میں درج واقعہ کو جنگ کا آغاز قرار دینا مشکل ہے۔

حُرّ بن یزید دوسری روایات میں

حُرّ بن یزید کا تذکرہ واقعۂ کربلا کی دوسری روایات میں بہت زیادہ تفصیل کے ساتھ پایا جاتا ہے، اور ماتمِ حسین کی مجلسوں میں انصارِ حسینؓ کے جب نام آتے ہیں، تو وہاں یہ

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) امیرِ لشکر کو مخاطب کر کے یہ بات کہی تھی، اور ابن سعد ہی نے صرف جواب دیا تھا جو یہ تھا کہ میں تو خود یہی چاہتا تھا مگر میرا اختیار نہیں ہے۔ [1] طبری ج ۶ ص ۲۲۲۔

ایک بہت نمایاں نام ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں پہلی تفصیلی روایت یہ ہے کہ عمر بن سعد کے فوجی دستوں سے پہلے ایک گھڑ سوار دستے نے آکر حضرت حسینؓ کا راستہ روکا تھا، یہ دستہ حُر بن یزید ہی کی قیادت میں تھا۔ اس روایت کے مطابق اس دستے کا اور قافلۂ حسینی کا سامنا کربلا سے کچھ دور پہلے ذو حُسُم پہاڑ کے دامن میں ہوا۔ یہ دستہ اس اطلاع پر کہ حضرت حسین نے اپنا رُخ کوفے سے موڑ کر اس راہ پر کر دیا ہے جو شام اور دمشق کو جاتی ہے، اس مقصد سے قادسیہ سے دوڑایا گیا تھا کہ ان لوگوں کو حراست میں کوفہ لائے۔ حضرت حسین نے اس بات سے انکار کر کے مکّہ کو واپسی کا ارادہ کیا تو حُرّ اس میں حائل ہوا۔ لیکن دل میں نرمی تھی، کسی بڑی سختی پر آمادہ نہ ہو پایا اور بیچ کی راہ یہ نکالی کہ نہ آپ کوفے جائیں نہ ہی مکّے کو، بلکہ ایک بَین بَین راستے پر ہم دونوں ہلکے ہلکے چلتے ہیں حتیٰ کہ میں ابن زیاد کو خط بھیج کر موجودہ صورتِ حال میں اس کا نیا حکم حاصل کر لوں۔ روایت کہتی ہے کہ یہ حکم آیا کہ جہاں ہو وہیں قافلے کو روک لو اور انتظار کرو۔ چنانچہ حُرّ نے جو ابن زیاد کا حکم آپ کو پہنچایا اور مزید کسی رعایت سے معذوری ظاہر کی، تو اگرچہ آپ کے کچھ ساتھیوں کی رائے نہ تھی کہ اس حکم کے مطابق اسی جگہ پر رُک جانا قبول کیا جائے۔ بلکہ وہ چاہتے تھے کہ کسی مناسب اور اپنی پسند کی جگہ تک پہنچنے کی کوشش کی جائے، اگرچہ اس میں حُرّ کے دستے سے جنگ ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ مگر حضرت حسینؓ نے کسی طرح کی جنگ آزمائی کو مناسب نہ جانا اور حُرّ نے جہاں کہا وہاں آپ ٹھہر گئے ۔۔۔ اور یہ کربلا کا میدان تھا۔[1]

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۳۲۔ کربلا کے متعلق روایتوں میں یہ بھی ہے اور اسکی بیحد شہرت ہے کہ یہ بے آب و گیاہ ریتیلا میدان تھا۔ مگر واقعہ میں یہ بات بے اصل ہے۔ خود حضرت محمد الباقرؒ والی روایت کے الفاظ کہ وہاں بانس و نرکل (قصباء) کا جنگل تھا اسکی تردید کرتے ہیں۔ بعض روایتوں میں آپ کے مقام نزول کو نینویٰ بھی بتایا گیا ہے۔ معجم البلدان کے مطابق یہ نینویٰ ایک وسیع علاقہ ہے جس میں کربلا کا قریہ واقع تھا۔ یہ وہ نینویٰ نہیں ہے جو شہر موصل کے پاس مشہور شہر اور ایک پرانی تہذیب کا مرکز ہے ۔۔۔ ج ۲ ص ۲۱۵

آپ کے اس نزول ــــ نزول کربلا ــــ کی تاریخ ۲ محرم یوم پنجشنبہ ۶۱ھ درج ہوئی ہے۔ اور طبری نے چونکہ حُرّ سے متعلق یہ روایت "۶۱ھ کے واقعات" کا عنوان قائم کر کے دی ہے۔ اس لیے سمجھنا چاہیے کہ حُرّ کے دستے سے آپ کے قافلے کا سامنا یکم محرم ۶۱ھ کو ہوا۔ یعنی اس سے پہلے نہیں۔ اس کے بعد روایت کا سلسلۂ بیان کہتا ہے کہ اگلے دن یعنی ۳ محرم یوم جمعہ کو ــــ عمر بن سعد کی سرکردگی میں چار ہزار نفوس پر مشتمل مزید فوجی دستے پہنچ گئے۔

دونوں روایتوں میں تطبیق

حصین بن عبدالرحمٰن کی روایت اور دوسری روایتوں میں جو فرق پایا جاتا ہے اُسے ہم اجمال اور تفصیل کا فرق کہہ سکتے ہیں۔ بایں معنی کہ حُرّ بن یزید کا پورا قصّہ اسی تفصیل کے مطابق ہو جو ابھی اوپر بیان ہوئی لیکن حُصین بن عبدالرحمٰن کی روایت میں اس کا اختصار کر کے بس حُرّ کی موجودگی میدان کربلا میں دکھائی گئی ہے۔

حُرّ کے کردار کی کچھ اور تفصیلات

لیکن اس موجودگی کے بعد حُرّ کے جس خاص کردار کا بیان حُصین کی روایت میں ہوا ہے کہ وہ اپنے دستے کی قیادت چھوڑ کر حضرت حسینؓ کی صفوں میں جا ملے اور پھر اُدھر سے پلٹ کے عمر بن سعد کے لشکر پر حملہ آور ہوئے، اس کردار کی جو تفصیلی شکل طبری کی دوسری روایتوں میں بیان ہوئی ہے وہ ایسی نہیں ہے کہ جسے تفصیل اور اجمال کا فرق کہہ کر قبول کر لیا جائے بلکہ یہ دراصل میدان کربلا کے واقعات کی اُس "تفصیل" کا حصّہ ہے جس کا وجود بظاہر عالم واقعہ میں نہیں ہوا بلکہ وہ مصنّفین مَقاتل یا ان کے "راویوں" کی قوت تخیّل کا کرشمہ ہیں۔

اس نوعیت کی "تفصیلی" روایتوں کے مطابق جن کا سلسلہ طبری میں صفحہ ۲۲۴ سے

تقریباً ۲۶۸ تک یعنی تیس۳۰ پینتیس۳۵ صفحات میں پھیلا ہوا ہے) حُرّ نے یومِ عاشورہ میں عین اس وقت جبکہ دونوں طرف صف بندی ہو چکی تھی اپنے سردارانِ لشکر کی آنکھوں کے سامنے بڑی باریک حکمتِ عملی سے کام لیکر اپنی صف کو پار کیا اور صفِ حسینی میں جا پہنچے۔[۱] اوّلاً معافی تلافی کی کہ یہ میرا ہی قصور ہے جو آپ کو آج یہ صورتِ حال درپیش ہے۔ ورنہ میں اگر آپ کا راستہ نہ روکتا تو آپ سلامتی کے ساتھ واپس ہو چکے ہوتے۔ اس کے بعد اپنی معافی اور توبہ کی قبولیت کا اطمینان حضرت حسینؓ کی زبان سے حاصل کیا۔ پھر پلٹ کر لشکر ابن زیاد کی طرف گئے اور ایک تقریر ان کو مخاطب کر کے کی:۔

"اے لوگو، تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ حسین کی پیش کردہ باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی تم قبول نہیں کرتے ــ" لوگوں" نے کہا کہ" ہمارے امیر عمر بن سعد سے بات کرو۔ پس انھوں نے عمر کو مخاطب بنا کر یہی بات کہی۔ عمر نے جواب دیا کہ" مجھے تو خود بیحد خواہش تھی، اگر میرے بس میں بات ہوتی"" اس پر حُرّ پھر عام لوگوں سے مخاطب ہو گئے کہ" اے کوفیو خدا تمھیں غارت کرے۔ تم نے اِن کو بلایا اور بلا کر دشمن کے حوالے کر دیا۔ تم نے دعویٰ کیا تھا کہ تم اپنی جانیں اِن پر قربان کرو گے۔ اور اب تم اُلٹا ان کو قتل کرنے کے درپے ہو۔ تم نے انہیں گھیر لیا ہے اور گھوٹ کے مارنا چاہتے ہو۔ اللہ کی لمبی چوڑی زمین میں سے کسی طرف کو چلے جانے کا اذن نہیں دے رہے کہ وہ اور ان کے اہلبیت امن پائیں۔ تم نے ان کو ایسا بے بس قیدی بنا لیا ہے کہ اپنے نفع نقصان کا کچھ بھی اختیار ان کو نہیں رہ گیا۔ تم نے اُن کو، انکی عورتوں اور ساتھیوں کو فرات کے اس بہتے پانی سے محروم کر رکھا ہے، جسے یہودی مجوسی اور نصرانی بھی پیتے ہیں اور علاقے کے خنزیر اور کُتّے اس میں لوٹتے ہیں ادھر یہ ہیں کہ پیاس سے مرے جاتے ہیں۔ کیا ہی بُرا سلوک ہے جو تم نے ذریت

---

[۱] اس حکمتِ عملی کی تفصیل خاصی طویل ہے۔ طبری ج ۶ ص ۲۴۴۔

محمدؐ کے لیے روا رکھا ہے، خدا انھیں بھی (قیامت کی) پیاس کے دن پانی کے قطروں کو ترسائے۔ اگر تم اس وقت کا رویّہ چھوڑ کر اس سے توبہ نہیں کرتے ہو[۱]۔"

اور سب باتیں چھوڑیئے اس بات کا یقین تو درکنار، کیا امکان بھی مانا جا سکتا ہے کہ لشکر کا ایک افسر عین میدان جنگ میں کھلی غدّاری کر کے "دشمن" کی صفوں[۲] کا حصّہ بن جائے اور لشکر کا افسر بالا نہ صرف یہ کہ دشمن کی صفوں سے اس کی تقریر سننے اور اپنے فوجیوں کو سننے دینے کے لیے تیار ہو جائے، بلکہ اس کے جواب میں ایسے الفاظ بھی کہے کہ:۔

"تم جانتے ہو کہ میرے بس میں کچھ نہیں۔ ورنہ میں تو شروع ہی سے اس بات کا حامی اور حریص ہوں کہ حسینؓ کی تین باتوں میں سے کوئی ایک بات مان لیجائے"؟

ظاہر ہے کہ یہ تو عام حالات میں بھی ایک ناقابلِ تصوّر بات ہے۔ مگر یہاں تو حالات بھی عام قسم کے نہ تھے۔ اسی تاریخ طبری کی روایات کے مطابق یہ صورتِ حال تھی کہ عمر بن سعد کی ہر ممکن کوشش کے باوجود کہ اُسے اس مہم پر نہ بھیجا جائے ابن زیاد نے مجبور کر کے بھیجا تھا۔ پھر جب انھیں روایتوں کے مطابق[۳] اس نے حضرت حسین کی طرف سے مصالحت کی پیش کش اور اُس کا فارمولا اپنی سفارش کے ساتھ ابن زیاد کو بھیجا تو وہاں سے جواب آیا تھا کہ:۔

"میں نے تم کو اس لیے نہیں بھیجا تھا کہ تم وہاں جا کر اپنی بچت کی راہیں نکالو، حسین کو ڈھیل دو اور بقا و سلامتی کے خواب دکھاؤ، نہ اسلیے کہ وہاں جا کر اُن کے سفارشی بن بیٹھو۔ دیکھو اگر حسین اور ان کے ساتھی میرا حکم مانتے اور اپنے آپکو سپرد کر دیتے ہیں تو انھیں یہاں بھیجدو۔ ورنہ ان پر یلغار کر دو اور نہ صرف قتل کر دو بلکہ ان کا مُثلہ کرو (ناک کان کاٹو) اسلیے کہ یہ اسی کے قابل ہیں، اور خاص کر

---

[۱] طبری ج ۶ صفحہ ۲۴۵ [۲] غلط فہمی نہ ہو یہاں "دشمن" کا لفظ ابن زیاد کی فوج کے نقطۂ نظر سے اور اس کے احساس کی ترجمانی کے طور پر لکھا گیا ہے۔ [۳] جی ہاں "انہی روایتوں کے مطابق" ورنہ آگے جو بات نقل کی جا رہی ہے اس مصنّف کے نزدیک اسکا بیشتر حصّہ تو بالکل من گھڑت ہے اور ہو سکتا ہے کہ کُل ایسا ہی ہو۔

حسین قتل ہوں تو ان کا سینہ اور پشت گھوڑوں سے روند و۔ اسلیے کہ وہ حکومت کے نافرمان، باغی، حریف اور نہایت خطا کار ہیں[1]۔"

نیز یہ بھی اس سلسلے کی روایات میں موجود ہے کہ ابن زیاد نے یہ جوابی خط شمر ذی الجوشن کو اس ہدایت کے ساتھ دیکر کربلا روانہ کیا تھا کہ اگر عمر بن سعد پھر بھی لیت و لعل کرے تو **لشکر کی کمان تم ہاتھ میں لو اور عمر کا سر کاٹ کر ہمارے پاس بھیج دو**[2]۔

چنانچہ جیسا کہ حصین بن عبدالرحمٰن کی روایت میں اوپر گزرا اور اس کے سوا بھی طبری کی متعدد روایتیں یہی بات بتاتی ہیں کہ عمر بن سعد حضرت حسین کی پیش کش قبول کرنے سے عذر کر کے ان کے سامنے بس یہی ایک فیصلہ کن بات رکھنے پر مجبور ہوئے کہ آپ اپنے آپکو ابن زیاد کے حکم کے مطابق (جو سرکار یزید کی طرف سے حضرت حسین کے معاملے میں کلّی (FULLY) مختار بنا دیئے گئے ہیں) ہمارے حوالے کر دیں۔

کیا کوئی امکان ان حالات میں اس بات کے سوچے جانے کا ہے کہ اسی عمر بن سعد نے اپنے لشکر کے ایک باغی کی نہ صرف تقریر خود سنی اور اپنے لشکر کو پورے سکون و اطمینان سے سننے دی بلکہ نہایت ندامت کے ساتھ علی الاعلان یہ جواب بھی دیا کہ "میں کیا کروں مجبور ہوں؟" ہاں یہ بات ہو سکتی تھی جبکہ مان لیا جائے کہ عمر بن سعد کو گرفتاری یا جنگ کیلئے نہیں بلکہ صلح کی گفت و شنید کے لیے بھیجا گیا تھا مگر ایسی صورت میں ۴۔۵ ہزار فوج کی کوئی تُک نہ بیٹھے گی۔

ایک اور روایت اس قصے کو اور بھی زیادہ ناقابل تصوّر بنانے والی سن لیجے" طبری کی اسی جلد ص۲۲۲ پر ہے کہ عمر بن سعد اپنے ساتھیوں کے ساتھ گرمی دور کرنے کے لیے نہر میں گھسے ہوئے تھے کہ ایک شخص نے آ کر کان میں کہا: امیر ابن زیاد نے جُویریہ بن بدر

---

[1] طبری ج ۶ ص۲۳۶ [2] ایضاً۔

تمیمی کو اس ہدایت کے ساتھ آپ کے پاس بھیجا ہے کہ آپ (عمر) اگر حسین اور ان کے ساتھیوں سے جنگ نہیں کرتے ہیں تو وہ آپ کی گردن مار دے۔ عمر نے یہ سنا تو کود کر اپنے گھوڑے کی طرف آئے، سوار ہوئے اور گھوڑے ہی پر بیٹھے بیٹھے ہتھیار منگا کر سجائے اور لشکر لے کر حسینی قافلے پر پہنچے اور جنگ کی"۔ ذرا غور کر لیجئے کہ ایک طرف یہ روایتیں اور ایک طرف وہ روایتیں! کیا کوئی بھی صورت دونوں کے بیک وقت درست ہونے کی ہے؟[ل]

اور یوم عاشورہ کی باقی کہانی

حیرت مصنفین مقتل حسینؓ یا ان کے راویوں پر نہیں، جنھوں نے واقعۂ کربلا کو ایک بھرپور رزمیہ داستان کا روپ دینے کے جوش میں اس کے مبیّنہ واقعات کے سلسلے میں امکان اور عدم امکان سے بحث نہیں رکھی۔ حیرت اپنے مؤرخین پر ہے کہ یہ باہم متضاد اور ناممکن الوقوع قسم کی حکایتیں قطار در قطار انھوں نے اپنی کتابوں میں جمع کرلی ہیں۔ جیسے حُرّ کی تقریر کی یہ روایت ہے ایسے ہی انھیں حالات میں جن کی طرف اوپر دو تین اشارے کیے گئے، کتنی ہی روایتیں اور حکایتیں ہمیں حضرت حسین اور ان کے ساتھیوں کی کتنی ہی چھوٹی بڑی تقریریں سناتی ہیں۔ دو دو آدمی عمر بن سعد کی گردن مارنے کا حکم لیے ہوئے موجود ہیں۔ اور ایک تو ان میں شمر جیسا بدنام بھی ہے۔ مگر ابن سعد ہیں کہ نہ صرف حسینؓ کے خلاف تلوار آزمائی میں "بدستور" دیر لگا رہے ہیں بلکہ اس طرح دیر لگا رہے ہیں کہ اپنے فوجیوں کو وہ تقریریں سنواتے ہیں جو انھیں بغاوت پر آمادہ

ل اور یہ تمام گفتگو حُرّ کے بارے میں اس بنیاد پر ہو رہی ہے کہ وہ ابن زیاد کا ایک فوجی افسر تھا جیسا کہ مشہور روایات میں ہے۔ مگر یاد کیجئے حضرت محمد الباقر والی روایات سے اس کی رو سے یہ شخص مخالف فریق سے کوئی تعلق ہی نہ رکھتا تھا ایک عام آدمی تھا، جو کوفے کی طرف سے آتا ہوا حضرت حسینؓ کو ملا تھا۔

کرنے کے لیے "دشمنوں" کی صفوں سے کی جا رہی ہیں، اہل تشیع اپنے ائمہ کے لیے معجزات کا ویسے ہی عقیدہ رکھتے ہیں جیسے ہم انبیاء علیہم السلام کے لیے[1] وہ اگر ان ناممکنات کے قائل ہیں اور ایک ہی وقت میں متضاد باتوں کے وقوع کا بیان منبر پر کرتے ہیں تو ٹھیک ہیں وہ بطور معجزۂ امام ان باتوں کا قائل اپنے آپ کو کر سکتے ہونگے، مگر ہم لوگ جو ان "ائمہ" کے لیے تمام تر احترام کے باوجود کوئی معجزہ نہیں مانتے وہ کیسے انتہائی درجہ کی ان متضاد روایتوں کو اپنے دل و دماغ یا اپنی کتابوں میں جگہ دیتے ہیں؟ ان متضاد اور اعجوبہ روایتوں کے جنگل میں تقریباً دس ماہ پہلے داخل ہو کر یہ راقم الحروف جس حیرت میں مبتلا ہوا تھا آج تک اُس حیرت کا وہی عالم بلکہ اس سے بھی کچھ سوا ہے۔ اب تک یہ معمہ حل نہیں ہو پایا کہ ہمارے مؤرخین نے کیسے اس جنگل کو اپنی کتابوں میں سجایا ہے؟

حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور رفقاء کی تقریریں

طبری نے روایت بیان کی ہے کہ شمر بن ذی الجوشن، عبید اللہ بن زیاد کا وہ حکمنامہ عمر بن سعد کے پاس لے کر آیا (جس کا ذکر اوپر آچکا ہے) جس میں کہا گیا تھا کہ حسین رضی اللہ عنہ سے نپٹنے کے معاملے میں فضول وقت مت گنواؤ، تمھیں اس لیے بھیجا گیا ہے کہ انھیں حراست میں لے کر یہاں آؤ، حراست قبول نہیں کرتے تو قتال کر کے قصہ ختم کر دو، ورنہ ہم نے شمر کو ہدایت کی ہے کہ وہ لشکر کا چارج تم سے لے لے۔ ابن سعد نے خط دیکھ کر کہا کہ مجھے لگتا ہے کہ معاملہ تم ہی نے خراب کیا ہے۔ ورنہ ابن زیاد حسین کی پیش کردہ تین صورتوں میں سے کسی ایک کو مان ہی لیتا اور پھر یہ کہہ کر کہ نہیں، میں ہی مفوضہ مہم کو انجام دونگا۔

---

[1] کتاب کے پہلے ایڈیشن کے تبصرے پر ایک تبصرہ نگار نے اس جملے پر اعتراض کیا تھا کہ اس میں دونوں عقیدوں کو یکساں بتایا گیا ہے جو کہ غلط ہے۔ مگر اس میں غلطی دراصل تبصرہ نگار سے ہو رہی تھی کہ اس نے "ویسے ہی عقیدہ رکھتے ہیں" کو "ویسا ہی عقیدہ رکھتے ہیں" کے معنی میں لے لیا۔

اُس نے اُسی وقت فوج کو حملے کے لیے کوچ کا حکم دیدیا۔ یہ محرم سنہ ۶۱ھ کی ۹ر تاریخ پنجشنبہ کا دن اور عصر کا وقت تھا[1]۔ اس کے بعد بیان ہوا ہے کہ ان لوگوں سے یہ کہہ کر مہلت (حضرت حسین کی طرف سے) مانگی گئی کہ بھئی یہ تم ایکدم سے چڑھ آئے، ہمیں بتایا تو ہوتا۔ کہ کوئی نے سے ہماری پیش کش نامنظور ہوگئی ہے۔ بات معقول تھی۔ شمر کو بھی اتفاق کرنا پڑا اور اس قرار داد پر فوج واپس ہوگئی کہ صبح تک آپ لوگ فیصلہ کرلیں، صبح کو یا تو سپردگی ہوجائے ورنہ ہم طاقت استعمال کریں گے[2]۔

حالات کی جو صورت اوپر بیان کی گئی تھی اس میں ۹ر محرم کی شام کو داخل ہوتے والے اس نئے عنصر کا بھی اضافہ کرلیجئے، جس کا ابھی ذکر ہوا کہ دشمن ۹ر کی شام ہی کو حملہ آور ہونے کے لیے آیا اور بمشکل صبح تک کا وقت دیکر واپس گیا کہ رات میں فیصلہ کرلیں کہ پُر امن سپردگی منظور ہے یا مزاحمت۔ اور پھر اس پس منظر میں ذرا غور کیجئے کہ کیا یہ بات قابل یقین نظر آتی ہے کہ ۱۰ر تاریخ کی صبح عمر بن سعد، شمر بن ذی الجوشن کے ساتھ (اور اُس عمرو بن الحجاج کے ساتھ جسے ہم روایتوں کے مطابق کچھ ہی دیر بعد رفقائے حسین پر نہر فرات کا راستہ روکتے ہوئے پاتے ہیں) اپنی فوج لیے ہوئے آتا ہے تو نہ یہ پوچھتا ہے کہ آپ نے کیا فیصلہ کیا؟ اور نہ ہی کسی علامت سے یہ نتیجہ اخذ کر کے کہ مزاحمت کا فیصلہ ہے[3] حملہ آور ہوتا ہے، بلکہ اپنی چار پانچ ہزار فوج ۔۔۔ اور شیعہ مصنفین کے مطابق کم از کم بتیس تیس ہزار فوج[4] کے ساتھ آکر "بہتر پیادوں اور بتیس سواروں" کے سامنے اس طرح کھڑا ہوجاتا ہے جیسے کچھ برابر سرابر کی بات ہو اور باقاعدہ جنگ ہونی ہو[5]۔ اور پھر اس صورت حال میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ نفس

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۳۶-۳۷ [2] ایضاً ص ۲۳۸ [3] روایت میں ہے کہ صبح کو جب لشکر حسینی خیموں پر پہنچا تو دیکھا کہ خیموں کے اردگرد آگ روشن ہے جس سے سمجھا جاسکتا تھا کہ مزاحمت کا فیصلہ ہے اور یہ حفاظتی انتظام ہے۔

[4] شہید انسانیت، از قبلہ علی نقی صاحب لکھنوی۔ ص ۳۷ [5] کوئی بھی حکومت اپنے باغیوں کے ساتھ حتی الامکان، برابر کے حریفوں والا معاملہ نہیں کرتی چہ جائیکہ اتنا کمزور حریف۔

مخاطب کر کے کچھ فرمانے کے لیے" اونٹنی پر سوار ہو کر تشریف لاتے ہیں[1]۔ اور آپ کو پورا موقع دیا جاتا ہے کہ جو کچھ فرمانا ہو فرمائیں۔ چنانچہ حسب روایت وہ فرماتے ہیں:۔

"اے لوگو، میری بات سنو، جلدی سے کام نہ لو، یہاں تک کہ مجھ پر جو تمہارا حق ہے اس کے مابحت تم کو نصیحت و ہدایت کا فرض ادا کروں اور تمہارے سامنے یہ حقیقتِ حال بیان کر دوں کہ میں تمہاری جانب کیوں آیا۔ اگر تم نے میرے بیان کو صحیح سمجھتے ہوئے تسلیم کر لیا اور میرے ساتھ انصاف سے کام لیا تو یہ تمہاری خوش قسمتی ہوگی۔ اور تمہیں معلوم ہوگا کہ تمہارے لیے میری مخالفت کی کوئی وجہ ہو ہی نہیں سکتی اور اگر تم نے میرے بیان کو قبول نہ کیا اور انصاف سے کام نہ لیا تو شوق سے مجتمع کر لو اپنی طاقتوں کو اور اکٹھا کر لو جس جس کو چاہو اپنے ہم خیالوں میں سے اور کوئی کوشش اٹھا نہ رکھو۔ پھر پوری طاقت سے بغیر ایک دم کی بھی مہلت دیئے ہوئے میرا خاتمہ کر دو۔ میرے لیے وہ پروردگار کافی ہے جس نے قرآن کو نازل کیا اور وہی اپنے نیک عمل بندوں کا مددگار ہے۔"

راوی کہتا ہے کہ حضرت حسین کے یہ ارشادات جب (خیموں میں) ان کی بہنوں اور بیٹیوں نے سنے تو وہ چیخیں چلائیں اور روئیں اور ان کی آواز بلند ہو کر باہر پہنچی تو آپ نے اپنے بھائی عباس اور اپنے بیٹے علی کو بھیجا کہ "جاؤ انھیں چپ کراؤ، کس قدر یہ لوگ رو رہی ہیں۔" پھر جب وہ چپ ہو گئیں تب آپ نے از سرِ نو حمد و ثنا سے تقریر شروع کی اور فرمایا:۔

"ذرا تم میرے نام و نسب پر غور کرو اور دیکھو تو میں کون ہوں۔ پھر اپنے گریبانوں میں منھ ڈالو اور غور کرو کہ کیا تمہارے لیے میرے خون کا بہانا اور میری ہتک حرمت کرنا جائز ہے؟ کیا میں تمہارے نبی کا نواسہ نہیں ہوں، اور اُنکے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۲

وصی اور ان کے چچازاد بھائی اور ان پر سب سے پہلے ایمان لانے والے اور انکی تصدیق کرنے والے کا فرزند نہیں ہوں؟ کیا حمزہ سید الشہداء میرے باپ کے چچا اور جعفر طیار خود میرے چچا نہیں تھے، کیا حدیث جو زبان زد خلائق ہے تمہارے کانوں تک نہیں پہنچی کہ حضرت رسول خدا نے میرے اور میرے بھائی کے بارے میں فرمایا تھا کہ "یہ دونوں جوانانِ اہل جنّت کے سردار ہیں؟" اگر تم میری بات کو سچ سمجھتے ہو اور حقیقتہً وہ سچ ہی ہے (اس لیے کہ میں نے جب سے یہ جانا کہ اللہ جھوٹ بولنے والے سے ناراض ہوتا ہے اور خود اس کا جھوٹ بھی اسے نقصان دیتا ہے، تب سے میں نے کبھی جھوٹ کا ارادہ نہیں کیا) پھر تو کوئی بات نہیں اور اگر تم میری بات کو غلط سمجھو تو اسلامی دنیا میں ابھی ایسے اشخاص ہیں جن سے اگر تم پوچھو تو تبلادیں گے۔ پوچھ لو جابر بن عبداللہ سے، ابوسعید خُدری سے، سہل بن سعد ساعدی سے، زید بن ارقم سے، اَنس بن مالک سے وہ تمھیں تبلائیں گے کہ انھوں نے رسالت مآب سے اپنے کانوں سے اس حدیث کو سنا ہے، پھر کیا یہ تمھیں میری خونریزی سے روکنے کیلئے کافی نہیں ہے[1]؟"

راوی کہتا ہے کہ "اس موقع پر شمر آپ کا قطع کلام کرتے ہوئے بولا کہ "میں خدا کی تابعداری کنارے پر کھڑے ہو کر کرنے والوں میں سے (یعنی منافقوں میں سے) ہوں، اگر ذرا بھی سمجھا ہوں کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔" حبیب بن مظاہر، یکے از رفقاء حسینؑ نے جواب میں کہا کہ واللہ میں تو سمجھتا ہوں کہ تو اللہ کی تابعداری ایک کنارے پر نہیں ستّر کناروں پر کھڑے ہو کر کرتا ہے (یعنی پرلے درجے کا منافق ہے) اور میں گواہی دیتا ہوں کہ تو سچ کہہ رہا ہے کہ تیری سمجھ میں حضرت کی بات ذرا بھی نہیں آرہی۔ کیونکہ اللہ نے تیرے دل پر مہر لگادی ہے۔"

اس کے بعد حضرت حسینؑ نے سلسلۂ تقریر دوبارہ جاری کرتے ہوئے فرمایا:۔

" اگر تمھیں اس حدیث کی صحت میں پھر بھی شک ہے تو کیا اس میں بھی شک ہے،

[1] ہمارے جو اہل علم روایتوں پر از روئے درایت غور کرنے کے عادی ہیں انھیں شاید ہی یہ ماننے سے اختلاف ہو کہ یہ سب گھڑی ہوئی روایت ہے۔

کہ میں تمھارے رسول کا نواسہ ہوں، اور خدا کی قسم مشرق سے مغرب تک کوئی بھی رسول خدا کا نواسہ میرے سوا موجود نہیں ہے، نہ تم میں اور نہ تمھارے سوا کسی دوسری قوم میں۔ بس میں ہی ایک تمھارے نبی کا نواسہ ہوں۔ ذرا بتاؤ تو سہی کہ تم کیوں میرے درپے ہو؟ کیا کسی مقتول کا بدلہ لینے کو، جس کو میں نے قتل کیا ہے؟ یا کسی مال کے سلسلے میں جس کو میں نے تلف کر دیا ہے! یا کسی کو زخم لگایا ہے جس کا قصاص مطلوب ہے؟

راوی کہتا ہے کہ "کوئی جواب کسی طرف سے نہیں ملا" تو آپ نے نام لے لے کر اُن میں سے بعض کو مخاطب کیا:۔

"اے شبث بن ربعی، اے حجّار بن ابجر، اے قیس بن اشعث، اے یزید بن حارث کیا تم نے مجھے نہیں لکھا تھا کہ "باغات میں بہار ہے، کھیتیاں سرسبز ہیں، چشمے ابل رہے ہیں، اور مسلح لشکر آپ کی پذیرائی کو چشم براہ ہیں۔ بس قدم رنجہ فرمائیے؟ ان لوگوں نے جواب دیا کہ نہیں، ہم نے تمھیں کوئی خط نہیں لکھا یہ سن کر ارشاد ہوا۔ اللہ اکبر، اتنا بڑا جھوٹ! قسم ہے خدا کی تم نے لکھا تھا۔"

اس کے بعد آپ نے فرمایا:۔

"اے لوگو، اگر تمھیں میرا آنا ناپسند ہے تو مجھے چھوڑ دو کہ روئے زمین پر جہاں کہیں اپنے لیے امن وامان کی جا سمجھوں چلا جاؤں۔ اس پر قیس بن اشعث نے کہا کہ آپ اپنے "بنی عم" کا حکم کیوں نہیں مان لیتے؟ آپ کو کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوگی۔ جو آپ چاہیں گے وہی آپ کے ساتھ ہوگا۔ حضرت نے فرمایا: تم اپنے بھائی — محمد بن اشعث — کے بھائی ہی تو ہو۔ کیا تمھاری خواہش ہے کہ بنو ہاشم تم پر مسلم بن عقیل کے علاوہ کسی دوسرے خون کا بھی دعویٰ[1]

---

[1] مسلم بن عقیل کے واقعہ میں گذر چکا ہے کہ ان کی گرفتاری محمد بن اشعث کے ذریعہ ہوئی تھی۔

کریں ۔ نہیں، خدا کی قسم میں ذلت کے ساتھ اپنا ہاتھ تمھارے ہاتھ میں نہیں دونگا۔ اور نہ غلاموں جیسے اقرار تمھارے آگے کروں گا۔ اے لوگو، میں تمھارے رب کی اور اپنے رب کی پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ تم مجھ کو سنگسار کرو، اور میں پناہ مانگتا ہوں ہر متکبّر سے جسے یوم حساب پر ایمان نہیں۔"

راوی کہتا ہے کہ "اس کے بعد آپ نے اونٹنی کو بٹھایا، اُترے اور عقبہ بن سمعان (خادم) کو حکم دیا کہ اسے باندھ آئے اور اب دشمن آپ کی طرف بڑھنے لگا۔"[1]

حضرت حسینؓ کی یہ مبیّنہ تقریر اس سوال پر غور کرنے کے لیے من وعن نقل کی گئی ہے کہ جب امیر لشکر عمر بن سعد کو اتنے سخت احکام ہوں جیسے کہ اوپر طبری کی رُوایتوں سے نقل کیے گئے۔ دو دو آدمی اُن روایتوں کے مطابق، ان تاکیدی احکامات کے ساتھ بھیجے گئے ہوں کہ اگر عمر بن سعد حسین کو ڈھیل دینے اور معاملے کو طول دینے کی روش سے باز نہ آئے تو اُس کی گردن کاٹ کر ہمارے پاس بھیجدی جائے اور معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا جائے، کیا اس سب کے باوجود (اور مزید اس کے باوجود کہ ایک شب کی جو آخری مہلت حضرت حسین کو ۹ کی شام کو دی گئی تھی وہ بھی ختم ہو گئی اور ان کی طرف سے سر تسلیم خم کرنے کی بات سامنے نہیں آئی) یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ ۱۰ کی صبح کو عمر بن سعد اپنا لشکر لے کر خیامِ حسینی پر آئے تو بجائے اس کے کہ فوراً کوفے کے احکام کی تعمیل شروع کرے وہ حضرت حسینؓ کو موقع دیتا ہے کہ اس کے ساتھیوں میں اپنے ایک طویل خطاب کے ذریعہ کوفے اور دمشق کی حکومت کے خلاف جذبات پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کریں؟ حقیقتاً یہ قابل تصوّر بات بھی نہیں ہے، چہ جائیکہ بطور واقعہ پیش آئی ہو، ہاں کوئی حضرت حسینؓ کے لیے معجزہ کی قدرت کا قائل ہو تو اسکے لیے شاید یہ بات قابل تصوّر ہو سکتی ہو۔

---

[1] طبری ج ۶ صفحہ ۲۴۲-۲۴۳ حضرت کی تقریر کے آغاز سے یہاں تک اقتباسات کے ترجمے میں اپنی سہولت کی خاطر ہم نے قبلہ علی نقی صاحب کے ترجمے سے فائدہ اٹھایا ہے لیکن کلیتہً انحصار نہیں کیا گیا۔

معاملہ کا ایک اور پہلو

اس سوال سے قطع نظر جس کی بنیاد تقریر کے ماحول اور موقع پر رکھی گئی ہے، اور اسی موقع و محل کے پیش نظر ہم مجبور ہوئے ہیں کہ اس تقریر کی واقعیت میں کلام کریں، (اس سے قطع نظر) تقریر میں داخلی شہادتیں بھی اس بات کی صاف نظر آرہی ہیں کہ یہ واقعہ نہیں کچھ لوگوں کی تخئیلی قوت کا کرشمہ ہے۔ عہد نامۂ جدید کی انجیل مرقس جو حضرت عیسےٰ علیہ السلام کو تختۂ دار پر چڑھا ہوا دکھاتی ہے وہ آپ کی زبانِ مبارک سے یہ کلمۂ شکایت و جزع و فزع کہلواتی ہے کہ:۔

اِلوھی اِلوھی لما سبقتنی[1] اے میرے اللہ اے میرے اللہ تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا ہے؟

اسلامی ذہن کی رو سے یہ کیسا بُرا داغ ہے جو اللہ کے ایک جلیل القدر پیغمبر کے دامن صبر و رضا پر لگایا گیا ہے۔ مگر حضرت حسینؓ کی طرف مذکورۂ بالا تقریر منسوب کرنے والوں نے اس سے کہیں زیادہ بڑا داغ نواسۂ رسولؐ کے دامانِ عزّ و شرف کو لگایا ہے۔ اہل انجیل نے پیغمبر کو بہرحال صرف خدا ہی کے سامنے رُلایا اور اس سے شکوہ کرایا ہے۔ مگر ان لوگوں نے ___ پتہ نہیں یہ کس سطح کے لوگ تھے؟ ___ حضرت حسینؓ کو ان غدّار کوفیوں اور ابن زیاد کے کاسہ لیسوں کے سامنے ہر ہر رُخ سے اور ہر ہر رنگ میں جان کی امان مانگتے دکھایا ہے، جنکی طرف رخ کرنے کی اجازت بھی غیرت کے قانون میں نظر نہیں آتی۔ اور یہ تو عام قانون غیرت کی بات ہے یہاں تو معاملہ ریحانۂ رسولؐ کی غیرت کا اور ہاشمی خون کی غیرت کا ہے۔

وہ مرتبہ ناشناس اور زمانہ ساز جنھوں نے کل آپ کے بڑے بھائی حضرت حسن مجتبیٰ کو رنج دینے اور رسوا کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی اور جو آج چند ٹکوں یا چھوٹے بڑے مرتبوں کی خاطر آپ کا خون بہانے کو.... لشکرِ اعداء میں شامل ہو گئے تھے جس میں شمر جیسے زباں دراز بھی تھے جس نے ابھی ابھی آپ کے خیموں کے گرد آگ کے الاؤ دیکھ کر

پکارا تھا:۔

یاحسین استعجلت النار	او حسینؑ یہ آگ کی ایسی جلدی کہ قیامت سے
فی الدنیا قبل یوم القیامۃ ۔	پہلے دنیا ہی میں اس کا بندوبست کرلیا؟

ان بے ادبوں اور مسخ فطرتوں کے سامنے آپ واسطہ دینے اٹھے اپنی نسبی عظمتوں کا! نواسۂ رسولؐ ہونے کا! ابن فاطمہ بنت الرسولؐ ہونے کا! ابن علی مرتضیٰؑ وصیٔ رسولؐ ہونے کا! حضرت حمزہ سید الشہداء سے اپنی قرابت کا اور جعفر طیارؓ سے رشتے کا! کیا واقعی یہ باتیں کسی ایسے آدمی کے لیے قابلِ تصوّر ہیں جو سچ مچ حضرت حسینؓ کا کچھ مرتبہ سمجھنے کے قابل ہو؟ اور یوں بھی یہ واسطے دینا تو کسی بھی حالت میں حضرت حسین جیسے مرتبہ کے انسان کے لیے موزوں بات نہیں ہو سکتی ۔ بہت کم شعور اور کم سطح کے لوگ ایسے واسطوں کا استعمال کرتے ہیں ۔

آگے آئیے ۔ تقریر کے اس حصّے پر وہی شمر ایک بار پھر زبان درازی کا وہ مظاہرہ کرتا ہے جو اوپر گذر چکا اور خالص بولہبی لہجے میں کہتا ہے ؎

سمجھ میں کچھ نہیں آیا یہ تم نے کیا سنایا تھا

مگر افسوس کہ یہ خطابِ حسینی کے مصنّف اس کے بعد حضرت والا کی زبان سے کہلواتے ہیں کہ چلو تمھیں میرے اور میرے بھائی کے بارے میں جوانانِ جنّت کی سرداری والی حدیث کی صحت کا یقین نہیں تو کیا یہ بھی تمھارے لیے ممکن ہے کہ میرے نواسۂ رسولؐ ہونے میں شک ظاہر کرو؟ کیا مشرق و مغرب میں ایک میرے سوا کوئی اور ہے جسے نواسۂ رسولؐ ہونے کا دعویٰ ہو؟ کُل روئے زمین پر میں تنہا ہوں جو اس شرف کے ساتھ مشرّف ہو ۔ بتاؤ اس کے باوجود تم کیسے میرے خون کے پیاسے ہو؟

اور ابھی بس کہاں؟ وہ شبث بن ربعی، وہ حجّار بن ابجر وہ قیس بن اشعث اور یزید بن حارث جن کے دستخطی خط حضرت والا کی تحویل میں موجود تھے جن میں بڑے اشتیاق سے کوفے میں قدم رنجہ فرمانے کی دعوت دی گئی تھی ـــــ یہ

چاروں[1] اپنی بے غیرتیوں کے ساتھ صفِ اعداء میں اپنے اپنے قبیلوں کی کمانیں سنبھالے کھڑے تھے۔ حضرت حسینؓ کو ان بے غیرتوں سے بھی تو نام بنام مخاطب ہو کر ان کے خطوط یاد دلاتے دکھایا گیا ہے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہ۔ پتہ نہیں یہ کون لوگ تھے جنھوں نے اس طرح دانستہ یا نادانستہ سبطِ رسولؐ کی رسوائی کا سامان کیا ہے؟

اور ہاں وہ خواتینِ خانوادۂ نبوت جن کے ذکر کے ساتھ ساتھ صبر و ضبط اور عزیمت و خودداری کی صفات تصوّر میں آتی ہیں۔ وہ نقش فاطمی ذہن میں اُبھرتا ہے، جو میدانِ اُحد میں قائم ہوا تھا کہ سیدۂ فاطمہ کسی آہ و بکا کے بجائے اپنے والد ماجد (اور ہمارے آقائے نامدار) کی مرہم پٹی کا حوصلہ دکھا رہی اور دوسروں کا حوصلہ بڑھا رہی ہیں۔ اور پھر عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا وہ نقش کہ زخموں کو دھونے اور زخمیوں کو پانی پلانے کے لیے مشک اٹھائے دوڑ رہی ہیں۔ ان صفات کی جگہ پر ہمیں یہ کربلا میں "خطابِ حسینی" کا قصہ سنانے والے سناتے ہیں کہ ابھی تلوار چلی نہیں، کوئی معرکہ ہوا نہیں، کوئی خون نہیں، کوئی زخم نہیں، فقط ایک جملہ حضرت حسینؓ کی زبان سے ابتدائے تقریر میں نکلا کہ "اگر تم نہیں مانتے تو پھر ایک دم کی بھی مہلت دیئے بغیر پوری طاقت سے اٹھو اور میرا خاتمہ کردو"۔ بس اتنا سننا تھا کہ خانوادۂ نبوت کے خیمے ماتم کدے بن گئے اور آہ و بکا کا وہ شور برپا ہوا کہ حضرت کو تقریر روک دینا پڑی۔

حقیقت (کم از کم راقم کے نزدیک) یہ ہے کہ پوری تقریر اور اس کے درمیانی قصّے گویا لکھے ہی اسی نقطۂ نظر سے گئے ہیں کہ واقعۂ کربلا کے نام پر ایک ماتمی فضا پیدا کرنے میں مدد مل سکے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ واقعیت سے ان کا دور دور بھی کوئی تعلق ہی نہیں، نہ ہو سکتا ہے۔ واقعیت اگر ہے تو اُس دعا میں ضرور نظر آتی ہے، جو تقریر والی روایت سے متصلاً پہلے کی روایت میں[2] طبری نے دی ہے۔ روایت یہ ہے کہ جب (۱۰ ر کی) صبح کو دشمن کا لشکر آ پہنچا تو

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۹۷ پر ان لوگوں کے خط اور ناموں کا ذکر ہے، وہ نام چار سے زیادہ ہیں، البتہ قیس بن اشعث کا نام ان میں نہیں ہے۔ [2] طبری ج ۶ ص ۴۲-۲۴۱

حسینؓ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور (یوں بارگاہِ احدی میں) عرض کناں ہوئے :-

"خداوندا تو ہی میرا سہارا ہے ہر تکلیف میں، میرا قبلۂ امید ہے ہر کلفت میں، اور تجھ ہی پر ہر مہم میں جو مجھے درپیش ہو، میرا بھروسہ ہے۔ کتنے ہی حالات ایسے ہیں جن کے مقابلے میں دل کمزور پڑ جاتا ہے اور تدبیر کی راہیں بند نظر آتی ہیں، دوست ان میں ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور دشمن طعنہ زنی کرنے لگتے ہیں، میں ان حالات کو تیرے حضور پیش کرتا اور تیری بارگاہ میں فریاد کیا کرتا ہوں، اسلیے کہ تجھے چھوڑ کر کسی اور سے لو لگانا میں جانتا نہیں۔ پس تو حالات کی تکلیف اور ان کی ناسازگاری کو دور کرتا اور راہ نکالتا ہے۔ یقیناً تو ہی ہر نعمت کا مالک، ہر بھلائی کا سرچشمہ اور ہر امید کا مرکز ہے۔"

یہ دعا اگر معیار روایت کے اعتبار سے کوئی کمزوری نہیں رکھتی تو اس کی واقعیت تسلیم کرنے میں ذرا بھی اشکال نہیں، کیونکہ یہ بیتنہ تقریر کے برعکس موقع و محل کا عین تقاضہ ہے اور حضرت حسین سے پورے طور پر متوقع اور ان کے شایانِ شان ہے۔

زُہَیر بن قَین کی تقریر

دو تقریریں جو اوپر درج ہو گئیں، ایک حُرّ بن یزید کی اور ایک خود حضرت حسینؓ کی، ان میں سے کسی ایک کے لیے بھی اس ماحول اور صورتِ حال میں جو کربلا کے سلسلے کی روایتیں بتاتی آ رہی تھیں، کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ مگر جیسا کہ عرض کیا گیا یہاں تو ایسی تقریروں کا ایک لمبا سلسلہ ہے۔ لگتا ہے کہ معرکۂ کارزار نہیں۔ میلۂ محکاظ تھا۔ طوالت ہوئی جاتی ہے، مگر ایک تقریر اور سن لیجئے۔ یہ زُہَیر بن قَین نام کے ایک ساتھی ہیں۔ اور ان کی بھی کچھ ایسی اہمیت ہے جیسی حُرّ بن یزید کی۔ ایک ایسا شخص اس تقریر کا راوی بتایا گیا ہے جو ابن زیاد کی فوج میں شامل تھا نہ کہ حضرت حسینؓ کے ساتھیوں میں۔ یہ کہتا ہے کہ

(حضرت حسین تقریر کے بعد پیچھے ہٹے اور) ہم آگے بڑھے تو زُہَیر بن قَین نکل کر آئے۔ گھوڑے پر سوار اور اسلحہ سے لیس تھے، انھوں نے ہمیں مخاطب کر کے کہا کہ:

" کوفے والو، خبردار، خدا کے عذاب سے خبردار، ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان بھائی کا حق ہے کہ اس کی خیر خواہی کرے۔ ہم لوگ اس وقت بھائی بھائی ہیں، ایک دین اور ایک ملّت پر ہیں، جب تک ہمارے درمیان تلوار نہیں چلنے لگتی، ہاں اگر تلوار چل گئی تو پھر یہ رشتہ خود بخود کٹ جائے گا اور تم الگ اور ہم الگ ملّت ہو جائیں گے۔ دیکھو ہمیں تمھیں اللہ نے ذُرّیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ آزمایا ہے تاکہ دیکھے کہ ہم تم کیا کرتے ہیں۔ سو ہم تمھیں دعوت دیتے ہیں کہ ان کی مدد کرو اور سرکش عبیداللہ بن زیاد کا ساتھ چھوڑ دو۔ اس لیے کہ تمھیں ان کی حکومت سے سوائے دکھ اور رنج کے اور کچھ نہ ملے گا جو تمھاری آنکھوں میں سلائیاں پھرواتے، تمھارے ہاتھ پاؤں قطع کراتے تم کو سولیاں دلواتے اور تمھارے نیک اعمال قُرّاء اور عمائد مثلاً حُجر بن عدی اور ان کے اصحاب اور ہانی بن عروہ وغیرہ کو قتل کراتے رہے۔"

راوی کہتا ہے کہ اس پر ہماری طرف والوں نے زُہَیر کو بُرا بھلا کہا اور عبیداللہ بن زیاد کی تعریفیں کیں اور کہا کہ ہم تمھیں اور تمھارے صاحب (حضرت حسین) اور ان کے سب ساتھ والوں کو اس کے بغیر نہیں چھوڑیں گے کہ یا قتل کریں اور یا گرفتار کر کے عبیداللہ بن زیاد کے پاس روانہ کریں۔ اس پر زُہَیر بن قین پھر عرض پرداز ہوئے کہ:-

" اے اللہ کے بندو فاطمہ رضوان اللہ علیہا کی اولاد سُمیہ کی اولاد کے مقابلے میں تمھاری محبت اور مدد کی زیادہ حقدار ہے۔ اور اگر تم مدد نہیں کر سکتے تو میں تمھارے لیے اس بات سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ تم اُن کو قتل کرو، تم اس شخص (حسینؓ) کے اور اس کے چچا زاد یزید بن معاویہ کے درمیان سے

ہٹ جاؤ۔ قسم میری جان کی۔ یزید کے لیے تمھاری اطاعت کو قتلِ حسین کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اس کے بغیر بھی تمھاری اطاعت پر راضی رہے گا۔"[1]

ایک خاص نکتہ

ماحول صورتِ حال اور موقع و محل کے اس نکتے کے علاوہ جس کی بنا پر ہمارے لیے یہ ماننا مشکل ہو رہا ہے کہ فی الواقع یہ تقریریں میدان کربلا میں ہوئی تھیں۔ زُہَیر بن قین کی تقریر کے بارے میں خاص طور سے یہ نکتہ بھی توجہ طلب ہے کہ اس میں جو کچھ لعنت و ملامت کوفیوں کو ہے اور جو کچھ اپیل اور فہمائش کے حملے ہیں، اُن سب کی بنیاد بس یہ ہے کہ حضرت حسین اور ان کے اہل خانہ اولاد فاطمہ رضی اللہ عنہا اور ذرّیتِ محمّد صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حالانکہ ان صاحب کے تعارف میں کہا گیا ہے کہ یہ اصل میں عثمانی گروہ کے تھے، اور اس لیے اتفاق سے جو حج سے واپسی میں حضرت حسین کے قافلے کا ساتھ ہو گیا تو منازل پر فاصلے سے اپنا خیمہ لگاتے اور حضرت حسین کے سائے سے بھی بچنا چاہتے تھے[2]۔ مگر حضرت حسین کے اس سفر کے حالات میں آتا ہے کہ وہ راستے کے تقریباً ہر اہم آدمی ہی کو بالخصوص جس کا کوفے سے تعلق تھا، اپنے ساتھ ملانا چاہتے تھے۔ چنانچہ آپ نے ایک دفعہ ان کو بلاوا بھیجا تو ان کی بیوی نے شرم دلا کر کہ "بہر حال ابن بنت رسول اللہ ہیں، آپ کو اُنکی دعوت پر جانا چاہیے، ان کو خیمۂ حسینی میں جانے پر مجبور ہی کر دیا اور پھر وہ آپ کی طرف سے آپ کی مہم میں، رفاقت کی دعوت بھی رد نہ کر سکے اور جان و دل سے ساتھ ہو گئے۔ بہر حال ایک عثمانی الاصل آدمی بھی صرف اسی "ذرّیتِ محمّد" اور "ابن بنت رسول اللہ" کے حوالے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۳ ۔ [2] پر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کو منزل بہ منزل ساتھ چلنے کی ضرورت کیا تھی جو یہ ساتھ ہو کر بھی دور رہنے کا اہتمام کرنا پڑتا تھا۔ یہ اس فاصلے کو کم از کم ایک دو منزل کا فاصلہ بھی تو بنا سکتے تھے!

سے یزیدی کوفیوں کو لعنت وملامت یا ان سے اپیل کرے یہ کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں
بے شک یہ بھی ایک نہایت مناسب عنوان اور حوالہ تھا۔ مگر اسی پر انحصار اور صرف اسی حوالے
سے حضرت حسینؓ اور ان کے اہل خانہ کی عظمت اور ان کا حق پہچاننا، ابن زیاد کے مقابلے میں
ان کے لیے صرف اسی حوالہ کو وجہ ترجیح بنانا یہ تو شیعیت کا مزاج ہے اور اس لیے جس طرح
حضرت حسینؓ کی تقریر میں علاوہ حالات اور ماحول والے نکتے کے بعض اور پہلو بھی اس تقریر کو
غیر واقعی اور جعلی قرار دینے والے اور اسی کے ساتھ اس جعلسازی کی بنا بھی سامنے لانے
والے ہیں ۔ اسی طرح زُہَیر بن قین کی تقریر کا یہ پہلو بھی اس کی غیر واقعیت کو ظاہر کرتا ہے اور
ساتھ ہی ساتھ اس جعلی کارروائی کے پیچھے کام کرنے والے اس نقطۂ نظر کو بھی صاف سامنے
لے آتا ہے کہ اس طرح کی تقریریں اگر حضرت حسینؓ کی موجودگی میں عثمانی الاصل لوگوں کی
زبان سے ادا کرادی جائیں تو شیعی تصوّرات اور طرزِ فکر کو ایک اچھّی اساس اور بنیاد[1]
ملتی ہے[2]۔

سبھی کچھ تصنیف

جس طرح یہ تقریریں بول رہی ہیں کہ میدانِ کربلا میں ہوئی نہیں بلکہ بعد میں تصنیف
کی گئی ہیں اسی طرح ـــ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا تھا ـــ یوم عاشور کی تقریباً پوری کہانی
کا یہی حال نظر آتا ہے ۔ مثلاً :۔

(۱) مُبارزانہ جنگ[2] کے قصّے

تقریروں کا سلسلہ ختم ہوتا ہے تو مبارز طلبی[3] شروع ہو جاتی ہے، اور عمر بن سعد جو

---

[1] مجھے اس امکان سے انکار نہیں ہے کہ محرک نقطۂ نظر اسکے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔ [2] ایک صف سے ایک سورما نکل کر پکارتا ہے کہ کوئی اسکے مقابلے کو آئے اس طرح دونوں صفوں سے ایک ایک آدمی نکل کر لڑتا ہے۔ [3] مقابل کو پکارنا۔

ابن زیاد کی ساری تنبیہات کے خلاف اِن حضرات کو تقریریں کر کے اس کے اپنے کیمپ میں بغاوت کی آگ بھڑکانے اور بے یقینی اور بے دلی پھیلانے کا پہلے ہی کافی موقع دے چکا تھا۔ تقریروں کے بعد حُرؓ بن یزید کے حملہ آور ہونے اور دو آدمی بھی اپنی صف کے اس کے ہاتھوں مارے جانے کے باوجود ابن زیاد کے انتہائی سخت احکام کی تعمیل میں بھرپور یلغار کر کے قصہ ختم کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ بلکہ صفِ حسینی سے جو مبارزانہ جنگ کا سلسلہ اب شروع ہوتا ہے، جو غیر معمولی قلّتِ تعداد کی بنا پر اس صف کے لیے مناسب ترین اور پسندیدہ ترین صورت جنگ ہو سکتی تھی، تو وہ اس میں بھی ان کی معاونت شروع کر دیتا ہے۔ اور شمر جو اپنی آمد کے بعد سے برابر اپنی موجودگی کا اظہار طرح طرح سے کر رہا ہے۔ ابن سعد کی اس بے عملی کے معاملے میں وہ ذرا بھی باعمل نظر نہیں آتا۔ حالانکہ وہ بھیجا صرف اسی لیے گیا ہے کہ ابن سعد کی سست روی اور بے عملی کا سلسلہ روک دے پس ہے یہ سمجھ میں آنے والی کوئی بات کہ وہاں جنگ مبارزانہ ہوئی ہوگی ؟

(ب) صبح سے سہ پہر تک کے معرکے

ابن زیاد کے سخت احکام کی اور شمر جیسے "حسین دشمن"[1] کو تعمیل احکام کے لیے مسلّط کیے جانے کی روایتیں جس طرح اس بات کو باور کرنے کی اجازت نہیں دیتیں کہ کربلا میں مبارزانہ جنگ کا سلسلہ چلا ہوگا۔ یہی روایتیں اور لشکر ابن سعد کی تعداد والی روایتیں (کم سے کم ۴۔ ۵ ہزار، ورنہ شیعہ ماٰخذ کے مطابق کم سے کم تیس چالیس ہزار) اس بات کا تصور مشکل بناتی کہ اس لشکر نے قافلۂ حسینی کو کوئی باقاعدہ جنگ کرنے کا موقع دیا ہوگا۔ یہ کیس اور معاملہ کسی جنگ کا تھا ہی نہیں، یہ فقط مزاحمت کا اور مزاحمت کو توڑنے کا کیس تھا۔ ابن سعد کی اس

---

[1] شمر کا نام صفین کی معرکہ آرائی میں بھی ملتا ہے اور بہت واضح طور پر تو نہیں، لیکن بظاہر وہ حضرت علیؓ کی صف کا آدمی نظر آتا ہے۔ اگر فی الواقع ایسا ہی ہے تو اس کی یہ دشمنی بھی عجیب ہے۔

نفسیاتی کیفیت کو دیکھتے ہوئے جس کی گواہی قصے کی تمام روایتیں دے رہی ہیں کہ ایک طرف ابن زیاد کی فرمانبرداری بھی منظور تھی دوسری طرف حضرت حسین کی سلامتی بھی عزیز (اس کیفیت میں اور کم از کم بیس پچیس گنا زیادہ نفری کے ساتھ) واقعۂ کربلا کی اسکے سوا کوئی اور صورت از روئے عقل و عادت نہیں ہونی چاہیے تھی کہ ابن سعد کی طرف سے ان لوگوں کو گھیر کر اور بے قابو کر کے زیادہ سے زیادہ تعداد میں سلامتی کے ساتھ گرفتار کر لینے کی کوشش ہوتی اور اُدھر سے مزاحمت۔ یہ مزاحمت طاقتور ہوتی، اور بظاہر طاقتور ہونی ہی چاہیے تھی، تو ابن سعد کی کوشش ناکام ہوتی، اور زیادہ سے زیادہ تعداد اپنی مزاحمت پر قربان ہوجاتی۔ لیکن اس میں صبح سے سہ پہر تک کا وقت لگ جاتا اور باقاعدہ "دو لشکروں" کے درمیان جنگ کی صورت بنتی، جیسا کہ روایتیں کہتی ہیں اور مجالس عزا میں دہرایا جاتا ہے، یہ کوئی سمجھ میں آنے والی بات ہرگز نہیں۔ بظاہر یہ بیان واقعہ کے بجائے واقعہ کی اسی طرح کی ایک مبالغہ آمیز اور انتہا پسندانہ تعبیر ہے جس طرح کی دوسری انتہا پسندانہ تعبیر اس کے مقابل ایک روایت میں یوں پائی جاتی ہے کہ ابن زیاد نے جس شخص، زُحر بن قیس کو حضرت حسین کا سر لے کر یزید کے پاس بھیجا۔ اس نے یزید کے پاس پہنچ کر کہا کہ:۔

"ابشر یا امیر المومنین بفتح	امیر المومنین مژدہ ہو، اللہ کی طرف سے
اللہ ونصرہٖ ورد علینا الحسین	فتح و نصرت کا! حسین بن علی اپنے
بن علی فی ثمانیۃ عشر من	اٹھارہ گھر والوں اور ساٹھ شیعوں
اھل بیتہٖ وستین من	کے ساتھ آ پہنچے تھے۔ (اس خبر پر)
شیعتہٖ فسرنا الیھم فسألناھم	ہم لوگ ان کی طرف چلے اور ہم نے
أن یستسلموا وینزلوا علیٰ حکم	مطالبہ کیا کہ اپنے آپ کو ہمارے سپرد
الامیر عبید اللہ بن زیاد	کر کے امیر عبید اللہ بن زیاد کے فیصلے
او القتال، فاختاروا القتال	پر چھوڑ دیں ورنہ قتال کے لیے تیار

علی الاستسلام فعدونا علیھم مع شروق الشمس فاحطنا بھم من کل ناحیۃ حتیٰ اذا اخذت السیوف ماخذھا من ھام القوم یھربون الیٰ غیر وزر و یلوذون منّا بالاٰکام والحفر لواذًا کما لاذ الحمائم من صقر فوا للہ یا امیر المومنین ما کان الّا جزر جزور او نومۃ قائل حتیٰ اتینا علیٰ آخرھم.... [1]

ہوں۔ ان لوگوں نے قتال پسند کیا۔ نتیجہ میں ہم لوگوں نے سورج نکلتے ہی ان پر چڑھائی کی اور ہر طرف سے گھیر لیا حتیٰ کہ جب تلواروں نے ان کی کھوپڑیوں پر کام شروع کیا تو جدھر منہ اٹھا بھاگ پڑے کہیں ٹیلوں کی کہیں گڑھوں کی پناہ ڈھونڈنے لگے جیسے کہ کبوتر شکرے کے سامنے کیا کرتے ہیں۔ پس اے امیر المومنین قسم ہے خدا کی ہمیں ان کا خاتمہ کرنے میں اس سے زیادہ وقت نہیں لگا جتنا ایک قصاب کو ایک اونٹ ذبح کرنے میں یا دوپہر کو کسی شخص کے قیلولہ کرنے میں لگتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جس طرح یہ روایت بجد مبالغے پر مبنی ہے یہی حال صبح سے سہ پہر تک کی روایتوں کا سمجھنا صحیح ہے۔

لمبے وقت کے دامن میں لپٹے قصّے

لمبا وقت لگنے کی روایتیں جب ناقابلِ اعتبار اور ناقابلِ قبول ٹھہر جاتی ہیں تو پھر اس لمبے وقت کے دامن پر جو اور بہت سی کہانیاں ٹانک دی گئی تھیں وہ بھی کسی اعتبار کے لائق کہاں رہ جاتی ہیں؟ انھیں کہانیوں میں فرزندانِ اہلبیت کی لاشوں کا ایک کے بعد

[1] طبری ج ۶ ص ۲۶۴

ایک کرکے تڑپنا، حضرت حسین کا ان کے پاس دوڑ دوڑ کے جانا، رنج والم کے کلمات سے انھیں آخرت کے لیے رخصت کرنا، یا ایک طرف کو لا کے لٹانا۔ حضرت زینب کبریٰ کا روتے تڑپتے بار بار میدانِ جنگ میں نکل آنا۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ ساری کہانیاں جن میں سے کتنی ہی ایسی ہیں جو در اصل حضرت حسین کی شان کو، جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے، داغ لگاتی ہیں، صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُس سبائی[1] ذہن کے ماتحت گڑھی گئی ہیں جو برابر فرزندانِ اسلام کی "متاعِ دین و دانش" لوٹ لینے کی جدوجہد میں لگا ہوا تھا اور اسے نواسۂ رسولؐ کی مظلومیت کے نام پر ایک ہوش رُبا قسم کی جذباتی فضا پیدا کر دینے میں اپنے اس منصوبے کی تکمیل کا بہترین سامان نظر آیا، اور اور اپنے اس حربے اور مقصد میں وہ خوب خوب کامیاب رہا۔ اسلام کے ناواقف اور ضعیف العقیدہ فرزندوں کی ایک بڑی تعداد اس حربے کا شکار ہو کر اسلام کی شاہراہ (MAIN STREAM) سے ہٹ گئی اور بالکل ایک اجنبی راہ پر "اسلام" ہی کے بلکہ "اصل اسلام" کے نام سے لگ گئی۔ آج جو لوگ اس مذہبِ ماتم حسین کے پیرو ہیں، یقین ہے کہ وہ اپنے دلوں سے اسلام دوست ہیں۔ اس مذہب کے اصل بانیوں[1] کی طرح چھپے دشمن نہیں مگر "صیاد[2] کے اقبال" کا بھی کیا "سحر" ہے کہ اُن کے "صید[3]" کی یہ موجودہ نسل بھی (جو ہماری ہم عصر ہے) اپنی "قید" کی جان و دل سے حفاظت کرنا چاہتی ہے[4]۔ اور اسی مذہب والوں کا کیا، ہر شخص جس مذہب کے ماحول میں پیدا ہو گیا ہے، بے سوچے سمجھے بلکہ سوچ سمجھ کی دعوت سے (اِلّا ماشاء اللہ) دشمنی کرتے ہوئے اسی مذہب پر جینا اور مرنا چاہتا ہے۔

---

[1] عبداللہ بن سبا وغیرہ۔ [2] شکاری [3] شکار۔

[4] طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا — اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا

دامانِ اہلبیت کے لیے ننگ

بہرحال آئیے یوم عاشورہ کی وہ کہانیاں دیکھیں جن سے دراصل حضرت حسین کی شان اور عظمت کو دھبّہ لگتا ہے۔ دھبّہ لگانے کو تو وہ قبل از "جنگ" کی تقریر ہی بہت کافی ہے جو اوپر نقل ہو چکی۔ علی مرتضیٰ شیرِ خدا کا بیٹا اور ان بے حیا، غدّار اور پست کردار لوگوں سے جن کا از خود کیا ہوا احسان بھی اہلِ شرف و عزّت کے یہاں قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ اپنے والد ماجد کے نام پر، اپنی والدہ خاتونِ جنت کے نام پر، اپنے نانا سید الانبیاءؐ کے نام پر، اپنے چچا جعفر طیار کے نام پر، اور اپنے نانا کے چچا سیّد الشہداء حضرت حمزہ کے نام پر اپنی جان کی امان مانگے؟ (جیسا کہ وہ تقریر دکھاتی ہے) اور ایک بار نہیں، عنوان بدل بدل کر بار بار مانگے؟ العیاذ باللہ!

اس تقریر میں ننگ و عار کا یہ پہلو ہرگز کوئی ایسا نکتہ نہیں ہے کہ کوئی آکے اُسے کھولے تو لوگوں پر کھلے۔ بالکل کھلی ہوئی اور عام آدمی کو محسوس ہونے والی بات ہے مگر اس حد تک عام آدمی کہاں جا سکتا ہے کہ روایت میں کلام کرے۔ اس پہلو کا معاملہ تو وہ حضرت حسینؓ پر چھوڑ دے گا کہ ہوگی کوئی مصلحت، البتہ یہ بات اس کے دل میں نقش ہو جائے گی کہ حضرت حسینؓ اپنی اصل عظمت یہ سمجھتے تھے کہ وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نواسے، فاطمہ بنت رسول اللہ اور علی "وصی رسول اللہ" کے بیٹے ہیں اور یہی وہ دوسرے مسلمانوں سے چاہتے تھے کہ انھیں اس نسبی عظمت سے دیکھا جائے اور اسی کے مطابق ان کے ساتھ معاملہ کیا جائے۔ اصل اہمیت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اُن کے نسبی رشتے کی ہو، دینی رشتے پر نظر ہو یا نہ ہو (حالانکہ اسلام میں اصل اہمیت تقویٰ اور تدیّن کی ہے نہ کہ نسل و نسب کی) یہ بات اگر مسلمانوں کے ذہن نشیں ہو گئی اور عزّت و احترام کے ساتھ قبول کر لی گئی تو سبائی منصوبے کی کامیابی کیلئے پوری بنیاد فراہم ہو گئی[1] رسول اللہ

---

[1] شیعیت کے سلسلے میں عبد اللہ بن سبا کا بنیادی کردار ایک مانا ہوا کردار تھا لیکن (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

صلے اللہ علیہ وسلم کی خلافت اور وراثت کو ایک نسبی سلسلہ بنا دینے اور نسب ہی میں ساری عظمتیں جمع کر دینے کا کام اس کے بعد کچھ مشکل نہیں رہ گیا۔ بس یہ فلسفہ ہے جو اس سراپا ننگ و عار تقریر کے پیچھے کام کرتا نظر آرہا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

یہی بیماری جو اس تقریر کے ذریعے مسلمانوں کے ذہن میں پیوست کرنے کی کوشش کی گئی تھی اسی کو آگے کی اِن کہانیوں سے خوب خوب گہرائی میں اتارنے کی سعی کی گئی ہے کہ آپ اپنے فرزندوں، بھتیجوں، بھانجوں اور بھائیوں کی لاشوں کی طرف دوڑتے ہوئے جاتے اور اس طرح کے کلمات سے اپنے رنج والم اور بے بسی کا اظہار کرتے۔

بَعُدَ القوم قتلوك و مَن خصمهم یوم القیٰمة منك جدّك[1]	ہلاک ہوں وہ لوگ جنھوں نے تجھے قتل کیا اور جن کے مقابلے میں قیامت کے دن تیرے نانا فریق ہوں۔

اسی طرح کسی رفیق کربلا کی جانبازی اور مردانہ کارکردگی پر اُسے شاباش دیتے ہیں تو اِن روایتوں کے مطابق بایں الفاظ دیتے ہیں:۔

جزاك الله خیرًا عن اهل بیت نبیك[2]	اللہ تمھیں اپنے نبی کے اہل بیت کی طرف سے بہترین بدلہ دے۔

بہرحال یہ تو ایک ضمنی بات کی مثالیں آگئیں۔ اصل منشا یہاں حضرت حسینؓ کی تقریر کے علاوہ اُن مزید کہانیوں کی کچھ نشاندہی ہے جن سے واقعہ میں حضرت موصوف کی شان پر یا آپ کے دیگر اہل بیت کی شان پر دھبّہ آتا ہے، مگر دھوم سے مشہور کی

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری نے جب سے یہ تحقیق پیش کی ہے کہ یہ کوئی حقیقی نہیں بلکہ راویوں کی بنائی ہوئی شخصیت ہے، تب سے شیعہ اہل قلم ابن سبا کی شخصیت کا انکار کرنے لگے ہیں مگر طٰہٰ حسین کی تحقیقات کا حال تو یہ ہے کہ انہوں نے حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام کے وجود کا بھی انکار کر دیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ایک دوسرے مصری محقق انور الجندی کا مجموعۂ مضامین "قضایا معاصرہ" اس سے طٰہٰ حسین کے یہودی رابطوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔

[1] طبری ج ۶ ص۲۵۷ یہ کلمات جس موقع سے نقل کیے جارہے ہیں وہ آپ کے بھتیجے قاسم بن حسنؓ کی شہادت کا موقع ہے۔ [2] ایضاً ص۲۵۵۔

گئی ہیں اور ہر سال تازہ کی جاتی ہیں۔

سب سے بڑی مثال

اس کی سب سے بڑی مثال وہ روایتیں ہیں جو دکھاتی ہیں کہ حضرت حسین دوسرے رفقاء والنصار ہی کو نہیں اپنے خاندان کے ایک ایک فرد کو بھی، حتیٰ کہ نابالغ بچوں کو بھی[1]، اپنے اوپر قربان ہونے کی اجازت دیتے رہے اور جب سوائے ایک بیمار صاحب فراش صاحبزادے، علی بن الحسینؓ (زین العابدین) کے اور کوئی نہ بچا تب آپ نے تلوار اٹھائی۔ اول تو اپنے بچوں ہی کو آدمی، اگر مجبور معذور نہیں ہے تو ہلاکت کے لیے آگے نہیں بڑھاتا یا کم از کم اکیلا نہیں چھوڑتا۔ اور یہاں روایتیں ہمیں باور کرا رہی ہیں کہ نہ صرف صاحبزادے علی اکبر (بعمر ۱۹-۲۰ سال) کو اکیلا آگے بڑھنے دیا اور پھر دیکھتی آنکھوں اکیلا ہی آخر دم تک لڑنے بھی دیا، بلکہ بھتیجوں اور بھانجوں اور بھائیوں کے ساتھ بھی اُن کی کم عمری کے باوجود یہی معاملہ رکھا! کوئی بتائے کہ کیسے یقین کیا جائے؟ اور یقین کیا جائے تو پھر کیسے حضرت والا کے لیے عقیدت کو ایک شدید احساس کی چبھن سے بچایا جائے؟

ایک تاویل لاطائل

بات خدا لگتی ہے، چنانچہ جو لوگ ان روایتوں کے قائل ہیں وہ بھی اس سوال سے آنکھیں نہ چرا سکے۔ مگر تاویل کی راہ کہیں بھی بند نہیں ہوتی۔ چنانچہ جناب علی نقی صاحب کی کتاب "شہید انسانیت" جس کا ہم پہلے تذکرہ کر چکے ہیں۔ اس میں بھی یہ سوال

---

[1] یہ ابھی قاسم بن الحسنؓ کا جو نام گزرا ہے۔ ان کے بارے میں "شہید انسانیت" میں تصریح ہے کہ بالغ نہیں ہوئے تھے (ص ۵) اور شہادت کا جو واقعہ طبری میں ہے اس میں بھی کچی عمر کی علامتیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً زخم کھا کر "ہائے چچا" پکارنا وغیرہ۔

سامنے لایا گیا ہے اور خطابت و ذہانت کی پوری صلاحیتیں صرف کر کے اس کا حل یوں پیش کیا گیا ہے کہ:۔

"حسین کے لیے نسبتہً یہ بہت آسان ہوتا کہ سب سے پہلے آپ اپنی جان کا ھدیہ راہ حق میں پیش کر دیتے۔ اس صورت میں آپ کی قربانی اپنی جان کی قربانی ہوتی اور اس کو کسی ایسے شہید کی قربانی سے بڑا درجہ نہ دیا جا سکتا جس نے کبھی بھی حمایت حق میں اپنی قربانی پیش کی ہو۔

اس صورت میں آپ کی قربانی اس سے زیادہ وقیع نہیں سمجھی جا سکتی تھی جتنی کہ بقول نصاریٰ حضرت عیسیٰ کی قربانی، کہ آپ دینِ حق کی تبلیغ کی وجہ سے سولی پر چڑھا دیئے گئے۔ یا سقراط کی قربانی کہ ان کو اصول کی حمایت میں زہر کا جام پینا پڑا۔ اور حسین کے لیے اس منزل سے گزر جانا مشکل ہی کیا ہوتا جب کہ آپ اسی باپ کے بیٹے تھے جس کا قول یہ تھا کہ مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ موت مجھ پر آ پڑتی ہے یا موت پر میں جا پڑتا ہوں اور نیز یہ کہ موت سے اس سے زیادہ مانوس ہوں جتنا کہ بچّہ پستانِ مادر سے مانوس ہوتا ہے...... مگر حسین کی شہادت کو جو خاص امتیاز حاصل ہے وہ اسی لیے کہ آپ نے ایسے ہر ہر فرد کو جو آپ کی ذات سے دور یا قریب کا تعلق رکھتے تھے، اپنی موجودگی میں راہِ حق میں نثار کر دیا...... حسین کا کمالِ عمل محض یہی نہیں تھا کہ وقت اور موقع آنے پر آپ نے اپنی جان راہِ خدا میں پیش کر دی بلکہ آپ کے نفس کا کمال یہ تھا کہ آپ نے جان سے عزیز ہستیاں رضائے حق کے راستے میں یکے بعد دیگرے قربان کر دیں[1]۔ اور جب تک صبر و تحمل کے ساتھ ان تمام

---

[1] اگرچہ ان میں ایسے کم عمر بھی تھے، جیسے کم عمروں کو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے جہاد میں شریک ہو کر راہِ خدا میں بھی اپنی جان قربان کرنے کی اجازت نہیں دی ؟

دشوار گزار مراحل کو طے نہ کر لیا اس وقت تک خود اپنی جان کا ہدیہ پیش نہیں کیا[1]۔"

ایک بے معنی اور ناقابلِ فہم بات کو "خطیبانہ فلسفہ" بنانے کی یہ کوشش ایک بڑے فاضل اور نامی گرامی شیعہ عالم کی ذہانت وریاضت کا ثمرہ ہے جس میں کسی سنجیدہ سوال کا جواب نہیں ملتا۔ البتہ ایک سوال اور پیدا ہوجاتا ہے کہ کیا امام کی شان حضرت عیسیٰؑ سے بھی بالاتر تھی؟ بس اسی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ معاملہ کس قدر ناقابلِ توجیہہ اور ناقابلِ حل ہے۔ حل واقعہ میں صرف ایک ہی ہے کہ ان روایتوں کو جن کی سندیں کوئی وزن نہیں رکھتیں اور جن میں دس علامتیں موضوع ہونے کی پائی جاتی ہیں انھیں موضوع قرار دیکر رد کیا جائے۔ لیکن یہ فیصلہ ظاہر ہے کہ صرف وہی لوگ کرسکتے ہیں جنھوں نے اپنا دین وایمان مظلومیت حسینؓ کے ماتم کو نہیں قرار دے رکھا ہے ورنہ تو ان روایتوں کی حفاظت لازم ہوجاتی۔ اس لیے کہ ان کے بغیر وہ فضا ہی نہیں بن سکتی جس میں ماتم ہی اوّل اور ماتم ہی آخر ہو جائے۔ مثلاً حضرت محمد الباقر والی روایت لے لیجئے جس المیۂ کربلا کو بغیر نمک مرچ لگائے اور بغیر ایک رزمیہ داستان بنائے سیدھے سادے لفظوں میں یوں پیش کر دیا گیا ہے کہ :

> پس جب آپ نے ابن زیاد کے ہاتھ پر بیعت کی شرط پوری کرنے سے انکار کیا تو) عمر بن سعد نے آپ سے قتال کیا۔ اس میں آپ کے تمام اصحاب شہید ہو گئے جن میں آپ کے اپنے گھر کے قریبًا ۱۵۔۲۰ جوان بھی تھے[2] بعد ازاں آپ نے خود قتال کیا اور آپ بھی شہید ہوئے۔

اس روایت سے ظاہر ہے کہ ماتم کے کاروبار کو رونق نہیں مل سکتی۔ اس میں ایک کے بعد ایک لاشہ گرنے کا منظر نہیں آتا۔ اس لاشے پر حضرت حسینؓ کا دوڑ کے جانا اور حزن و

---

[1] "شہید انسانیت" صفحہ ۱۴۲-۵۱۳ [2] البدایہ والنہایہ میں ان حضرات کی بابت کئی اقوال نقل کیے گئے ہیں ایک قول ۱۶ کا ہے جو حسن بصریؒ کی طرف منسوب ہے۔ ایک ۱۷ کا جو محمد بن حنفیہ کی طرف منسوب ہے اور ایک ۲۳ کا قول ہے۔ (ج ۸ صفحہ ۱۸۹)

الم کے کلمات ادا فرمانا نہیں آتا۔ حضرت زینب سر کھولے سینہ پیٹتی اور پچھاڑیں کھاتی ہوئی نہیں آتیں، لاش سے لپٹ کے بین کرتی نہیں پائی جاتیں۔ حضرت حسین پیاس کی شدت سے فرات کی طرف گھوڑا دوڑاتے ہوئے اور عین اس حالت میں کہ پانی حلق سے اتار رہے ہیں، گلے میں دشمن کا تیر کھاتے ہوئے اور پھر ان کے لیے یوں بد دعا کرتے نہیں دکھائی دیتے کہ :-

"اے اللہ اِن کو گن لے اور پھر انھیں چُن چُن کے مار اور ایک کو بھی باقی نہ رکھ۔"[1]

اور پھر بعد میں زخموں سے چور دشمن کے نرغے میں گھرے ہوئے اُن سے یوں مخاطب ہوتے ہوئے بھی نہیں ملتے، جس سے ایک عاجزی اور بیچارگی کی تصویر بنتی ہے کہ :-

"کیا تم میرے قتل پر ایک دوسرے کو اکساتے ہو؟ یاد رکھو کہ میرے بعد کوئی ایسا بندہ نہیں ہے جس کے قتل سے اللہ اتنا ناراض ہو جتنا میرے قتل سے ہوگا .... اور اگر تم نے مجھے قتل کر ہی دیا (اور نہ مانے) تو اللہ تم پر آپس کی لڑائی اور خونریزی کا عذاب مسلّط فرمائے گا اور پھر اس عذابِ دنیا پر بس نہ کرتے ہوئے (آخرت کے) عذابِ الیم کا اس پر اضافہ فرمائے گا۔"[2]

اور پھر حضرت زینب یہ کہتی ہوئی نہیں نکل آتیں کہ :-

یا عمر بن سعد ایقتل ابو   اے عمر بن سعد کیا ابو عبد اللہ (حسینؓ)

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۵۸ [2] طبری ج ۶ ص ۲۶۰ اس عبارت میں علاوہ اس بات کے کہ اور سب کو کٹوا کر حضرت حسین اپنی جان بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ عبارت کے زیرِ خط الفاظ بھی توجہ طلب ہیں، قرآن کے اسلام میں ایک نبی اور رسول کے علاوہ کوئی شخص مجاز نہیں کہ ایسا گمان اپنے بارے میں رکھے فَلَا تُزَكُّوا أَنفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَىٰ ۔ اپنی پاکیزگی (بزرگی) کے دعوے نہ کرو اللہ بہتر جانتا ہے کون متقی ہے (النجم آیت ۳۲) کیسے مانا جاسکتا ہے کہ حضرت حسین قرآنِ پاک کی اس تعلیم سے نا آشنا تھے اور معاذ اللہ وہ باتیں زبان پر لا رہے تھے جو اہلِ تقویٰ کی شان نہیں۔

عبد اللہ وانت تنظر الیہ [1]　　　قتل ہوں گے اور تم دیکھ رہے ہو گے؟

چنانچہ اُس سادہ روایت کا ذکر، باوجود حضرت محمد الباقر کی روایت ہونیکے مشکل ہی سے کہیں ملیگا۔

قصہ مختصر

اختصار کی کوشش کے باوجود قصہ طویل ہو گیا۔ مختصر یہ ہے کہ معرکۂ کربلا کی لمبی چوڑی کہانیاں، علاوہ اس کے کہ موقع و محل کے حالات ان کے وقوع کے لیے گنجائش نہیں دکھاتے اور علاوہ اس کے کہ ان قصّوں کی سندیں نہایت بے وقعت ہیں، یہ قصّے متعدد پہلوؤں سے خانوادۂ نبوت پر داغ بنتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی مثال کے ذکر سے ہم نے اوپر بات شروع کی تھی، اور اس کے ضمن میں باقی وہ تمام باتیں بھی آگئی تھیں جن کو الگ الگ ذکر کرنے کا ارادہ تھا۔ یعنی حضرت حسین کا اپنے آپ کو اپنی زبان سے مقدّس اور مقبول بارگاہِ حق بتانا۔ جس کی کوئی گنجائش رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں نہیں ہے۔ اپنے دشمنوں کو بد دعائیں دینا، جو اُن کے نانا کی سنّت نہیں اور مردوں کا میدان جنگ میں شیوہ نہیں۔ سیدہ زینبؓ بنت خاتونِ جنت کا بین و بکا کرتے ہوئے بار بار میدانِ جنگ میں آنا اور لاشوں سے لپٹ کے رونا چلّانا۔ پھر حسینؓ کے لیے عمر بن سعد سے رحم کی اپیل کرنا۔ بھلا یہ باتیں کہیں خانوادۂ نبوت کی خواتین کو زیب دیتی ہیں اور خاتون بھی علی مرتضیٰ جیسے شیر مرد کی بیٹی۔ یہ روایتیں اگر قابلِ اعتبار ہو سکتی ہیں تو صرف ان لوگوں کے لیے جنھیں خانوادۂ نبوت کی محبّت کے نام پر ان کی مظلومیت کے ماتم کی دوکان کھولنی ہے خواہ مظلومیت کی اس داستان کو رنگین کرنے کے لیے ان تمام چیزوں کا اپنے ہی ہاتھوں سے خون کرنا پڑے جو اس خانوادے کا اور کسی بھی خانوادے کا شرف اور اس کی عزّت ہوں۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۶

۴۔ بندشِ آب

داستان کربلا کا ایک اور اہم جزو ابن زیاد کی طرف سے قافلۂ حسینی پر پانی کی بندش ہے۔ دوسرے اجزاء پر گفتگو نے اتنا وقت لے لیا کہ اب جی چاہتا ہے یہ گفتگو ختم ہو مگر اس بندشِ آب والے جزو کی اہمیت اجازت نہیں دیتی کہ اس سے اغماض کر لیا جائے۔ یہ بندش ۷ محرم سے بتائی گئی ہے اور اہلِ قافلہ کا پیاس سے خاص کر خود حضرت حسین کا وہ برا حال سنایا جاتا ہے کہ سخت حالت جنگ میں بھی دشمن کو نقصان پہنچانے یا اس سے اپنا دفاع کرنے سے بھی بڑھ کر پانی کا حصول ایک مسئلہ بن گیا تھا! حالانکہ اسی یوم عاشورہ کی روایتوں میں ایک روایت یہ بھی موجود ہے کہ جنگ شروع ہونے سے پہلے حضرت حسین اور اُن کے ساتھیوں نے یکے بعد دیگرے غسل کیا اور ایک بڑے برتن میں مشک گھول کر تیار کیا گیا تھا جو ان حضرات نے جسم پر لگایا۔ اس کے علاوہ کربلا کا میدان جس کے بارے میں روایتوں نے یہ تاثر دیا ہے کہ وہ ایک بے آب و گیاہ ریگستان تھا اس کی تردید کے لیے حضرت محمد الباقر والی وہ روایت کافی ہے جس کا کچھ حصّہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ جس کے مطابق کربلا ایک ایسی زمین تھی جس میں نرکل اور بانس کا جنگل یا جھاڑیاں موجود تھیں اور یہ خشک ریگستان میں نہیں ہوا کرتیں۔ یہ مسلّم ہے کہ یہ دریائے فرات یا اس سے نکلنے والی کسی نہر کا کنارہ تھا۔ یہاں پانی زمین کی سطح سے اتنا قریب تھا کہ تھوڑی سی زمین کھودو اور پانی لے لو۔ مُعجم البُلدان میں کربلا کے ذیل میں صراحت ہے کہ یہاں کی زمین میں نرمی (رَخْوَة) ہے۔ اور یاد آتا ہے کہ طبری ہی میں یہ روایت موجود ہے کہ اصحاب حسینؓ کو بھی زیر زمین کا یہ تجربہ ہوا تھا کہ ذرا سا کھودنے پر پانی نکل آیا۔[1] بہرحال "یہ تاریخی حقیقت" کے نام پر خالص ایک پروپیگنڈہ ہے کہ کربلا میں پانی نایاب یا کمیاب تھا اور اس سے ۷ محرم سے بندشِ آب

---

[1] دمِ تحریر صفحہ کا حوالہ مجھے دستیاب نہیں ہے لیکن میرا خیال یہ ہے کہ میری یادداشت صحیح ہے تلاش سے طبری میں (یا ابن اثیر میں) وہ موقع نکل آئے گا۔

والے افسانے کی حقیقت بھی ظاہر ہو جاتی ہے ۔

معاملے کے کچھ اور پہلو!

کربلا جیسی لبِ دریا سرزمین پر اس بات کو ممکن سمجھ لینا کہ وہاں ڈیڑھ دو سو ایسے مسلح انسانوں پر جن میں تینتیس بتیس سوار بھی تھے، مسلسل تین دن تک پانی کی مکمل بندش کی جا سکتی تھی، یہ بات عقل و خرد سے مکمل رخصت لیے بغیر ممکن نہیں ۔ ہاں اگر یہ بات کہی جائے کہ پانی کا گھاٹ ـــ یعنی اس جگہ کا جو قریبی گھاٹ تھا وہ ـــ روکا گیا تھا۔ تاکہ حسینی قافلہ بسہولت پانی نہ لے سکے تو یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ پانی کے گھاٹ سے ہٹ کر پورے دریا پر روک ممکن نہیں ہو سکتی اور واقعہ یہ ہے کہ روایت میں گھاٹ روکنے ہی کا ذکر ہے جس کے الفاظ آگے آ رہے ہیں ۔

لیکن اس میں بھی "تاریخ" سے شروعات کی جو بات کہی جاتی ہے، اور وہ بندش آب والی روایت میں آئی ہے، وہ بھی ایسی ہی ناقابلِ فہم ہے جیسی مکمل بندش والی بات۔ اسکے برخلاف جو بات واقعاتی لحاظ سے قابلِ فہم ہے وہ یہ ہے کہ ۱ار تاریخ کو جب دشمن نے قطعی اقدام کا فیصلہ کر لیا تو اپنی جلد از جلد کامیابی کے لیے جہاں دوسرے ذرائع اور ہتھیار استعمال کیے وہاں ایک تدبیر یہ بھی اختیار کی جو جنگ میں عام طور پر کی جاتی ہے کہ فریقِ مخالف کے لیے پانی کا حصول مشکل بنا دیا جائے۔ اس سے قدرتی طور پر مخالف فریق کی قوتِ مدافعت گھٹتی ہے۔ پس اگر یہ دعویٰ کیا جائے یا یوں کہیے کہ روایت میں اس طرح کی بات کہی گئی ہو، تو یہ ایک قابلِ فہم بات ہے اور اس پر کسی کو کلام کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوگی۔ نیز واقعے کے تمام پہلوؤں کی روایات کے چوکھٹے میں اس کا فٹ ہونا بھی دقت طلب نہ ہوگا۔ جبکہ اس کے برعکس "تاریخ والی روایت بعض دوسری روایتوں کے ساتھ جوڑ نہیں کھا سکتی بلکہ ایک تضاد کا درجہ لیئے ہوئے نظر آئیگی۔ آئیے اس پہلو سے روایت کا جائزہ لیجیے ۔

ہم نے اگرچہ تفصیل اور ترتیب کے ساتھ وہ روایات اس کتاب میں جمع نہیں کی ہیں جن میں ابن سعد اور حضرت حسین کے درمیان نامہ وپیام اور ملاقاتوں کا بیان ہے۔ اور پھر اس کے نتیجے میں ابن سعد اور ابن زیاد کے درمیان ہونے والی خط وکتابت کا بیان آتا ہے، تاہم کچھ نہ کچھ ذکر ان سب چیزوں کا اسی باب کے اوپر کے صفحات میں آچکا ہے، اور یوں بھی یہ باتیں واقعۂ کربلا کے سلسلے میں بہت مشہور و معروف ہیں۔ اس لیے قارئین اس بات سے بے خبر نہیں ہو سکتے کہ جس وقت سے ابن سعد نے کربلا میں قدم رکھا اسی وقت سے اُس کے اور حضرت حسین کے درمیان نامۂ وپیام اور پھر ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور پھر اس کا نتیجہ ابن سعد اور ابن زیاد کے درمیان خط وکتابت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جس کا حاصل یہ تھا کہ ابن سعد حضرت حسین کے ساتھ کیا رویّہ اختیار کرے؟ اس سلسلہ میں کئی ایک روایات ہیں جن کا مجموعی تأثر یہ بنتا ہے کہ طرفین کی یہ سلسلہ جنبانی بالکل آخر وقت تک قائم رہی۔ اور دو روایتیں تو صراحت کے ساتھ بتاتی ہیں کہ ۹ تاریخ کی شام کو یہ سلسلہ بند ہوا۔ ان دونوں روایتوں کا ذکر اوپر اسی باب میں آچکا ہے۔ طبری جزو ۶ میں اِن میں سے ایک روایت ص۲۲۲ پر سعد بن عُبیدہ کے حوالے سے ہے۔ دوسری ص۲۳۶-۳۷ پر عبداللہ بن شریک عامری کے حوالے سے۔

معاملات کے اس پس منظر میں ذرا غور کر کے دیکھنا چاہیے کہ ، تاریخ سے بندش آب کا نہ صرف حکم بلکہ اس کا نفاذ بھی بتانے والی روایت کو ماننے کی گنجائش کہاں سے نکل سکتی ہے؟ اور وہ بات الگ رہی جو اس گفتگو کے شروع میں عرض کی گئی ہے کہ قتل وقتال کی حالت میں تو (جو ۱۰ تاریخ کو ہوا) بندش آب کی کاروائی کچھ بامقصد اور بامعنیٰ ہو سکتی تھی۔ بغیر قتل و قتال کی حالت کے یہ ایک فضول سی، محض بدنامی مول لینے والی بات تھی۔ مزید برآں کیا یہ ممکن ہے کہ ، تاریخ سے ایسا ہوا ہو اور ۱۰ تاریخ سے پہلے کہیں کسی طرح بھی اس کی شکایت کی کوئی روایت نہ پائی جائے؟ تمام شکایتی بیانات ۱۰ تاریخ ہی کے ذیل میں

آتے ہیں۔ اس سے پہلے کا کوئی بیان نہیں ملتا حالانکہ دونوں فریقوں میں برابر رابطہ چل رہا تھا!

روایت کی اندرونی شہادت

روایت میں اس بات کی صراحت تو ہے ہی، جیساکہ اوپر ذکر کیا گیا، کہ بندشِ آب کی صورت صرف یہ تھی کہ گھاٹ روکا گیا تھا:۔

"..... پس عمر بن سعد نے عمرو بن الحجاج کو پانچسو سواروں کا دستہ دے کر بھیجا اور وہ گھاٹ پر جا اُترے[1] اور حسین اور ان کے ساتھیوں اور پانی کے بیچ میں حائل ہو گئے......"

اس کے علاوہ اس بات کی بھی علامت روایت کے اندر پائی جاتی ہے کہ یہ کاروائی ۷/تاریخ ہی کو عمل میں آئی جو جنگ کا دن تھا، کیونکہ روایت میں اگرچہ مذکورہ بالا الفاظ کے بعد "وذالك قبل قتل الحسين بثلاث" (اور یہ شہادت حسین سے تین دن پہلے کی بات ہے) کے الفاظ آتے ہیں مگر پھر فوراً ۱۰/تاریخ ہی کا قصہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس سے پہلے کی کوئی بات نہیں۔

قال ونازله عبد الله بن ابی الحصین الازدی وعداده فی بجیلة فقال یاحسین الا تنظر الی الماء کانه کبد السماء والله لاتذوق منه قطرة حتیٰ تموت عطشاً[3]	حُمید کہتا ہے کہ عبداللہ بن ابی الحصین ازدی، جس کا شمار بجیلہ میں ہوتا تھا،[2] حضرت حسین کے مقابلہ پر آیا اور کہا کہ حسین تم پانی کو دیکھ رہے ہو کیسا آسمان کی طرح شفاف ہے۔ قسم خدا کی تم اس سے ایک قطرہ بھی نہ چکھ سکو گے حتیٰ کہ

[1] روایت کے اصل الفاظ میں "فنزلوا على الشريعة" (طبری ج ۶ صفحہ ۲۳۴) "شریعۃ" کے معنی گھاٹ یا گھاٹ کا راستہ۔
[2] یعنی سرکاری رجسٹر میں اس کا نام قبیلۂ بجیلہ کے تحت درج تھا۔ [3] حوالۂ سابق۔

پیاس سے (معاذ اللہ) دم نکل جائے۔

سچ بات یہ ہے کہ بالکل سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں یہ بے تکے طور پر "شہادت سے تین دن پہلے" کے الفاظ روایت میں درج کیے گئے ہیں۔ حضرت حسین رضؓ سے کسی کا مقابلہ از تاریخ سے پہلے کہیں مروی نہیں اور پانی کی کوئی شکایت بھی ۱۰ تاریخ سے پہلے کہیں بیان نہیں کی گئی۔

اور خود راوی کے اوصاف!

اس روایت پر غور و فکر کے سلسلے میں اس کے راوی حُمید بن مسلم کے کردار پر بھی نظر ضروری ہے۔ واقعۂ کربلا کے سلسلہ میں اس کی روایات بے شمار ہیں جن میں اس بات کے نہایت واضح قرائن ہیں کہ اس کی روایتیں ہی جعلی اور خانہ ساز نہیں بلکہ یہ خود بھی شاید ایک جعلی شخصیت ہے۔ ورنہ ایک نہایت موقع پرست اور کوفیوں کے امتیازی (TYPICAL) اوصاف کا مجسّمہ ہے۔ ویسے تو یہ اپنے آپ کو ابن سعد کی فوج میں شامل بتاتا ہے۔ اور جب تک واقعۂ شہادت ہو نہیں جاتا یہ اپنا کوئی ذرا سا بھی ہمدردانہ کردار اہل بیت کے ساتھ نہیں دکھاتا مگر جیسے ہی یہ واقعہ ہو لیتا ہے نہ صرف اس سے بڑھ کر اہل بیت کا کوئی ہمدرد کربلا کے میدان میں نظر نہیں آتا بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ صفِ اعداء کا نہیں صفِ حسینی کا آدمی تھا۔ جنگ کے وقت میں حضرت حسین نے دشمنوں کی جارحیت اور سفّاکی پر جو ردِّ عمل اللہ سے دعا یا بد دعا کی صورت میں یا اظہار رنج والم کی صورت میں ظاہر فرمایا اس کا ایک ایک لفظ آپ اس شخص کی زبان سے سن لیجئے جیسے کوئی ہمزاد ہو۔

ایسا لگتا ہے کہ واقعۂ کربلا کے تین چار سال بعد یزید کی موت کے ساتھ ہی جب وقت بدلا اور ایک طرف حضرت عبداللہؓ بن زبیر اور دوسری طرف مختار ثقفی نے ہمدردانِ بنی اُمیّہ اور قاتلانِ حسین کے لیے زمین تنگ کر دی تو بہت سے لوگوں نے عافیت طلبی کے لیے

چولا بدلا، حُمید بن مسلم واقعی اگر اُس زمانے کا کوئی شخص تھا تو یقیناً انہی چولا بدلنے والوں میں سے ایک تھا۔ اہلِ بیت کی ہمدردی میں طرح طرح کے غم انگیز افسانے تراشتا ہے۔ یہاں تک کہ اس معاملہ میں اپنے آپ کو شمر جیسے سخت آدمی سے بھی لڑتا جھگڑتا اور اُسے مغلوب کر لیتا ہوا دکھاتا ہے۔ جو کہ روایات کی روشنی میں حادثۂ کربلا کا سب سے بڑا ذمّہ دار ہے۔ اور جس کی آمد کے بعد ابن سعد کو بھی اس قتل وقتال پر مجبور ہونا پڑا تھا جس کو وہ برابر ٹالنے کی کوشش میں لگا تھا[1]۔ ان افسانوں سے جن میں سے ایک یہ بندشِ آب والا افسانہ بھی ہے، وہ ایک طرف اپنے آپ کو محبّانِ اہلِ بیت میں شمار کرا رہا تھا، دوسری طرف نظر آتا ہے کہ وہ اس موقع سے ذاتی اور خاندانی رنجشیں یا رقابتیں بھی چکا رہا تھا۔ ورنہ جب یہ خود یزیدی لشکر میں تھا تو اس کے لیے کوئی جواز نہ تھا کہ مظالم کی روایتوں میں افراد کو بھی نامزد کرتا جیسا کہ اوپر کے اقتباس میں عبداللہ بن ابی الحصین کا نام اس نے دیا ہے۔ اس کی روایتوں میں یہی تنہا ایک نامزد رپورٹ نہیں ہے۔ بار بار وہ یہی کام کرتا نظر آتا ہے۔ حضرت حسینؓ کے جسدِ مبارک کو گھوڑوں کی سُم سے روندے جانے والی روایت میں (جس پر آگے کلام آئے گا) یہ دس آدمی اس ناپاک کام میں شریک بتاتا ہے مگر صرف دوؔ کا ذکر نام کے ساتھ کرتا ہے۔ اس طرح کا معاملہ اس کی اور روایتوں میں بھی ہے۔ بلکہ اس شخص کے اسی کردار کی بنا پر یہ بھی خیال ہونے لگتا ہے کہ کہیں شمر کی بدنامی میں بھی اُس کی اپنی واقعی بداعمالیوں کے ساتھ حُمید بن مسلم کی "مہربانیوں" کا بھی تو کافی دخل نہیں ہے؟ اس لیے کہ اس کی روایتوں میں شمر کا ذکر بار بار آ جاتا ہے اور اس ذکر میں اس کی بُرائیاں الم نشرح کرنے سے حُمید کی بہت ہی خصوصی دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔ اگلے باب میں حُمید پر اس کی کچھ اور روایتوں کے ماتحت بھی گفتگو آئے گی۔

---

[1] طبری ج ۶ صفحہ ۲۶۰ پر اس کی روایت میں دکھایا گیا ہے کہ حضرت علی زین العابدینؒ جو قتل وقتال کی زد سے بچ رہے تھے انھیں بعد میں شمر کی زد سے بچانے کا کارنامہ اسی فدوی کا ہے۔

خلاصۂ کلام

یوم عاشورہ کے واقعات کی روایتوں کے سلسلے میں جن مختلف پہلوؤں کو اوپر کے صفحات میں اُجاگر کیا گیا اُن کے پیشِ نظر اس بات میں کسی شبہ کی گنجائش نظر نہیں آتی کہ یہ روایتیں بالعموم ناقابلِ اعتبار بلکہ بیشتر بالبداہت (EVIDENTLY) قابلِ رد ہیں اس لیے عقل اور نقل، قانونِ شریعت اور تقاضائے دیانت ہر ایک کے ماتحت ان روایتوں کی فراہم کی ہوئی تفصیلات کو کم از کم ناقابلِ اعتبار ضرور قرار دیا جانا چاہیے اور اس سے زیادہ کچھ کہنے کی گنجائش نہیں سمجھی جانی چاہیے جو ایسی روایتوں میں آتا ہے جیسی روایت حضرت محمد الباقر کے حوالے سے اوپر نقل کی گئی کہ[1]:۔

"جب حضرت کربلا میں ٹھہرنے پر مجبور ہو گئے (اور کوفیوں کی غداری لشکرِ عمر بن سعد کی شکل میں عملاً سامنے آگئی) تو آپ نے اس نئی صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے) تین شکلیں ابن سعد کے سامنے رکھیں۔ میں[1] حجاز واپس چلا جاؤں۔ یزید[2] کے پاس چلا جاؤں۔ یا کسی سرحد پر نکل جاؤں (یعنی ملک چھوڑ دوں) ابن سعد نے تجویز پسند کی اور ابن زیاد کے پاس بھیجدی۔ وہاں سے نامنظور ہوئی اور اس کی جگہ یہ حکم آیا کہ وہ (کسی اور بات سے پہلے) ابن زیاد کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ (پھر ان کی کسی بات پر غور کیا جائے گا) اس شرط کو حضرت حسینؓ نے قطعی طور سے رد کر دیا۔ نتیجہ میں ابن سعد نے (جیسا کہ اس کو حکم تھا) طاقت استعمال کی اور اس میں حضرت حسین کے تمام ساتھی شہید ہوئے۔ ان میں آپکے گھرانے کے بھی قریباً ۱۵۔ ۲۰ جوان تھے۔ آپ کا ایک چھوٹا بچہ بھی اک

---

[1] یہ احتیاط علمی ذمہ داری ہی کی بنا پر لازم نہیں ہے بلکہ شرعی اور اخلاقی ذمہ داری بھی یہی چاہتی ہے اس لیے کہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کا تعلق دو فریقوں سے ہے اور شرعاً و اخلاقاً کسی فریق کی حمایت یا مخالفت میں کوئی بات مضبوط شہادت کے بغیر جائز نہیں۔

تیر آکر لگنے سے شہید ہوا۔ اس کے بعد آپ نے بھی تلوار اٹھائی اور قتال کرتے
ہوئے شہید ہو گئے۔[1]

روایتِ حضرت باقر کی خطا؟

واقعۂ کربلا کے بیان میں شیعہ نقطۂ نظر کو براہ راست جاننے کی غرض سے جو چند کتابیں مجھے دیکھنے کا موقع ملا اس سے ظاہر ہوا کہ حضرت محمد الباقر کی یہ روایت ان حضرات کے یہاں ذکر میں نہیں لائی جاتی۔ حالانکہ سند کے اعتبار سے ان حضرات کے یہاں اس کی بے حد وقعت ہونی چاہیے تھی[2]۔ ہاں اس کا آخری حصہ جو دربار یزید میں حضرت حسینؓ کا سر لیجائے جانے سے متعلق ہے، جس کا ذکر ہم آگے کریں گے، اس کا تذکرہ یہ حضرات کر دیتے ہیں۔ وجہ صرف یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس روایت میں یزید کے پاس جانے کی پیش کش بھی پائی جاتی ہے۔ اور یہ پیش کش باوجود "حسین کی پیش کش" ہونے کے ایسی ناخوشگوار شئی گردانی گئی ہے کہ یوم عاشورہ کی جن روایتوں کا بڑے ذوق وشوق سے بیان کیا جاتا ہے، ان میں بھی جہاں کہیں اس پیش کش کی بات صراحتہً یا اشارۃً آگئی ہے وہاں یا تو روایت کا بیان اسی جگہ ختم کر دیا گیا ہے، یا یہ جزو حذف ہے۔ کئی ایک مثالوں میں سے بس ایک مثال حضرت حسین کے رفیق زُہیر بن قَین کی اُس تقریر کی لے لیجئے، جو اسی باب میں اوپر گزر چکی ہے۔ اس میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں کہ:-

> "اے اللہ کے بندو، فاطمہ رضوان اللہ علیہا کی اولاد بہ نسبت ابن سُمَیّہ (ابن زیاد) کے تمہاری محبت اور نصرت کی زیادہ مستحق ہے۔ لیکن اگر تم ان کی مدد نہیں بھی کرتے تو ان کے قتل کے درپے ہونے سے تو باز آؤ اور اس آدمی

---

[1] طبری ج ۶ صفحہ ۲۲۰ [2] اور جیسا کہ باب نمبر ۱ میں گذر چکا ہے محققین اہل سنت کے یہاں تو قصے کی تمام روایتوں میں دو ہی روایتیں سند کے اعتبار سے قوی ہیں اور ان میں سے ایک یہی حضرت محمد الباقر کی روایت ہے۔

(حضرت حسینؓ) کے اور اس کے چچا زاد یزید بن معاویہ کے درمیان سے ہٹ جاؤ۔ میری جان کی قسم یزید کو تم سے راضی کرنے کیلئے اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ تم حسینؓ کو قتل کرو[۱]۔"

لیکن "شہید انسانیت" کے مصنّف اس تقریر کو اس پیشکش سے پہلے والے جملے پر ہی ختم کر گئے ہیں[۲]۔ یہ بعد کے جملے بھی اُن کے قارئین تک پہنچ جائیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حسینؓ یزید کے پاس جانا چاہتے تھے[۳] اس کو انھوں نے پسند نہیں فرمایا۔

اور شیعہ حضرات کو کیا کہیں، خود اہل سنّت حضرت حسینؓ سے متعلق شیعی تصوّرات سے اس درجہ متاثر ہوئے ہیں کہ ان کے یہاں بھی واقعے کے اس جزو کو، جو حتمی طور پر ثابت ہے، "تاریکی ہی میں رکھنا عام طور پر پسند کیا گیا۔ ۱۳۷۳ھ م ۱۹۵۳ء کا "واقعہ کربلا" نامی راقم کا مضمون جس پر "نظر ثانی" اس کتاب کی شکل اختیار کر گئی جو آپ پڑھ رہے ہیں، اُس مضمون میں راقم نے اس حقیقت سے بے خبری کے عالم میں کہ حضرت حسینؓ نے جو سہ رخی پیش کش کربلا میں کی تھی، جس کا ایک جزو یزید کے پاس جانا اور اکثر روایتوں کے مطابق بیعت کے لیے جانا تھا[۴]، اس کا یہ جزو مکمل تاریکی میں ہے، اس جزو کو بھی روشنی دکھاتے

۱؎ طبری ج ۶ ص ۲۴۳ ۲؎ ملاحظہ ہو ص ۱۸۰-۲۸۰ ۳؎ حُرّ بن یزید تمیمی کی تقریر اور اس سے متعلق قصّے میں بھی بار بار حضرت حسین کے پیش کردہ شرائط کے الفاظ بار بار ہیں۔ وہ روایت جس میں شمر، ابن زیاد کو یہ شرائط قبول کرنے سے روکتا ہے اس کا تقریباً ہر مصنف کے یہاں تذکرہ ہوتا ہے اسی روایت میں وہ شرائط پوری تفصیل سے موجود ہیں مگر ان کی طرف سے تجاہل برتا جاتا ہے۔ آخری بات یہ ہے کہ اس مسئلہ پر اختلافی بیانات اور راویوں کی روایتیں طبری نے ص ۲۳۵ پر درج کر دی ہیں ان کا یکجائی مطالعہ بھی صاف طور سے اسی نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ بیان شرائط والی روایتیں ہی مضبوط ہیں اور خود طبری نے گویا یہی تاثر دیا ہے۔

۴؎ ان روایتوں کے الفاظ ہیں حتّٰی اضع یدی فی یدہٖ جس کا لفظی ترجمہ ہے تاکہ میں اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیدوں) کوئی اس عبارت کا ترجمہ "بیعت" سے نہ بھی کرنا چاہے تو "سپردگی" سے پھر بھی کرنا ہی ہوگا، اور پھر فرق کیا رہا؟ ویسے "سر داد و نداد دست در دست یزید" والے مشہور مصرعے کے مطابق تو ان الفاظ کا مطلب بیعت ہی ہوتا ہے۔

کی غلطی کر دی اور بس یہ "غلطی" قیامت خیز ہو گئی۔ بہت بہت پڑھے لکھے سنی حضرات جن میں میرے بعض بڑے محترم اور مشفق بھی شامل تھے، ان کے لیے حضرت حسینؓ کی طرف اس بات کی نسبت ناقابلِ برداشت ہوئی اور معاملہ اس وقت ٹھنڈا ہوا جب الفرقان کی اگلی اشاعت میں تاریخ طبری اور ابن کثیر وغیرہ کے پانچ چھ حوالوں سے اصل عربی عبارتوں میں وہ پیش کش نقل کر دی گئی اور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ اس پیش کش کی بات کوئی افتراء اور بہتان یا کسی کمزور ذریعے (SOURCE) کی بات نہیں تھی۔

ناقابلِ انکار حقیقت

بہرحال یہ بات پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ سامنے آجانی چاہیئے کہ حضرت حسینؓ نے کربلا میں یہ دیکھ کر کہ حالات کا رُخ اُس خیال اور گمان کے بالکل برعکس ہے جس گمان اور اطمینان کے ساتھ کوفے کی طرف سفر شروع کیا گیا تھا، ابن زیاد کے نائب عمر بن سعد کو وہ پیش کش کی جو حضرت محمد الباقر کی روایت میں بیان ہوئی ہے۔ اور جس کی تائید واقعۂ کربلا سے متعلق چند در چند روایات میں صراحتہً یا اشارۃً پائی جاتی ہے۔ یہ حضرت حسینؓ کے ورودِ کربلا کے ساتھ جڑی ہوئی ایسی حقیقت ہے کہ جب تک آپ کے ورودِ کربلا اور عمر بن سعد کے وہاں آنے سے انکار نہ کر دیا جائے اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا ہے، جسٹس امیر علی جیسے شیعہ مصنفین جن کے یہاں شیعیت تو قدرتی طور سے پائی جاتی ہے۔ مگر علمی خیانت کے بظاہر قائل نہیں ہیں، انھوں نے بھی واقعۂ کربلا کے سلسلے میں نہ صرف اس سہ گانہ پیش کش کی بات پوری صراحت سے درج کی ہے بلکہ ایک روایت (صرف ایک روایت) جو اس کی تردید میں پائی جاتی ہے اسکو رد بھی کر دیا ہے۔ اپنی مشہور کتاب "اسپرٹ آف اسلام" (SPIRIT OF ISLAM)

میں واقعۂ کربلا کے ذکر میں حضرت حسین کی سہ گانہ پیش کش بیان کر کے موصوف نے اس پر حاشیہ دیا ہے جو کتاب کے اردو ترجمے میں بایں الفاظ درج ہوا ہے:-

"صاحب روضتہ الصفا یہ شرائط بیان کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ خدام حسین میں سے ایک شخص نے جو مقتل کربلا سے اتفاقاً بچ نکلا، اس دعوے کو غلط بتایا کہ امام حسین نے اموی سردار کے سامنے کسی قسم کی شرائطِ صلح پیش کیں، ممکن ہے[1] کہ اس خادم نے یہ انکار بہ ظاہر کرنے کی خاطر کیا ہو کہ امام حسین نے صلح کی تجویز کر کے اپنے آپ کو دشمن کے سامنے ذلیل نہیں کیا۔ لیکن میرے نزدیک صلح کی تجویز سے حضرت حسین کی سیرِ عالیہ کی کسی طرح کسرِ شان نہیں ہوتی۔[2]"

---

[1] یہاں سے جسٹس امیر علی کا تبصرہ شروع ہوا ہے۔

[2] روحِ اسلام ترجمہ "اسپرٹ آف اسلام" از محمد ہادی حسین ۔ اسلامک بک سینٹر دہلی صفحہ ۴۵۸

باب یازدہم [11]

شہادت کے بعد کی کہانی

شہادت تک کے مرحلے میں جس طرح کی بے سروپا کہانیاں اللہ ہی جانتا ہے کہ بنانے والوں نے کن کن مقاصد کے لیے بنائیں اور ہمارے اہلِ تاریخ نے شائع کیں، ان کہانیوں کا سلسلہ شہادت کے المناک مناظر پیش کرنے پر ختم نہیں ہو گیا (جنھیں پیش کرنے کی ہمت ہم اپنے اندر نہیں پا سکے کیونکہ ایک جھوٹ سے خواہ مخواہ دل زخمی کیا جائے) بلکہ ان سے بھی بدتر قسم کے مناظر دکھانے والی کہانیاں ہم اپنی انہی تاریخی کتابوں میں مابعد شہادت کے سلسلے میں پاتے ہیں[1]۔

خواتین کی بے حرمتی

شہادت اور اس کے ذیل کے دلدوز مناظر جس روایت کے اندر آتے ہیں اُس کا خاتمہ خواتین اہلِ بیت کی بیحرمتی پر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ حضرت حسینؓ کا سر تن سے جدا کرنے اور آپ کے جسم کی پوشش، کپڑے، جوتے، ٹوپی کھسوٹ لینے کے بعد یہ لوگ خواتین اور خیمے کے مال واسباب پر ٹوٹے، حدیہ تھی کہ سروں سے اوڑھنیاں اور چادریں تک کھینچ لی گئیں[2]۔ اس کے بعد کی روایت کہتی ہے کہ اس مرحلے پر عمر بن سعد

---

[1] طبری اور ابن اثیر کا تو ایک ہی حال ہے، البتہ کہیں کہیں ابن کثیر نے تھوڑی سی احتیاط برتی ہے [2] طبری ج ۶ صفحہ ۲۶۰

پہنچے اور اعلان کیا کہ کوئی شخص ان عورتوں کے خیمے میں نہ جائے اور ان کے سامان سے کسی نے کچھ لیا ہو تو واپس کرے۔ مگر کسی نے کچھ واپس نہیں کیا۔[1]

لاش کی بے حرمتی

پھر یہی روایت بتاتی ہے عمر بن سعد نے یہ شریفانہ حکم جاری کرنے کے بعد دوسرا اس کے مقابل میں حکم یہ جاری کیا کہ

"ہاں کون ہے جو اپنے گھوڑے کے ذریعے حسینؓ کی لاش کو روندے؟ چنانچہ دس ہمت والے نکل کے آئے اور انھوں نے "یہ کارِ خیر" بھر پور طریقے سے انجام دیا۔"[2]

سر کی بے حرمتی اور باقیات قافلہ سے بدسلوکی

اسی روایت کے مطابق آپ کا سر فوراً کوفے کو روانہ کیا گیا اور دوسرے دن قافلے کی خواتین اور باقی ماندہ بچوں کو ساتھ لے کر عمر بن سعد اور اس کی فوج نے کربلا سے کوچ کیا، آگے کی ایک روایت کے مطابق (جس کا راوی حُمید بن مسلم ہے) حضرت حسینؓ کا سر اور آپ کے اہلِ بیت جب ابن زیاد کے یہاں پہنچائے گئے تو اس نے سر کی بھی بے حرمتی اپنی چھڑی اور زبان سے کی اور اہلِ بیت کے زخمی دلوں پر بھی خوب خوب نمک چھڑکا۔[3] اور پھر اس کے آگے آنے والی روایت کے مطابق حضرت علی بن الحسینؓ (حضرت زین العابدین) جو کربلا میں بیمار صاحبِ فراش ہونے کی وجہ سے "میدانِ جنگ" میں نہ نکل سکے تھے (اور بعد ازاں خود حُمید بن مسلم کی "عنایت" سے بچ گئے تھے) کو باقیاتِ قافلہ میں دیکھنا ابن زیاد کو اس قدر ناگوار ہوا کہ اس نے اُن کا ستر کھلوا کر بالغ اور نابالغ ہونے کی جانچ کرائی اور نتیجے میں بالغ پاکر قتل کا حکم دیا۔ مگر پھر (مختلف روایتوں کے مطابق مختلف وجوہ سے) اُن کی

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۶۰ [2] ایضاً ص ۲۶۱ [3] ایضاً ص ۲۶۳-۲۶۲

جان بخشی کر دی [1]

تنقید کی ایک نظر

پچھلے باب میں ہم نے کہا ہے کہ اس واقعہ کی روایتوں میں روایت اور درایت کے اصولوں کے اعتبار سے اس قدر ناقابل قبول اور ناقابل قیاس باتیں بھری ہوئی ہیں کہ کسی بھی روایت کو، خاص کر جس سے کسی پر کوئی الزام آتا ہو، قبول کرنا اور مان لینا ایک بڑا مشکل اور بھاری ذمّہ داری کا کام ہے، کیونکہ شبہ کا فائدہ ملزم کو دیا جانا ہر مہذب قانون کا ضابطہ ہے۔ شریعتِ اسلامی کا ضابطہ بھی یہی ہے۔ یہ سب روایتیں جن کا اختصار اوپر کے صفحات میں بیان ہوا اسی الزامی نوعیت کی ہیں۔ تاہم جہاں تک ابن زیاد کا سوال ہے اُسکے متعلق یہ ماننا از روئے قیاس کچھ بہت مشکل نظر نہیں آتا کہ حضرت حسینؓ کا سر اس کے سامنے رکھا گیا ہو تو اس نے آپ کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے چھڑی سے آپ کے دانتوں اور سر کو ٹھوکا دیا ہو۔ لیکن آفت رسیدہ خواتین کے ساتھ جس قسم کی نمک پاشی کی باتیں اُس سے منسوب کی گئی ہیں، اُن کے لیے جب تک کوئی نہایت مضبوط شہادت نہ ہو کوئی جواز یقین کر لینے کا نظر نہیں آتا۔

حضرت حسینؓ کے دانتوں کو چھڑی لگانا یوں بعید از قیاس نہیں ہے کہ ابن زیاد کو بظاہر حضرت حسینؓ کا کوئی ایسا احترام نہیں تھا جیسے احترام کے تخیل سے ہمیں یہ بات بے حد قبیح معلوم ہوتی ہے۔ اُسے اگر کوئی احترام ہوتا تو کربلا کا سانحہ ہی کیوں پیش آتا، لیکن خواتین کی بات بہت مختلف ہے۔ حضرت حسینؓ کے لیے بے احترامی کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ (ابن زیاد) جس حکومت کا عہدہ دار بلکہ پشتینی نمک خوار تھا حضرت حسینؓ اس کو چیلنج کرنے کیلئے نکلے تھے، خواتین بےچاری محض تابع تھیں اور انھوں نے کوئی عمل یزید کی حکومت کو

---

[1] طبری ج ۶ صـ ۲۶۳

چیلنج کرنے کا نہیں کیا تھا۔[1] اس لیے قرینِ قیاس نہیں ہے کہ وہ خواتین کے ساتھ، خاص طور سے اُن کی غمزدگی میں، ایسے طور سے پیش آیا ہو جسے کوئی بھی ماحول پسند نہیں کر سکتا ــــــ ایسی خلافِ قیاس بات کا الزام کسی کو دینے کے لیے بہت ٹھوس شہادت چاہیے۔ اور یہاں شہادت کس کی ہے؟ حُمید بن مسلم کی۔ ایسا جھوٹا اور لپاٹیا راوی، جس کے جھوٹ اور افسانہ تراشی کی شہادت خود طبری کے اندر کی اس کی روایتوں میں موجود ہے۔ حتیٰ کہ انہی روایتوں میں (بشمول زیرِ بحث روایت) موجود ہے[2] جو اوپر کے صفحات میں پیش کی گئیں۔ آیئے ایک نظر ڈالیے۔

حُمید بن مسلم کے تضادات

اس روایت کو، (جو کہ زیرِ بحث ہے) شروع کرتے ہوئے حُمید بن مسلم کہتا ہے کہ کربلا سے اُسے عمر بن سعد نے اپنے گھر روانہ کیا تاکہ اس کی خیر و عافیت کی خبر اور "فتح" کی خوشخبری پہنچا دے۔ اور یہ کام کر کے وہ ابن زیاد کی طرف گیا تو وہاں دیکھا کہ سرِ حسینؓ رکھا ہوا ہے اور قافلۂ حسینی کے باقیماندہ افراد بھی پہنچے ہوئے ہیں۔ بس اس کے آگے وہ خواتین اور اہلِ بیت کے زخموں پر ابن زیاد کی نمک پاشی کا قصّہ سناتا ہے۔ جبکہ یہی شخص ایک صفحہ پہلے (ص۲۶۱) کی روایت میں یہ بیان دے رہا ہے کہ عمر بن سعد نے اس کو اور فلاں دوسرے شخص کو حضرت حسین کا سر ابن زیاد کے پاس پہنچانے کے لیے بھیجا۔ یعنی اس کی ایک روایت کے مطابق سر پہنچانے والا یہ خود تھا اور دوسری روایت کے مطابق کسی دوسرے شخص نے یہ کام کیا۔

---

[1] شیعہ حضرات کی کتابوں میں ان خواتین کی طرف جو باغیانہ تقریریں کوفے میں ان کے داخلے کے موقع پر منسوب کی گئی ہیں۔ ذرا سے غور سے بھی آدمی اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ سب تصنیف ہے۔ ورنہ جب وہ انہی لوگوں کے بقول قیدیوں کی طرح لے جائے جا رہی تھیں تو کون انھیں راستے میں کھڑے ہو ہو کر باغیانہ تقریریں کرنے دیتا۔ [2] پچھلے باب میں اس کے کردار پر کافی روشنی پڑ چکی ہے۔

بہر حال یہ شخص ایک "حاضر و ناظر" قسم کا راوی ہے، ہر جگہ موجود ملتا ہے۔ اور متضاد قسم کی باتوں پر یقین کی دعوت دیتا ہے۔ اس کی شہادت پر کیسے کسی کو ملزم ٹھیرایا جا سکتا ہے؟ افسوس ہوتا ہے کہ آخر طبری نے اس کے ایسے بیانات کیونکر بلا کسی تنقید اور تبصرے کے جمع کر دیئے ہیں جو خواہ مخواہ تشویش ذہن اور ضیاعِ وقت کا باعث ہوں!

رہی وہ روایت کہ حضرت زین العابدین کا ستر کھول کر ان کے بلوغ اور عدم بلوغ کا امتحان کیا گیا۔ تو اس مذاق کے لیے کیا کہا جائے! اس راوی کو اتنا بھی پتہ نہ تھا کہ حضرت زین العابدین ۲۲ سال کی عمر کے شادی شدہ اور ایک بچے حضرت محمد الباقر کے باپ تھے۔ اور بچہ بھی قافلے میں موجود تھا۔[1]

---

[1] شیعہ مآخذ میں تو ابن زیاد کے بارے میں اس موقع کی وہ روایتیں ہیں کہ اللہ کی پناہ اور وہ کسی حد تک سنیوں میں بھی پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کی بابت تفصیل میں ہمیں نہیں جانا۔ البتہ ایک روایت کا ذکر یہاں کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ ابن زیاد کے ساتھ بھی ہم کوئی بے انصافی کا معاملہ نہ کریں بلکہ حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ یہ روایت طبری ہی میں ہے اور بتاتی ہے کہ :-

نجئی برأس الحسین الٰی ابن	پس حسینؓ کا سر ابن زیاد کے پاس لایا گیا اور
زیاد فوضع بین یدیہ نجعل	سامنے رکھا گیا اس پر وہ اپنی چھڑی سے اشارہ
یقول بقضیبہ ویقول ان	کرنے اور کہنے لگا کہ اچھا ابو عبداللہ کے
ابا عبد اللہ قد کان شمط قال	بال تو کھچڑی ہو گئے تھے اور ان کی بیویاں
وجیئ بنسائہ وبناتہ واھلہ	بیٹیاں اور دیگر اہل خانہ بھی لائے گئے
وکان احسن شئی صنعہ أن	ان کے معاملے میں ابن زیاد نے سب سے اچھی
امر لھم بمنزل فی مکان معتزل	بات یہ کی تھی کہ ان کے قیام کے لیے ایک
واجریٰ علیھم رزقاً وامر لھم	ذرا الگ تھلگ جگہ پر انتظام کیا تھا وہیں
بنفقۃ وکسوۃ قال فانطلق	ان کا کھانا جاتا تھا" اور (بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

اس کے بعد پیچھے کی طرف چلیئے۔ حضرت حسینؓ کے جسد خاکی کو گھوڑوں سے روندوانے کی روایت اُن روایتوں میں سر فہرست رکھے جانے کی مستحق ہے جن کی وجہ سے روایتوں کا یہ سارا کارخانہ جعل و فریب پر مبنی نظر آتا ہے۔ اس کا راوی بھی وہی مُسلم بن حُمید ہے، اسی روایت میں حُمید کا وہ بیان بھی آتا ہے جس میں اس نے بتایا ہے کہ مجھے عمر بن سعد نے حضرت حسینؓ کا سر لے کر ابن زیاد کے پاس روانہ کیا تھا، اور آپ ابھی معلوم کر چکے ہیں کہ اسی شخص کی دوسری روایت اس بیان کی تردید کرتی ہے۔ علاوہ ازیں اس روایت میں جھوٹ کی بہ منہ بولتی علامت بھی موجود ہے کہ حضرت حسینؓ کے ساتھیوں میں سے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

غلامان منهم لعبد الله بن جعفر وابن جعفر فأتيا رجلاً من طئ فلجأ إليه فضرب أعناقهما وجاء برؤسهما حتى وضعهما بين يدى ابن زياد، قال فهمّ بضرب عنقه وامر بداره فهدمت۔

دوسری ضروریات اور اخراجات فراہم کرنے کے بھی احکام دیئے تھے، اسی دوران میں ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ ان میں سے عبداللہ بن جعفر کے دو بیٹے یا پوتے نکل کر بنو طے کے ایک آدمی کے یہاں پہنچ گئے اور اس سے پناہ چاہی تو اس (ظالم) نے ان کی گردنیں ماردیں اور سر لے کر ابن زیاد کے پاس آیا۔ راوی کہتا ہے کہ ابن زیاد نے (غصے میں) اس کے قتل کا ارادہ کیا اور (پھر فیصلہ بدل کر) اس کا گھر ڈھا دینے کا حکم دیا اور وہ ڈھا دیا گیا۔

اس روایت میں اور سب باتیں خود سمجھ لینے کی ہیں مگر ایک نقطہ عام قارئین کے اعتبار سے وضاحت طلب ہے کہ اہل عرب کے یہاں کنیت سے کسی کا ذکر یا اس کو خطاب از راہ تعظیم ہوتا ہے اس روایت کے مطابق ابن زیاد نے حضرت حسین کا ذکر آپ کی کنیت ابو عبداللہ سے کیا ہے اور چھڑی سے کہیں ٹھوکا نہیں دیا ہے، بلکہ اشارہ کیا ہے جو ابن زیاد کے رویئے کو کافی مختلف شکل دینے والی بات ہے اور کم سے کم خواتین کے ساتھ سلوک کے سلسلہ میں تو ہم اس روایت کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

شہداء کی تعداد بہتر [۷۲] بتاتا ہے جو محض ایک شہرت ہے واقعہ نہیں۔ جناب علی نقی صاحب لکھنوی بھی لکھتے ہیں کہ:-

"ایک تاریخی صراحت کے مطابق یہ بتیس [۳۲] سوار اور چالیس پیادوں سے زیادہ نہیں تھے اور اسی لیے شہدائے کربلا کے لیے بہتر [۷۲] کا لفظ زبان زدِ خلائق ہے مگر کربلا کے حالات جنگ اور مجاہدین کے ناموں کی تفصیل اور دوسرے متعلقہ واقعات سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ تعداد سو [۱۰۰] سے زیادہ اور دو سو [۲۰۰] سے کم تھی۔"[۱]

اگر یہ شخص (حُمید بن مسلم) واقعی کربلا میں موجود ہوتا یا جو روایتیں اس کے نام سے آتی ہیں وہ واقعی کسی بھی ایسے شخص کی ہوتیں جو کربلا میں موجود تھا تو یہ بہتر [۷۲] کی خلافِ واقعہ تعداد اس نے نہ بتائی ہوتی ـــ اور یہی وہ روایت ہے جو خواتین کے سروں سے چادریں تک کھینچ لینے کا قصہ سناتی ہیں، پس خود ہی سمجھ لینا چاہیے کہ یہ کس قسم کی روایت ہے اور اس میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں اُن کی کیا حیثیت ہے؟

قصرِ یزید میں

بیان میں کہا گیا ہے کہ کوفے سے حضرت حسینؓ کا سر امیر یزید کے پاس دمشق بھیجا گیا۔ علیٰ ہذا قافلۂ حسینی کے باقیماندہ افراد خواتین اور بچے بھی وہیں پہنچائے گئے۔ اس بارے میں جو روایتیں مشہور ہیں وہ تو یہ ہیں کہ یزید نے بھی سر کے ساتھ ٹھوکا دینے کی گستاخی کی اور لقیۃ السیف اہلِ خانہ کے ساتھ بھی رنج پہنچانے والی باتیں کیں۔ بلکہ شیعہ روایات کے مطابق تو اہلِ خانہ کا قافلہ کوفے سے دمشق تک لایا ہی گیا غیر مسلم قیدیوں کی طرح نہایت ذلت اور تشہیر کے ساتھ تھا۔ اور پھر گھنٹوں محل کے دروازے پر کھڑا رکھا گیا وغیرہ وغیرہ خرافات، جن میں امویوں کے ہاتھوں خاندانِ نبوت کی وہ تذلیل دکھا کر جو مسلمانوں نے کبھی غیر مسلموں کے ساتھ بھی روا نہیں رکھی،

---

[۱] شہیدِ انسانیت ص ۱۷۰-۳۷۰

بلکہ ان اہلبیت کی خود اپنے ہاتھوں بھی اپنی تذلیل اور تشہیر (انکی "تقریروں" وغیرہ کی شکل میں) دکھا کر در اصل شیعہ مذہب کے تمام عقائد اور اعمال و رسوم کی سند اور اصل اہلبیت ہی سے فراہم کرنے کا وہ فنکارانہ انتظام کیا گیا ہے کہ ایک فن کے اعتبار سے بے اختیار داد دینے کا جی چاہتا ہے۔ لیکن جسکو اصلیت اور واقعیت سے دلچسپی ہے، اُسکے لیے اسی طبری میں، جس میں خود کافی لغویات موجود ہیں، ان تمام خانہ ساز لغویات کی تردید کا سامان بھی موجود ہے۔

وہ ایک روایت جو دسویں باب میں گذری ہے کہ ابن زیاد نے جو آدمی حضرت حسینؓ کا سر لیکر دمشق بھیجا تھا اور اُس نے کربلا کی یہ کہانی سنائی تھی کہ حسینؓ اور اُنکے ساتھی ہمارے سامنے ایسے بھاگے جیسے شکروں کے سامنے کبوتر۔ حتی کہ ذرا سی دیر میں اُنکا کام کردیا گیا۔ اس میں آگے مزید یہ الفاظ بھی تھے "پس اب وہاں اُن کے جسم ہیں بے لباس کپڑے ہیں خون آلو چہرے خاک آلود.....الخ" وہی روایت اس کے بعد بتاتی ہے:

فدمعت عین یزید وقال قد کنت	یہ سنکر یزید کی آنکھیں بھر آئیں اور کہا (ارے یہ
ارضیٰ بطاعتکم بدون قتل	کیا کیا) میں تو قتل حسینؓ کے بغیر بھی تم سے راضی
الحسین لعن اللہ ابن سُمیّہ اما	رہتا "اللہ ابن سُمیہ[1] کو غارت کرے، بخدا ئے پاک
واللہ لو انی صاحبہ فعفوت عنہ	میں اگر اُسکی جگہ ہوتا تو حسینؓ سے درگزر ہی
فرحم اللہ الحسین ولم یصلہ	کرتا۔ اللہ حسینؓ پر رحمت کرے" اور پھر
بشئ ۔	اُس آدمی کو کوئی انعام و صلہ نہ دیا (جس کا وہ متوقع تھا)

اس کے بعد راوی مزید بیان اس بارے میں دیتا ہے کہ ابن زیاد نے حضرت حسینؓ کے اہل خانہ کو بھی دو آدمیوں کی تحویل میں امیر یزید کے پاس ارسال کیا تھا۔ ان دو میں سے ایک کا نام مُحَفِّز بن ثعلبہ تھا۔ اس مُحَفِّز نے محل کے دروازے پر آکر آواز لگائی:

ھٰذا مُحَفِّز بن ثعلبہ اتیٰ	یہ مُحَفِّز بن ثعلبہ ہے جو "ایسو ل

[1] ابن سمیہ تو ابن زیاد کے باپ زیاد کو کہا جاتا ہے "واللہ اعلم" یہاں ابن زیاد کے لیے کیونکر استعمال ہوا۔

باللئام الفجرۃ ۔ ‏ اليسوعؑ[1] کو (معاذ اللہ) لے کر آیا ہے ۔

یزید نے اس کے جواب میں کہا کہ :-

ماولدت ام محفز شرا والأم (منہ[2]) ‏ محفز کی ماں نے اس سے زیادہ برا اور اس سے زیادہ لئیم نہیں جنا ۔

ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ روایت ضرور صحیح ہے لیکن یہ ضرور کہا جائے گا کہ اس روایت کی موجودگی اُن روایتوں کو مشکوک ضرور بنا دیتی ہے جن میں یزید کے اس رویّے کے برعکس رویّہ دکھایا گیا ہے۔ اور مزید یہ بھی کہا جائیگا کہ جو مزاج، جو طبیعت اور جو خاندانی ماحول یزید کیلئے فی الوقت ثابت ہے (نہ کہ خانہ ساز گپیں) اور حضرت حسینؓ کے لیے اسکے جن رویّے اور جن احساسات کی مضبوط شہادت کربلا کے واقعۂ شہادت سے کچھ پہلے تک کیلئے پائی جاتی ہے جن کا کچھ بیان اس کتاب کے بعض گزشتہ ابواب میں بھی ہوا ہے ، یہ ثبوت اور یہ شہادتیں بہرحال اپنا وزن اِس روایت کے اور اس جیسی روایتوں کے پلڑے میں ڈالتی ہیں ۔

حضرت محمد الباقرؒ کی روایت اور یہ قصّے ؟

ہم نے حضرت محمد الباقرؒ کی روایت کا بار بار حوالہ گزشتہ صفحات میں دیا ہے اور بقدر ضرورت شہادت تک کا حصّہ نقل بھی کیا ہے ۔ اس حصّے کے بعد اس روایت میں بھی بعدِ شہادت والا قصّہ ابن زیاد اور یزید سے متعلق آتا ہے، ضروری ہے کہ اس گفتگو میں اسکو بھی سامنے لایا جائے ۔

اس روایت کو ہم نے شہادت حضرت حسینؓ تک نقل کیا تھا اس کے آگے اس روایت میں ہے کہ آپکو قبیلۂ مذحج کے ایک آدمی نے قتل کیا تھا پھر اس نے سر کو تن سے جدا کیا اور

---

[1] بہت بُرے الفاظ تھے اس لیے ترجمہ نہیں کیا گیا ہے۔ عربی الفاظ میں لئام لئیم کی جمع ہے اور فجرہ فاجر کی ۔

[2] طبری ج ۶ صفحہ ۲۶۴ " طبری میں " شرو والأم " ہے جو بداہتہً غلط ہے " شرا و الأم منہ " ہونا چاہیے ابن اثیر میں یوں آیا ہے " الأم واحمق منہ " ج ۳ صفحہ ۲۹۸ ۔

لے کر عبید اللہ بن زیاد کے پاس آیا اور انعام کا طالب ہوا۔ ابن زیاد نے یزید کے پاس روانہ کر دیا۔ یزید کے سامنے لا کر رکھا گیا تو وہ آپ کے مُنہ پر چھڑی سے ٹھوکے دیتے ہوئے ایک "شعر" پڑھنے لگا (جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ حسین نے از راہِ حق ناشناسی و حق تلفی ہمارے خلاف صف آرائی کی) حضرت ابو برزہ اسلمیؓ صحابی موجود تھے انہوں نے ٹوکا کہ چھڑی ہٹالو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بارہا دیکھا ہے کہ انکے مُنہ پر مُنہ رکھے ہوئے چوم رہے ہیں۔ بعد میں حضرت حسینؓ کے اہلِ خانہ بھی کوفے سے دمشق ہی پہنچا دیئے گئے۔ اس موقع پر یزید نے اپنے خواص اہلِ شام کو جمع کیا جن میں سے ایک نے خانوادۂ حسینی کی ایک صاحبزادی پر نظر ڈال کر یزید سے کہا کہ امیر المومنین یہ لڑکی مجھے بخش دیجئے۔ حضرت زینبؓ نے آڑے آکر کہا کہ ایسی بات کوئی شخص دینِ حق سے باہر ہو کر ہی کہہ سکتا ہے، اس نے اپنی بات پھر دہرائی تو یزید نے کہا کہ باز آجاؤ (کُفَّ عن هٰذا) اور پھر ان لوگوں کو اپنے گھر میں بھیج دیا۔ بعد ازاں اُنکے لیے سامانِ رخصت مہیا کر کے انکو مدینے روانہ کیا[1]

گویا اس روایت کا بیان بھی ایک معاملے میں انہی روایتوں کی طرح ہے جن کے مقابلے میں ہم نے ابھی اس سے اوپر کی ذکر کردہ روایت (بحوالہ طبری صفحہ ۲۶۴) کو قابلِ ترجیح قرار دیا۔ یعنی اسمیں بھی منہ پر چھڑی لگانے والی بات آئی ہے۔ سو اس سلسلے میں پہلی بات تو ہمارے نزدیک قابلِ توجہ یہ ہے کہ یزید سے ہم حضرت حسینؓ کیلئے اُس احترام کی توقع نہیں کر سکتے جو ہمارے نزدیک ضروری ہے اسلیے بالکل ممکن ہے کہ چھڑی سے اشارہ کرتے ہوئے کچھ شکایت کا واقعہ پیش آیا ہو۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ روایت کے اس حصے میں کھلے طور پر الحاق کی نشانیاں موجود ہیں۔ اور وہ یہ ہیں:-

۱۔ یہ روایت کہتی ہے کہ قاتل نے سر کو تن سے جُدا کیا اور سیدھا لیکر ابن زیاد کے پاس پہنچ گیا۔ حالانکہ اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا کہ بغیر سالارِ لشکر ابن سعد کے بھیجے ہوئے کوئی شخص یہ کام بالا ہی بالا خود کر ڈالتا۔

۲۔ یہ دو شعر بھی روایت میں اسی شخص کی زبان سے ابن زیاد کے سامنے کہلوائے گئے ہیں

---

[1] طبری ج ۶ صفحہ ۲۱۰-۲۲۰

جن کا ترجمہ ہے:

"حضور والا میری سواری کو سونے اور چاندی سے لاد دیجئے۔ اس لیے کہ میں نے ایک شاہِ ذی شان کو قتل کیا ہے۔

میں نے اس کو قتل کیا ہے جو اپنے نسب اور ماں باپ کے اعتبار سے سب سے اچھا ہے"

لیکن یہی دو شعر پڑھتا ہوا قاتل ہمیں ایک دوسری روایت میں کربلا کے میدان میں عمر بن سعد کے خیمے پر بھی دکھایا گیا ہے۔ اور پھر اس میں یہ بھی ہے کہ عمر بن سعد نے سنا تو کہا کہ:

" واللہ تو ازلی مجنون ہے۔ لاؤ اس کو اندر لاؤ۔ چنانچہ اندر لایا گیا تو چھڑی سے اس کی پٹائی کی۔ اور کہا 'ارے او پاگل تو ایسی باتیں مُنہ سے نکال رہا ہے؟ ابن زیاد نے اگر سن لیا تو تیری گردن مار دے گا۔"[1]

عمر بن سعد کے خیمے پر بھی فی الواقع یہ شعر پڑھے گئے تھے یا نہیں؟ یہ الگ بات ہے لیکن بہ نسبت اسکے کہ قاتل سر الگ کر کے بالا ہی بالا ابن زیاد کے پاس لے گیا ہو اور وہاں ان اشعار کی صدا لگائی ہو، یہ بات زیادہ سمجھ میں آنیوالی ہے کہ وہ یہ "کارنامہ" کر کے عمر بن سعد سالار لشکر کے خیمے پر آیا ہو اور داد و انعام کا طالب ہوا ہو۔

بہرحال کچھ بھی ہو۔ ایک روایت کے مطابق یہ شعر قاتل نے میدان کربلا میں ابن سعد کے خیمے پر پڑھے تھے۔ اب اگر بعد میں یہی قصّہ کوئی ابن زیاد سے متعلق کر کے سناتا ہے تو صاف طور سے یہ کسی گڑبڑ کا شاخسانہ ہے اور وہ بھی بہت اُوٹ پٹانگ قسم کی گڑبڑ، اور پھر اس کھُلی گڑبڑ کے نتیجے میں بالکل قرینِ قیاس نظر آتا ہے کہ یزید کی طرف "چھڑی سے ٹھوکا دینے" کی نسبت بھی اسی نوعیت کی چیز ہو، یعنی یہ کہ واقعہ تو ابن زیاد کا تھا۔ جیسا کہ اور روایتوں میں آچکا ہے۔ مگر حافظہ کی گڑبڑ یا ارادے کی گڑبڑ سے کسی راوی نے یزید کے سر لگا دیا۔
اور یاد رہے کہ ابن زیاد کے بارے میں بھی ہم اپنی رائے کا اظہار کر چکے ہیں کہ ایسے واقعہ کا

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۶۱

ہونا بعید از قیاس اگرچہ ہرگز نہیں ہے، البتہ جب ایک روایت "ٹھوکا دینے" کے بجائے "اشارہ کرنے" کی موجود ہے تو کم از کم شک کا فائدہ ابن زیاد کو پہنچنے سے ہم نہیں روک سکتے۔ خواہ وہ قتل حسینؓ کی اصل ذمہ داری کے لحاظ سے ہمیں کتنا ہی مبغوض ہو۔

خواتین خانوادۂ نبوت کے ساتھ اور صاحبزادہ علی بن الحسینؓ کے ساتھ رنج رسانی اور سخت کلامی وغیرہ کی روایتیں جو طبری میں بھی آتی ہیں اور دوسری کتابوں میں بھی ہیں، ان سب کے بارے میں ہم اپنے آپکو یہی کہنے کے لیے مجبور پاتے ہیں کہ جب اِن روایتوں سے بالکل مختلف صورت بتانے والی روایتیں بھی موجود ہیں، جو ابھی ہمارے سامنے گذریں تو کوئی جواز نہیں کہ برائی اور بدسلوکی کا معاملہ دکھانے والی روایتیں قبول کرلی جائیں اور یہ تو مانا ہی ہوا ہے کہ یزید نے اس قافلے کو بہت دے دلاکر نہایت احترام کے ساتھ ایسے لوگوں کی معیت میں مدینے روانہ کیا تھا، جن کے احترام اور حفظ مرتبت کے رویہ سے اہل قافلہ نہایت خوشنود اور شکر گزار ہوئے[1]۔ اور پھر مدت العمر اس خاندان کے ساتھ غیر معمولی مراعات اور حسن سلوک کا رویہ رہا جس کی تفصیلات میں جانے کی شاید ضرورت نہیں، اور پھر ایسا ہی رویہ اس خانوادۂ نبوت کا بھی بنو امیہ کے ساتھ رہا۔ مگر اسکو کیا کیا جائے کہ ان سارے حقائق کے باوجود من گھڑت روایتوں کے پروپیگنڈے سے بنائی ہوئی جذباتی فضا میں لوگ ہمیں یہاں تک یقین ماننے پر لے آئے ہیں کہ کوفے سے جب شہدائے کربلا کے سر اور بقیۃ السیف افراد کا قافلہ دمشق کے حدود میں داخل ہوا اور یزید کی "منتظر نظریں" اپنے محل کی بلندی سے اس پر پڑیں تو اس نے "وجد میں آکر یہ دو" کافرانہ شعر پڑھے۔

لمّا بدت تلک الحمول و اشرفت	تلک الرؤس علیٰ ربی جیرون
نعق الغراب فقلت نح او لا تنح	فلقد قضیت من النبی دیونی

ترجمہ: جب جیرون کے ٹیلوں پر کجاوے ابھرے اور وہ سر نظر آئے تو کوّے نے کائیں کائیں شروع کی،

---

[1] "تاریخ طبری ج ۶ ص ۲۶۶"

میں نے کہا کہ تو لول یا مت لول میں نے تو نبی سے اپنا قرض چکا لیا ہے" (یعنی جنگ بدر کا قرض معاذ اللہ) کاش ہم سمجھ سکتے کہ یہ باتیں غم حسینؓ اور حمایت حسینؓ کے پردے میں کس کافرانہ منصوبے کی تکمیل ہیں۔

امام ابن تیمیہؒ کا ارشاد

اس موقع پر امام ابن تیمیہؒ کی بات قابل ذکر نظر آتی ہے۔ اپنی مشہور کتاب "منہاج السنۃ" میں لکھتے ہیں جس کا ہم یہاں خلاصہ پیش کر رہے ہیں:

"یزید کے سلسلے میں لوگوں کے تین گروہ ہیں، ایک کا اعتقاد ہے کہ یزید صحابی، بلکہ خلفائے راشدین میں سے یا بلکہ انبیائے کرامؑ کے قبیل سے تھا۔ اسکے برعکس ایک دوسرا گروہ کہتا ہے کہ وہ کافر اور بد باطن منافق تھا۔ اسکے دل میں بنو ہاشم اور اہل مدینہ سے اپنے اُن کافر اعزا و اقارب کا بدلہ لینے کا جذبہ تھا جو جنگ بدر وغیرہ میں مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے تھے۔ چنانچہ یہ لوگ کچھ اشعار اس کی دلیل میں اسکی طرف منسوب کرتے ہیں[1] لیکن یہ دونوں قول ایسے غلط اور بے بنیاد ہیں کہ ہر سمجھدار اس کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہے۔ یزید حقیقت میں ایک مسلمان فرمانروا اور بادشاہانہ خلافت والے خلفاء میں سے ایک خلیفہ تھا۔ نہ وہ صحابی یا نبی تھا اور نہ ہی کافر و منافق۔"

حضرت حسینؓ اور یزید کے قضیے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"ایک مجہول السند روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت حسینؓ کا سر یزید کے سامنے لا کر رکھا گیا اور اُس نے آپ کے دندان کو اپنی چھڑی سے ٹھوکا دیا۔ یہ روایت نہ صرف یہ کہ از روئے سند ثابت نہیں ہے بلکہ اس کے مضمون ہی میں اس کے جھوٹ ہونے کا ثبوت ہے، اس میں جن صحابہؓ کی موجودگی اُس وقت یزید کے پاس بتائی گئی ہے (کہ انھوں نے اس کی حرکت پر ٹوکا تھا) وہ شام میں نہیں عراق

---

[1] یہی اشعار ہیں جو ابھی ہم نے نقل کئے۔

میں رہتے تھے۔ اور اس روایت کے برعکس متعدد لوگوں کی روایت ہے کہ یزید نے نہ قتلِ حسینؓ کا حکم دیا نہ اُس کا یہ مقصود تھا۔ بلکہ وہ تو اپنے والد حضرت معاویہؓ کی وصیت کے مطابق آپ کا اعزاز و اکرام ہی پسند کرتا تھا۔ البتہ اس کی خواہش یہ تھی کہ آپ اسکی حکومت کے خلاف اقدام کے ارادے سے باز آئیں۔ اور چونکہ آخر میں یہی ہوا کہ کوفے کے قریب پہنچ کر آپ نے اپنا ارادہ ختم کر دیا اور یزید کے پاس جانے یا کسی سرحد پر نکل جانے کی پیش کش کی۔ اس لیے جب یزید اور اس کے گھر والوں کو آپ کی شہادت کی خبر پہنچی تو ان کے لیے یہ نہایت تکلیف دہ ہوئی۔ یزید نے اس وقت یہاں تک کہا کہ خدا کی لعنت ہو ابن مرجانہ (ابن زیاد) پر، اس کی اگر حضرت حسینؓ سے رشتہ داری ہوتی تو وہ کبھی ایسی حرکت نہ کرتا۔ پھر اس نے آپ کے اہلِ خاندان کیلئے نہایت اچھا واپسی کا سامان کیا اور ان کو مدینے پہنچوایا اور اس سے پہلے یہ پیش کش بھی کی تھی کہ وہ چاہیں تو دمشق ہی میں اُس کے پاس رہیں۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ اس نے حسینؓ کے قاتلوں سے بدلہ نہیں لیا۔

اور یہ جو روایتیں بیان کی جاتی ہیں کہ حضرت حسینؓ کے گھرانے کی خواتین کو قیدی اور باندی بنا کر شہر شہر گھمایا تو اللہ کا شکر ہے کہ مسلمانوں نے کبھی کسی ہاشمی خاتون کو باندی نہیں بنایا۔ عام اُمتِ مسلمہ تو کیا خود بنی اُمیہ میں ہاشمی خواتین کی تعظیم کا یہ حال تھا کہ حجاج بن یوسف نے (جو قریشی نہیں ثقفی تھا) عبداللہ بن جعفر کی بیٹی سے شادی کرلی تھی تو خاندانِ بنو اُمیہ اس قدر برہم ہوا کہ دونوں کی علاحدگی کرائے بغیر نہ رہا۔[1]"

---

[1] انتخاب و تلخیص از منہاج السنۃ ص۲۲۱ تا ۳۲۵

باب دوازدہم

وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا

ایک نوشتۂ تقدیر تھا جو پورا ہوا

کربلا کا یہ حادثۂ فاجعہ، اسے بجز تقدیرِ الٰہی کے اور کیا کہا جائے؟ ـــــ کوئی سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ اہلِ تعلّق اور اہلِ محبت، جن میں وقت کے بزرگ ترین اکابر اہلِ علم و دین بھی ہیں، ایک زبان ہو کر سمجھائیں کہ عراق کا قصد نہ کیجئے۔ یہ غدّار دل اور دھوکہ بازوں کی سرزمین ہے، صبح و شام بدل جانے والوں کی سرزمین ہے، اور اُن آزمائے ہوئے نابکاروں کی سرزمین ہے جنھوں نے آپ کے والد ماجد کو رُلایا اور آپ کے بھائی کو کبھی نہ بھلایا جانے والا تجربہ کرایا۔ مگر یہ ساری فہمائشیں دھری رہ جائیں۔ نہ محمد بن حنفیہ جیسے جاں نثار بھائی کی مؤدّبانہ اور حکیمانہ گذارش کام آئے۔ نہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی بزرگانہ اور محبّانہ فہمائش۔ نہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث کا ہر ہر پہلو سے سمجھانا اور نہ حضرت عبداللہ بن مطیع کا فدویانہ واسطے دینا، نہ حضرت ابوسعید خدری، حضرت واثلہ بن واقد اللیثی، حضرت مسور بن مخرمہ اور حضرت جابر بن عبداللہ کا اپنے اپنے انداز سے فیصلہ بدلوانے کی کوشش کرنا۔ حتّیٰ کہ وہ آخر میں حضرت عبداللہ بن جعفر کا بیچ میں آ کر آخری زور لگا لینا بھی اسی طرح بے کار جائے، جیسے کمان سے نکلے تیر کو واپس لانے کی کوشش بے سود ہوا کرتی ہو!

اور پھر جب وقت آتا ہے کہ آپ (حضرت حسینؓ) سفر کے آخری مرحلے میں اُس مہم سے دستکشی کا فیصلہ فرما لیتے ہیں جس مہم کے لیے سفر اختیار فرمایا گیا تھا تو قضائے الٰہی یہاں بھی آڑے آجاتی ہے اور عبیداللہ بن زیاد جس کو بظاہر بڑی خوشی کے ساتھ آپ کی تین باتوں میں سے یزید کے پاس جانے والی بات تو مان ہی لینی چاہیئے تھی کہ اچھا ہے' وہ جانیں اور یہ جانیں' میں آزمائش سے بچا۔ مگر بالکل خلاف قیاس و گمان ابن زیاد نے آپ کی تینوں باتوں کو یکساں طور پر رد کر دیا۔ اور پہلے کوفے آنے کی وہ شرط لگا دی کہ حادثہ اور المیہ ٹلنے کی شکل بنتے بنتے بگڑ گئی ــــ آخر اسے تقدیر الٰہی کے سوا اور کیا کہا جائے ؟

زُبالہ کی منزل پر جب آپکو اپنے عمزاد اور سفیر مسلم بن عقیل کی کوفے میں گرفتاری اور انجام کی خبر ملی اور وہ ساری بساط اُلٹی ہوئی نظر آئی جس کی بنیاد پر آپ نے سفر شروع کیا تھا۔ تو وہ پہلا وقت تھا کہ آپ کو (غالباً عورتوں اور بچوں کے خیال سے) سفر ترک کر کے واپس ہوجانے کا خیال ہوا۔ اور یہ ایک مناسب وقت تھا۔ کیونکہ کوفہ یہاں سے ابھی کچھ دور تھا۔ اور اُن مخلصین کی فہمائشوں' گزارشوں اور منتوں کے پس منظر میں جو اس سفر سے مانع ہو رہے تھے۔ اور ان تجربات کے پس منظر میں جو حضرت علیؓ اور حضرت حسنؓ کو اہل کوفہ سے پیش آئے تھے' اور سب سے بڑھ کر خود مسلم بن عقیل کے خط کے پس منظر میں جو انھوں نے اپنی گرفتاری پر اہل کوفہ کی بزدلی اور غداری کے حوالے سے حضرت حسینؓ کو اس مقصد سے لکھا تھا کہ وہ سفر ترک کر کے پیچھے کو لوٹ جائیں (ان سب باتوں کے پس منظر میں) کسی کو بھی واپسی کے خیال سے اختلاف نہ ہونا چاہیے تھا مگر جیسے کہ کوئی بات ہو کر رہتی ہو' اور کوئی نہیں خود برادران مسلم بن عقیل اَڑ گئے کہ نہیں اب پیچھے نہیں لوٹا جا سکتا۔ ہم اپنے بھائی کا بدلہ لیں گے یا اپنی جان بھی دیدیں گے' ظاہر بات ہے کہ اس صورت حال میں حضرت حسینؓ کے لیے ممکن نہ تھا کہ واپسی پر اصرار فرمائیں' آپکو واپسی کا خیال ترک کر کے معاملہ اللہ پر چھوڑ دینا پڑا۔ اور گویا پھر تقدیر کا ہاتھ بیچ میں آ گیا۔

اور پھر جب قادسیہ کے قریب پہنچ کر مرحلہ وہ آگیا کہ حالات کی خبروں کی بجائے حالات کی

اپنی ٹھوس شکل وصورت ہی سامنے آجائے اور اس مرحلے پر برادرانِ مسلم بھی غالباً اپنے جذبات کے عالم سے نکل آئے۔ تب واپسی کے خیال پر عمل کرنا تو ممکن نہیں رہا تھا، مگر آپ نے کوفے کی سمت سے بہرحال ہٹ جانے کے لیے ایک غیر معمولی فیصلہ فرمالیا۔ یہ فیصلہ تھا یزید کے پاس دمشق چلے جانے کا!
بلاشبہ یہ ایک غیر معمولی فیصلہ تھا۔ یہ ایک انقلاب لاسکتا تھا۔ روایات میں صراحت ہے کہ آپ نے یہ فیصلہ یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دینے (وضع الید فی الید) کیلئے کیا تھا (اور صراحت نہ بھی ہو تب بھی جن حالات میں آپ یزید کے پاس جارہے تھے، اُن حالات میں آپ کے وہاں جانے کے اور کوئی دوسرے معنیٰ نہیں ہوتے[1]) پس ابن زیاد کو بصد مسرت یہ بات قبول کرنی تھی کہ آپ یزید کے پاس تشریف لے جائیں۔ حضرت حسینؓ از خود یزید کے پاس جانے کا ارادہ فرمارہے ہیں! اس سے زیادہ کسی کو کیا چاہیے؟ زیادہ سے زیادہ اس کا اطمینان کرلیا جاتا کہ آپ واقعی وہیں جائیں گے اور کہیں نہیں چلے جائیں گے۔ اس کیلئے ابن زیاد اپنا ایک دستہ ساتھ میں کرسکتا تھا۔ بلکہ بعض روایات کے مطابق تو آپ نے عمر بن سعد سے فرمایا ہی یہ تھا کہ:

(فان ابیت هٰذا) فسیّرنی الیٰ یزید[2] (اگر دوسری بات منظور نہیں ہے) تو تم مجھے یزید کے پاس بھیجدو۔ (جانے دو نہیں بلکہ بھیجدو)

یزید کے پاس آپ کا اس درجہ لچک کے ساتھ جانا کہ اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدیں اس کا نتیجہ (وقت کے تمام دستیاب قرائن و شواہد کی بنا پر) سوائے اس کے کچھ نہیں ہونا تھا کہ یزید آپ کا اکرام کرے اور ہر ممکن طریقے سے اس بات کی کوشش کرے کہ آپ کی اس کے ساتھ کشیدگی جاتی رہے۔ وہ کیا شکل ہوتی؟ یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ حضرت معاویہؓ کی وصیت کے مطابق انہی کے نقشِ قدم پر "صلح حسنؓ" جیسا کوئی باب یزید اور حضرت حسینؓ کے درمیان بھی ضرور رقم ہوتا۔ مگر قیاس و گمان کے تمام تقاضوں کے

---

[1] بلکہ ان خاص حالات سے قطع نظر بھی اس لیے جو لوگ اس جانے کے کوئی اور معنی کرتے ہیں انھیں بس "شاہ کا شاہ سے بھی زیادہ وفادار" ہی کہا جاسکتا ہے۔ [2] البدایہ والنہایہ ج ۸ صفحہ ۱۷۰

برعکس ابن زیاد کو آپ کی پیش کش قبول نہ ہوئی۔ اور المیۂ کربلا جو کاتبِ تقدیر کے ہاتھ سے رقم ہو چکا تھا وہ وجود میں آکر رہا۔

نوشتۂ تقدیر کا راز ؟

اس تقدیر کا راز اور اس کی حکمت کیا ہو سکتی ہے جو ایک الم گیز واقعہ کے لیے راہ بنا تی آرہی تھی ؟ سوال کافی سخت ہے۔ مگر امام ابن تیمیہؒ کے یہاں اس کا ایک جواب ملتا ہے جو ہے تو قیاس و گمان ہی کی بات مگر امام موصوف نے بڑے اعتماد کے ساتھ پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں :-

"حسینؓ کا قتل بلا شبہ مظلومانہ قتل ہے، جو اُن کے حق میں شہادت، علوِّ منزلت اور رفعِ درجت ہے اور (راز اس کا یہ ہے کہ) اُن کے اور اُن کے بھائی کیلئے اللہ کے یہاں سعادت اور نیک بختی کا وہ بلند مرتبہ طے ہو چکا تھا جس کیلئے کسی نہ کسی طرح کی بلا اور مصیبت سے گزرنا لازم ہے۔ مگر ان دونوں کو اپنے دوسرے اہلبیت کی طرح سے اس کے مواقع اس لیے حاصل نہ ہو سکے تھے کہ ان کی زندگی اسلام اور عزّت و عافیت کی گود ہی میں بسر ہوئی تھی۔ پس ایک بھائی کی وفات زہر خورانی سے ہوئی اور دوسرے کی قتل سے، تاکہ اس مصیبت کے صلے میں وہ شہداء کا عیش اور سُعدا کی منزلت پاسکیں[1]۔"

گویا حضرت حسینؓ کا کچھ نہ سمجھ میں آنے والا سفر ہو یا ابن زیاد کا اس سے بھی زیادہ ناقابلِ فہم رویّہ، دونوں تقدیرِ الٰہی کے ایک منصوبے کا کرشمہ تھے جو پہلے سے طے ہو چکا تھا۔

حضرت حسینؓ کا اقدام اور ابن تیمیہؒ

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ابن تیمیہؒ حضرت حسینؓ کے لیے اس علوِّ منزلت کے

---

[1] منہاج السنۃ ج ۲ ص ۳۲۱

قائل ہونے کے باوجود، جو اُن کے مذکورہ بالا بیان میں نظر آتی ہے، آپ کے اُس اقدام کی صحت کے قائل نہیں ہیں، جس کے نتیجے میں شہادت کا مرتبہ آپ نے پایا۔ فرماتے ہیں کہ :-

"یہ بات جان لینی چاہیے کہ صحابۂ کرام کا طبقہ ہو یا تابعین عظام کا یا بعد کے زمانوں کے اہلِ بیت یا غیر اہلِ بیت کا، ان میں سے بڑے بڑے اہلِ علم و دین سے بعض وقت ایسی نوعیت کا اجتہاد سرزد ہوتا ہے جس میں کچھ ظن و وہم اور کبھی کوئی باریک قسم کی ہوائے نفس شامل ہو جاتی ہے، ایسا اجتہاد اس شخصیت کی عظمت کے باوجود قابلِ اتباع نہیں ہوتا، لیکن جب کبھی ایسی بات پیش آ جاتی ہے تو دو قسم کے انسانوں کے لیے فتنہ بن جاتی ہے، جو لوگ اُس انسان کی عظمت کے قائل ہوتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس کے اس خاص فعل کو بھی صحیح اور قابلِ اتباع قرار دیا جائے ۔ جو اُسے ناپسند کرنے والے ہوتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ایک اجتہادی غلطی کی بدولت اُسے ولایت و تقویٰ کے مرتبے ہی سے نہیں، اہلِ جنت اور اہلِ ایمان کے زمرے سے بھی خارج کر دیں[1] ۔"

کیوں اس اقدام کی صحت کے قائل نہیں ہیں ؟ منہاج السنّۃ کی اسی بحث میں جس بحث سے اوپر کے دو اقتباس لیے گئے ہیں، ہمیں اس سوال کا یہ جواب ملتا ہے :-

"حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت انسانوں کی معاش و معاد (دنیوی اور اخروی زندگی) کی صلاح و فلاح کے لیے ہوئی تھی، آپؐ نے ہر اس بات کا حکم دیا جس میں صلاح (بھلائی) ہے، اور ہر اس بات سے منع فرمایا جس میں فساد (بگاڑ) اور برائی ہے پس ایسا کوئی کام اگر سامنے آتا ہے جس میں صلاح اور فساد دونوں پہلو پائے جاتے ہیں تو اہلِ سنّت یہ دیکھتے ہیں کہ فساد کا پہلو غالب ہے، یا صلاح کا؟ اور پھر جو پہلو غالب نظر آتا ہے اسی کے مطابق اس کام پر حکم لگاتے ہیں، صلاح اور فلاح کا پہلو

---

[1] منہاج السنّۃ ج ۲ ص ۳۱۹

غالب ہے تو اس کام کے کرنے کو ترجیح دیتے ہیں، فساد اور خرابی کا پہلو غالب نظر آتا ہے تو اس کام کے ترک کو ترجیح دی جاتی ہے۔

پس اب ایک یزید یا عبدالملک اور منصور جیسا کوئی شخص خلافت کے منصب پر فائز ہو جاتا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس سے قتال کرکے کسی بہتر شخص کو اُس کی جگہ لانے کی کوشش کی جائے؟ اہلِ سنّت اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں، کیونکہ ایسے فعل سے بہ نسبت بھلائی اور مصلحت کے بگاڑ اور فساد کے زیادہ امکانات ہیں۔ پوری تاریخ ہمیں بتا رہی ہے کہ کسی صاحبِ سلطنت و قوت شخص کے خلاف جب بھی خروج کیا گیا بالعموم اُس کا خیر بہت معمولی اور شر بہت زبردست ہوا۔ مثلاً مدینے والوں نے یزید کے خلاف جو خروج کیا، یا ابن الاشعث نے عبدالملک کے خلاف عراق میں کیا، یا ابن المہلّب نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کی، یا ابومسلم نے خراسان میں اپنی بنو امیہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا، یا خلیفہ منصور کے خلاف مدینے اور بصرے سے بغاوت اٹھی۔ اُن میں ہر جگہ ہزیمت اور بربادی کے سوا کچھ نہ ملا۔ اور ابومسلم خراسانی جیتا بھی تو کیا جیت اُس کی ہوئی؟ منصور کے ہاتھوں وہ خود مارا گیا اور جیت میں کس قدر آدمی اُس نے مروا دیئے! اللہ کی پناہ! الغرض ایسے لوگ

فلا اقاموا دینًا ولا ابقوا دنیًا — نہ دین ہی قائم کر سکے نہ دنیا ہی بچا سکے۔

حالانکہ اللہ تعالیٰ کسی ایسے کام کا حکم نہیں فرماتا کہ جس میں نہ دین کی فلاح ہو نہ دنیا کی صلاح (اور ایسے کام اللہ کو پسند نہیں ہیں) چاہے ان کے کرنے والے کیسے ہی متقی بندے اور اصحابِ جنت کیوں نہ ہوں؟ ذرا بتائیے کیا یہ لوگ (جنکے نام مثلاً اوپر لیے گئے) علیؓ، طلحہؓ، زبیرؓ اور عائشہؓ سے بڑھ کر ہیں، جن کا تقویٰ مسلّم ہوتے اور جنّت کی بشارت جنھیں حاصل ہوتے کے باوجود اُن کے قتالِ باہمی والے فعل کو قابلِ تعریف نہیں قرار دیا گیا؟

مسلمانوں کے اکابر اہلِ علم نے ہمیشہ ہی اِن خروجوں کی مخالفت کی ہے، مثلاً یزید کے خلاف اہلِ مدینہ خروج پر آمادہ ہوئے تو عبداللہ بن عمرؓ، سعید بن مسیّب اور علی بن الحسین (زین العابدین) نے انکو ایسا کرنے سے منع کیا، یا ابن الاشعث کی بغاوت کا فتنہ اُٹھا تو حسن بصری، مجاہد وغیرہ نے سمجھایا، لہٰذا اہلِ سنّت کے یہاں یہ مسئلہ بالکل طے شدہ ہے کہ فتنے کے وقت میں تلوار اٹھانا مناسب نہیں۔ علمائے اہلِ سنّت نے اس مسئلہ کی اس درجہ اہمیت سمجھی ہے کہ اسے عقائد کی فہرست میں داخل کر کے لازم کیا ہے کہ ائمہ اور خلفاء کے جور و ستم کا مقابلہ تلوار کے بجائے صبر اور برداشت سے کیا جائے۔ حالانکہ وہ یہ جانتے ہیں کہ کیسے کیسے اور کتنے اہلِ علم اور اہلِ دین بھی فتنوں کی لڑائیوں میں شریک ہو چکے ہیں۔ اُنکا یہ فیصلہ اسلیے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیثوں سے اس معاملے میں یہی حکم ثابت ہوتا ہے اور جو کوئی بھی اس سلسلے کی احادیث نبویہ پر غور کرے گا وہ خود بھی اس نتیجے پر پہنچے گا کہ احادیث کا حکم بہترین حکم ہے۔

یہی وجہ تھی کہ جب حسینؓ نے عراق جانے کا ارادہ فرمایا تو اکابر اہلِ علم و دین مثلاً ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام نے اس ارادے کے خلاف مشورہ دیا۔ انھیں صاف نظر آرہا تھا کہ اس کا انجام آپ کی جان کو گزند پہنچنے کے سوا مشکل ہی سے کچھ اور ہوگا، چنانچہ جب آپ اپنا ارادہ بدلنے کو تیار نہ ہوئے تو بعض نے کہہ بھی دیا کہ "اچھا جائیے آپ کو اللہ کے سپرد کیا"[1]، اور بعض نے کہا کہ "بات بدنما ہو جائے گی ورنہ جی چاہتا تھا کہ آپ کو زبردستی سے روک لیں"۔

ان حضرات کا یہ کہنا سوائے اس کے اور کسی وجہ سے نہیں تھا کہ حسین رضی اللہ عنہ کی اپنی اور عامۂ مسلمین کی مصلحت اسی میں تھی، اور اللہ و رسول کے یہاں مصالح کی رعایت اور مفاسد سے بچنے ہی کا حکم ہے۔ چنانچہ بالکل وہی ہوا جس کا ان حضرات

---

[1] استودعك الله من قتيل۔

کو اندیشہ تھا کہ دین یا دنیا کی کوئی بھلائی تو اس اقدام سے کسی کو حاصل نہ ہوئی۔ البتہ کوفے کے بدنہاد ظالموں کو سبط رسول اللہ پر قابو مل گیا اور ان کو شہید کر ڈالا۔ کاش وہ اپنے شہر ہی میں رہتے تو وہ فساد نہ لازم آتا جو ان کے خروج اور قتل سے رونما ہوا۔

فان ما قصدہ من تحصیل الخیر ودفع الشر لم یحصل منہ شئ بل زاد الشر بخروجہ وقتلہ ونقص الخیر بذلک وصار سببًا لشرٍ عظیمٍ وکان قتل الحسین مما اوجب الفتن کما کان قتل عثمان مما اوجب الفتن۔

انھوں نے اپنے خروج سے جس تحصیل خیر اور دفع شر کا ارادہ کیا تھا تو وہ کچھ حاصل نہ ہوا۔ اس کے بجائے اس خروج اور پھر قتل سے شر بڑھا اور خیر کم ہوا۔ اور یہ قصہ ایک شرِ عظیم کا سبب گیا۔ یعنی قتلِ حسینؓ اسی طرح فتنوں کا موجب بن گیا جیسے قتلِ عثمانؓ سے فتنے اٹھے تھے۔

"یہی وہ وجہ تھی کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حسنؓ کے لیے بطور تعریف فرمایا تھا کہ "میرا یہ بیٹا سردار ہے، زمانہ آئے گا کہ اس کے ذریعہ اللہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرائے گا"۔ لیکن کسی کی بھی تعریف آپؐ نے اس کے لیے نہیں فرمائی کہ وہ حالت فتنہ میں تلوار اٹھائے گا۔ یا کسی امام جائر پر خروج اور اس کی سربراہی ماننے سے انکار کر دے گا ہاں خوارج کے سلسلے میں ضرور آپؐ نے صاف ارشاد فرمایا تھا کہ ایسی جماعت مسلمانوں میں رونما ہو تو اس سے ضرور قتال کیا جائے۔ چنانچہ ان سے جب علی رضی اللہ نے قتال فرمایا تو وہی صحابہؓ جو جمل اور صفین کے قتال میں آپؓ کے ہمنوا نہیں تھے اس قتال میں سب کے سب متفق ہوئے اور اسی طرح بعد کے اہلِ علم نے بھی ان دونوں قتالوں میں فرق کیا"۔[1]

---

[1] منہاج السنۃ ص۲۱۲ تا ص۲۱۴ ج ۲ سے تلخیص وانتخاب۔

ظلم کی ذمہ داری کس پر ؟

امام ابن تیمیہؒ کی یہ بحث کہ حضرت حسینؓ کا یہ اقدام جس کے نتیجے میں آپ کی مظلومانہ شہادت پیش آئی، شرعی نقطۂ نظر سے کیا حیثیت رکھتا تھا؟ اور کیوں رکھتا تھا؟ یہاں ایک ضمناً ذکر میں آجانے والی بحث تھی، ورنہ ہمارے موضوع کو اس شرعی بحث سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ مظلومانہ شہادت کی بات آنے اور اُسے مان لیے جانے کے بعد جو مسئلہ طبعی طور پر ہمارے سامنے آنا چاہیئے، وہ یہ ہے کہ اس ظلم کی ذمہ داری کس پر آتی ہے؟ یزید پر یا ابن زیاد پر؟

تاریخی شہادتوں کا جو ذخیرہ ہمارے سامنے ہے وہ کسی بھی طرح اس کی اجازت نہیں دیتا کہ اس خونِ ناحق کی ذمہ داری یزید پر ڈالی جائے، یزید نے بیشک ابن زیاد کے سپرد یہ بھی کیا تھا کہ وہ حضرت حسینؓ سے نپٹے اور کوفے میں ان کو آزادانہ داخل نہ ہونے دے۔ اس کے بعد اگر یہ بات پیش نہ آگئی ہوتی کہ حضرت حسینؓ نے اس مہم سے قطعی دستبرداری ظاہر کر کے جس کے لئے وہ مکے سے نکلے تھے، یزید کے پاس جانے اور اپنا فیصلہ اس کے ہاتھ میں رکھ دینے کی پیش کش کر دی، تب بیشک ابن زیاد کے حکم سے کی جانے والی جنگی کاروائی کی اصل ذمہ داری یزید ہی پر آتی، مگر اس کامل طور پر تبدیل شدہ صورت میں ابن زیاد نے یزید سے رجوع کیے بغیر اور کاروائی کے افسرِ اعلیٰ عمر بن سعد کے مشورے کے بھی برخلاف جو قتل و قتال کی کاروائی کرائی اس کی ذمہ داری یزید پر ڈالنا ایک زیادتی ہی کی بات ہوگی۔ ہاں اگر وہ اس کاروائی سے اپنی رضامندی اور خوشنودی کا اظہار کرتا تو پھر ضرور حق تھا کہ اسی کو اصل ذمہ دار قرار دیا جائے، مگر اس بارے میں ہم گذشتہ باب میں مختلف روایتوں کا جائزہ لے کر دیکھ چکے ہیں کہ ذمہ داری کے ساتھ ایسی بات یزید کی طرف منسوب کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ متعدد قرائن و شواہد کی روشنی میں پلڑا اُن روایتوں کا بھاری نظر آتا ہے جو اس واقعہ پر یزید کی نارضامندی اور ناخوشی ظاہر کرتی ہیں، اور اسی بنا پر اس باب (۱۲) کے پچھلے صفحات میں ابھی ہم لکھ کر آئے ہیں کہ :-

"یزید کے پاس آپ کا اس درجہ لچک کے ساتھ جانا کہ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیدیں' اس کا نتیجہ وقت کے تمام دستیاب شواہد و قرائن کی روشنی میں سوائے اس کے کچھ نہیں ہوتا تھا کہ یزید آپ کا اکرام کرتا......... اور حضرت معاویہؓ کی وصیت کے مطابق اُنہی کے نقشِ قدم پر "صلحِ حسنؓ" جیسا کوئی باب یزید اور حضرت حسینؓ کے درمیان بھی ضرور رقم ہوتا۔"

پس ہمارے خیال کے مطابق اس کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا تھا کہ اگر حضرت حسینؓ کی پیشکش کے بارے میں یزید سے رجوع کیا جاتا تو وہ ابن زیاد کو اس رویّے اور اس کارروائی کی اجازت دیتا جس کے نتیجے میں سانحۂ کربلا پیش آیا۔

ابن زیاد کو سزا کیوں نہیں دی؟

یہ سوال جب کسی عام آدمی کی طرف سے سامنے آئے تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہوتی۔ مگر جب پڑھے لکھے لوگ بھی یہ سوال اٹھاتے ہیں تو پھر حیرت ہوئے بغیر نہیں رہتی' اس لیے کہ ناراضامندی اور سزا دہی کا کوئی ایسا لازمی تعلق نہیں ہے کہ ایک حاکم نے اپنے ماتحت کی کسی بات کو ناپسند کیا ہو تو وہ اُسے سزا بھی ضرور دے دے' بہت سی دفعہ ناخوشی کا اظہار بھی اُس آدمی پر کرنا مناسب نہیں سمجھا جاتا ہے۔ اور اس کی کیسی قابلِ لحاظ مثال ہمارے سامنے موجود ہے کہ حضرت علیؓ کی فوج میں' بلکہ اُن کے نہایت خاص معتمدین میں بھی وہ لوگ شامل تھے جو قاتلانِ عثمانؓ کے سرگروہ شمار کیے جاتے تھے' اور خود حضرت علیؓ کو اس الزام سے انکار نہ تھا۔ مگر اس مطالبے کے جواب میں کہ اُن کو سزا دیجائے یا ورثاء عثمانؓ کے سپرد کیا جائے حضرت علیؓ کو ہمیشہ یہی کہنا پڑا کہ حالات اجازت نہیں دیتے۔ یعنی سزا کا مطالبہ کرنے والے بھی موجود تھے' اصولاً حضرت علیؓ کو مطالبے سے اتفاق بھی تھا۔ پھر

بھی مصالحِ وقت کا مسئلہ ایسا تھا کہ آپ اس پر عمل درآمد نہیں کر سکتے تھے۔ تو اب اگر ہم یزید کے لیے کوئی جداگانہ اصول نہیں بناتے ہیں تب آسانی سے محسوس کر سکتے ہیں کہ :-

جس ابن زیاد نے یزید کے ہاتھ سے نکلتے ہوئے عراق کو نہ صرف روک لیا تھا بلکہ جو طوفان وہاں یزید کے خلاف تیار ہو رہا تھا، اس کا رُخ اس نے تمام تر حضرت حسینؓ کے خلاف موڑ کے دکھا دیا، یزید کیلئے کیسے ممکن تھا کہ اس کا سر قلم کرنے کی بات سوچے ؟

اور وہ بھی ایسی حالت میں! کہ کوئی مطالبہ کسی طرف سے ایسا نہیں ہے ؟

اور

مزید برآں! ایسی حالت میں کہ اس کے ذہن پر اس قسم کا کوئی تقاضہ بھی بظاہر نہیں ہو سکتا تھا ؟

اُسے واقعہ سے رنج ہوا ہو، افسوس ہوا ہو، ایک الگ بات ہے، لیکن یزید اور حضرت حسینؓ کے تعلقات کی جو تاریخ تھی (جو یزید کے والد کے زمانے سے چلی آ رہی تھی اور جس کو ہم پچھلے ابواب میں دیکھ آئے ہیں) اس کے ہوتے ہوئے ایک خاندانی آدمی ہونے کے ناتے یہ توقع تو یزید سے کی جا سکتی تھی اور کی جانی چاہیے تھی کہ اُسے واقعہ پر رنج و ملال ہو مگر اس سے آگے بڑھ کر یہ توقع تعلقات کے اُس پسِ منظر میں کرنا کہ وہ ابن زیاد کی اس کاروائی کو ایک قابلِ سزا جرم سمجھے یہ تو ایک بہت ہی غیر فطری قسم کی توقع ہے۔ حضرت حسینؓ کی اُس تمام عظمت کے باوجود جس کی بنا پر ہمیں یہ خیال ہوتا ہے کہ یزید اگر کربلا کے اس واقعے سے خوش نہیں ہوا تھا تو ابن زیاد کو اس کی طرف سے کوئی سزا یا ملامت ہونی چاہیے تھی، ہم اس فطری حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار

نہیں کر سکتے کہ جب سیاسی کشمکش کا بیچ آجاتا ہے تو پھر فریقین کے ذہن سے ایک دوسرے کی قابلِ لحاظ عظمتوں کا نقش مٹتا چلا جاتا ہے۔

حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ کشمکش شروع ہوئی تو حضرت معاویہ کو پورا احساس تھا کہ اُن کی اور حضرت علیؓ کی کوئی برابری ہی نہیں ہے، حضرت علیؓ نے اپنے خطوط میں انھیں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی تو انہوں نے بے تأمل اعتراف کیا کہ آپ بجا فرماتے ہیں۔

امّا شرفك فی الاسلام و	اسلام میں آپ کی بزرگی اور جناب
قرابتك من رسول الله	رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے
صلّے اللہ علیہ وسلّم فلست	آپ کی قرابت کا جہاں تک تعلق ہے
ادفعهٗ.....	اُس سے مجھے ذرا انکار نہیں...

مگر جب اس کش مکش پر لمبا عرصہ گزر گیا اور تلخی بڑھتی چلی گئی تو پھر حضرت معاویہؓ کے رویّے میں اس اعتراف اور احساس کی جھلک ہمیں نظر آنی بند ہونے لگی، اور یہ بالکل فطری بات ہے، ہم اپنی خواہش کے ماتحت کسی جگہ پر ایک اصولِ فطرت کو ماننے سے انکار کریں تو یہ ہماری مرضی ہے۔ اصول اپنی جگہ اصول رہے گا۔ بہرحال ابن زیاد کو کوئی سزا نہ دینا یا ملامت نہ کرنا، اس سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ یزید کو کوئی افسوس اور رنج بھی حضرت حسینؓ کی شہادت پر نہیں ہوا یا وہ خوش ہوا ہو اور اس کی اپنی مرضی بھی فی الواقع وہی رہی ہو جو ابن زیاد کے ہاتھوں ہو گیا۔

ابن زیاد کیوں بضد ہوا ؟

باب کے ابتدائی صفحات میں جو ہم نے لکھا کہ، بظاہر تو ابن زیاد کو نہایت خوشی سے اس بات پر راضی ہونا چاہیے تھا کہ حضرت حسینؓ اگر یزید کے پاس جانا چاہتے ہیں تو

ضرور چلے جائیں۔ لیکن واقعہ اس کے برعکس ہوا تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے بجز تقدیر الٰہی کے اور کیا کہا جائے، جس میں گویا حضرت حسینؓ کا مرتبۂ شہادت پانا مقدر ہو چکا تھا۔ ہمارے اس لکھنے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ابن زیاد کے ذہن میں بھی اپنے اس رویّے کی کوئی وجہ نہ رہی ہو گی اور بس یونہی تقدیری جبر سے وہ یہ کام کر بیٹھا ہو گا۔ بے شک اس کے ذہن میں کوئی بات اور اپنے اس رویّے کا جواز ہونا چاہیے۔ اور ہمیں اس کی تلاش ہے۔ اس تلاش میں کامیابی کی منزل تو اب تک ہاتھ نہیں آسکی ہے۔ لیکن اس تلاش اور غور و فکر کے دوران میں بعض باتوں کی طرف نظر جاتی ہے، جن کا یقیناً بہت کچھ دخل ابن زیاد کے اس رویّے میں ہونا چاہیے۔

ا۔ اس نے اپنے باپ سے وراثت میں ایک سخت گیر منتظم (ADMINISTRATOR) کا مزاج پایا تھا۔ نظم و نسق اور امن و امان کا قیام اور اُس کا تحفظ باپ کی طرح ابن زیاد کی نظر میں بھی ایک حاکم کا سب سے بڑا فریضہ اور سب سے بڑی نیکی تھی۔ اس کے باپ زیاد کو جب حضرت معاویہؓ نے بصرے کا حاکم مقرر کیا تو بصرے کے امن و امان کا حال اُس وقت بے حد خراب تھا۔ اس نے وہاں پہنچ کر ایک زبردست تقریر میں اپنی پالیسی کا بیان کیا۔ اس بیان کے ماتحت رات کو عشاء کے بعد سے صبح فجر تک باہر نکلنا ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ اور اس کی خلاف ورزی کی سزا قتل۔ ایک اعرابی (یعنی بصرہ شہر سے باہر کا آدمی) جو اس قصّے سے بے خبر تھا۔ کسی کام سے بصرے آیا تھا۔ رات میں چلتا پھرتا پایا گیا۔ گرفتار ہوا اور زیاد کے پاس لایا گیا، اس نے اپنی صفائی دی۔ زیاد نے کہا میں سمجھتا ہوں کہ تیرا بیان سچّا ہے تو بے خبر تھا۔ مگر نظم و نسق کا تقاضہ یہ ہے کہ میں تجھے بھی نہ چھوڑوں۔ چنانچہ قتل کر دیا گیا[1]۔ اس مزاج اور طبیعت کا

---

[1] طبری ج ۶ صـ ۱۲۶ اس واقعہ کو بیان کر کے طبری لکھتے ہیں۔
"زیاد پہلا حاکم تھا جس نے حکومت کی آواز کو وزن دیا۔ معاویہؓ کے (باقی آئندہ صفحہ پر)

ابن زیاد وارث تھا۔

۲۔ کوفے اور بصرے کے لوگ ہمیشہ اس قدر ناہنجار رہے تھے کہ ہر حکومت اور ہر حکمران اُن سے عاجز رہا۔ انتظام اور امن وامان کو اہمیت بلکہ ہر چیز پر فوقیت دینے والا آدمی ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں اور بھی زیادہ سخت گیر بلکہ سخت گیری کا ایک "عادی مجرم" بن جائے گا۔ کوئی سخت گیری اس کے لیے سخت گیری نہ رہ پائے گی۔ مسلم بن عقیل اور ان کے میزبان ہانی بن عُروہ کے ساتھ جو سلوک اس نے کیا وہ یقیناً اسی قبیل کی چیز تھی۔ امن وامان اور قومی یکجہتی سے بڑھ کر کوئی چیز اس کے یہاں مقدّس نہیں تھی۔ اس کو خطرے میں ڈالنے والے افعال اور اشخاص سے بڑھ کر کوئی فعل اور کوئی شخص اس کی نظر میں مبغوض نہ تھا۔

۳۔ حضرت حسینؓ اور یزید کے تعلّقات کی ناخوشگوار تاریخ کے باوجود یزید کی طرف سے جس پاس ولحاظ کی توقع ہم مختلف وجوہ سے کرتے آرہے ہیں۔ (مثلاً یہ کہ وہ ایک صحابی کا اور ایک بڑے خاندانی صحابی کا بیٹا تھا۔ نیز حضرت حسینؓ سے اُس کی خاندانی قرابت بھی تھی۔ اور پھر اس کے والد کی بڑی تاکیدی وصیت بھی حضرت حسینؓ کے ساتھ آخری حد تک حسنِ سلوک اور حق شناسی کی تھی۔)

(حاشیہ بقیہ صفحۂ گذشتہ) اقتدار کو مضبوطی بخشی، لوگوں کو اطاعت سکھائی۔ بے دھڑک سزائیں دیں اور تلوار نیام سے باہر نکالی۔ گمان پر پکڑا اور شبہے میں سزا دی۔ چنانچہ اس کی حکومت میں لوگ اس درجہ اس سے خائف ہوئے کہ ایک دوسرے کی شرارتوں سے محفوظ ہو گئے۔ کسی کی کوئی چیز گر جاتی تو مجال نہیں تھی کہ کوئی دوسرا اس کو ہاتھ لگا لے۔ حتیٰ کہ اصل مالک آتا اور اپنی چیز اُٹھا لیتا۔ عورتیں اپنے گھروں میں بے کھٹکے دروازہ کھول کر سو سکتی تھیں۔ الغرض وہ سیاست اس نے کی کہ اس کی مثال نہیں دیکھی گئی......" یہ طبری کا تبصرہ ہے اس کو نقل کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ اس سیاست کو سنت کی اعانت حاصل ہے۔

ان میں سے کوئی چیز ابن زیاد کے ساتھ نہیں پائی جاتی تھی۔ وہ ایک ساقط النسب آدمی کا بیٹا تھا۔ حضرت معاویہؓ نے اس (نسبی) سلسلے میں اُس پر اور اُس کے باپ پر جو احسان کیا تھا اُس کا یہ اثر عین قرینِ قیاس ہے کہ آدمی کو "بادشاہ سے زیادہ بادشاہ کا وفادار" بنا دے۔ اور اس لیے قرینِ قیاس ہے کہ حضرت معاویہؓ اور یزید کے ماتحت ان باپ بیٹوں کی انتظامی سختی میں ان کے اپنے سخت گیر انتظامی مزاج کے علاوہ کچھ اس احسان مندی کا بھی دخل ہو، اور خاص طور سے وہ اشخاص ان کے لیے کسی بھی پاس و لحاظ کے مستحق نہ رہ جاتے ہوں جو اس خاندان کے اقتدار کو چیلنج کرتے ہوں۔

ان باتوں سے یہ عقدہ تو حل نہیں ہوتا کہ جب حضرت حسینؓ کی سہ گانہ پیش کش گویا پکار کر کہہ رہی تھی کہ اب اُن سے کوئی خطرہ محسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تو پھر کون سی انتظامی مصلحت کا یا "بادشاہ کی بادشاہ سے بھی زیادہ" کون سی وفاداری کا تقاضہ تھا کہ اس پیش کش کو قبول کرنے کی نرمی دکھانے کے بجائے وہی سختی دکھائی جائے جو عام عادت بن گئی تھی۔ مگر ان باتوں کی طرف توجہ سے عُقدے کی سختی کچھ کم بہرحال ہو جاتی ہے۔

آہ یہ بے توفیقی!

بہرحال یہ بڑا ہی المناک حادثہ ہے کہ جب اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت حسینؓ رضی اللہ عنہ، کے لیے وہ جرأت آسان فرما دی جو بہت ہی شاذ و نادر اہلِ جرأت کو بھی نصیب ہوتی ہے، کہ حالات کو یکسر بدلا ہوا دیکھ کر اُن کی مطابقت میں وہ فیصلہ فرمائیں جس میں ملّت کی صلاح و فلاح ہے نہ یہ کہ اُن بدلے ہوئے حالات میں اپنی آن کا مسئلہ مقدم رکھیں، تب ابن زیاد کو یہ توفیق نہ ہو سکی کہ وہ

ملّت کی صلاح وفلاح کے لیے حضرت حسین رضؓ کی اس عظیم جذباتی قربانی کی قدر جان لیتا اور اپنی بے جا ضد سے اس واقعہ کا ذمہ دار نہ بنتا جس نے عالم اسلام پر ایک بار پھر خونی فتنوں ہی کے دروازے نہیں کھولدیئے بلکہ اعتقادی فتنوں کی رگوں میں بھی ایک نیا خون دوڑا دیا۔

اللّٰھم احفظنا من شرور انفسنا ومن
سیئات اعمالنا
وصلّ اللّٰھم وسلم علیٰ عبدك ونبیّك
سیّدنا محمّدٍ وعلیٰ اٰلہٖ واصحابہٖ
وازواجہٖ اجمعین

اختتامیہ

(کتاب کا خلاصہ اور کچھ توضیحات)

کتاب الحمد للہ تکمیل کو پہنچ گئی۔ اس کے اہم نکات و مباحث کو اگر ہم تھوڑے سے لفظوں میں سمیٹ کر بیان کرنا چاہیں تو یوں بیان کر سکتے ہیں کہ :

۱۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت علی مرتضیٰؓ کی خلافت کے آغاز ہی سے مسلمانوں میں خانہ جنگی کی جو المناک صورت برپا ہوئی تھی، آنحضرت ﷺ کی پیشین گوئی کے مطابق، اس کا خاتمہ حضرت علیؓ کے جانشیں سیدنا حسن بن علیؓ کے ہاتھوں سے ہوا۔ اور وہ اس طرح کہ آپ نے خلافت کا ادارہ تمام تر حضرت معاویہؓ کے لیے چھوڑ کر خود کو اس نزاع سے دستبردار کر لیا۔ یہ ۴۱ھ کی بات ہے جسے اسلامی تاریخ میں "عام الجماعۃ" (اجتماعیت واپس آنے کا سال کہا گیا ہے)۔

۲۔ حضرت حسنؓ کے چھوٹے بھائی حضرت حسینؓ اپنے بڑے بھائی کے اس فیصلہ سے متفق نہ تھے مگر جب حضرت حسنؓ کی طرف سے فیصلے پر عملدر آمد ہو گیا تب سے وہ بھی اس کے احترام کو لازم جانتے رہے اور رفتہ رفتہ حضرت معاویہؓ کے ساتھ تعلقات میں خوشگواری کی کیفیت بھی پیدا ہو گئی۔

۳۔ مصالحت اور خوشگواری کی یہ فضا پندرہ سال تک چلتی رہی۔ جبکہ اس دوران میں حضرت حسنؓ نویں سال میں انتقال فرما گئے تھے۔ مگر سولہویں سال (۵۶ھ) میں حضرت امیر معاویہؓ نے جب اپنے بڑھاپے کے احساس سے اپنے بعد کے لئے کسی کو جانشین اور ولی عہد نامزد کرنے کے لئے سوچا اور پھر اپنے بیٹے یزید کو اس کے لئے موزوں قرار دیا تو نئے سرے سے ایک اختلاف کی صورت پیدا ہونا شروع ہوئی۔ اختلاف کرنے والوں میں صرف حضرت حسینؓ ہی نہیں تھے بلکہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے بیٹے عبد الرحمٰن بن ابی بکر، حضرت عمر فاروقؓ کے بیٹے عبداللہ بن عمرؓ، حضرت زبیر بن عوام کے بیٹے عبداللہ بن زبیرؓ بھی اس میں شامل تھے۔

۴-اس اختلاف کی سب سے اہم اصولی بنیاد یہ تھی کہ باپ اپنے بعد کے لئے بیٹے کو بطور ولی عہد خلافت نامزد کرے یہ اسلامی خلافت کا نہیں قیصر و کسریٰ کی سلطنت کا دستور ہے۔ دوسری ایک بنیاد بظاہر یہ بھی تھی کہ اصحابِ نبی ﷺ کی موجودگی میں انہی میں سے کوئی منصب خلافت کے لئے موزوں ہو سکتا ہے نہ کہ بعد میں پیدا ہونے والا ایک نو عمر۔ ان دو کے علاوہ ایک تیسری یہ بات جو اس سلسلے میں بیحد مشہور ہے کہ اس اختلاف کی ایک اہم بنیاد یہ بھی تھی کہ یزید بڑا فاسق و فاجر ہے۔ یہ بات کہیں اس اختلاف کی روداد میں آخر آخر تک نہیں پائی جاتی۔ محض "زیبِ داستاں" کے طور پر بڑھائی گئی بات ہے۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ حضرت امیر معاویہؓ کا نقطۂ نظر ان حضرات کے بالمقابل بظاہر یہ تھا کہ خلافت کے سلسلے میں سب سے زیادہ قابلِ لحاظ چیز مضبوط انتظامی اہلیت اور گرفت ہے۔ اور اس معیار کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے وہ یزید ہی کی خلافت کی شکل میں امید کرتے تھے کہ ادارۂ خلافت مضبوط رہے گا اور وہ افراتفری نہیں پھیلے گی جو حضرت عثمانؓ کے بعد پیدا ہو گئی تھی۔ مؤرخین نے اگرچہ یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ حضرت معاویہؓ کے اس فیصلے میں محبتِ پدری کا بھی دخل تھا۔ مگر خود انہوں نے اس طرح کے کسی محرک سے اپنی برأت کا اظہار کیا ہے۔

۵-یہی اختلاف تھا جس سے واقعۂ کربلا کی داغ بیل پڑی اور یہ خاص کر اہل کوفہ تھے جنہوں نے اس اختلاف کا سلسلہ کربلا کے میدان سے ملا دینے میں پورا کردار ادا کیا۔ کوفہ چونکہ حضرت علیؓ کا دارالخلافۃ رہا تھا اس لئے قدرتی طور پر حضرت حسینؓ سے قریبی تعلق رکھنے والے لوگ وہاں پائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ یہاں کے لوگوں کی ایک مستقل خصوصیت شوریدہ سری اور تلون مزاجی اور حکمرانوں سے چپقلش بھی تھی۔ اس کی بنا پر ان مذکورہ بالا پندرہ سالوں میں بھی لازماً وہاں ایک بڑا حلقہ ایسے لوگوں کا ہو جانا چاہئے تھا جو حضرت امیر معاویہ کے خلاف کوئی بڑا محاذ قائم ہو جانے کا خواہشمند ہو۔ مزید بر آں عبداللہ بن سبا (یہودی منافق) کی ریشہ دوانیوں نے حضرت عثمانؓ کی خلافت کے دور ہی سے وہاں ایک ایسا کالم پیدا کر دیا تھا جسے مرکزِ خلافت سے محاذ آرائی ہی میں "اسلام کی خدمت" نظر آتی تھی۔ ان متعدد عوامل کے تحت کچھ لوگوں نے اولاً تو حضرت حسنؓ کی وفات کے فوراً بعد ہی چاہا تھا کہ حضرت حسینؓ کو از سر نو امیر معاویہ کے خلاف متحرک کر دیں جس میں وہ ناکام رہے۔ اس کے بعد ولی عہدی کے مسئلہ میں اختلاف پر ان لوگوں کی توقعات پھر زندہ ہوئیں اور

حضرت حسینؓ سے رابطہ پیدا کر کے چاہا کہ اس مسئلہ پر آپ کو حضرت معاویہؓ کے خلاف میدان میں اتار دیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اسلامی جمعیت کی حفاظت فرمائی اور ان کا یہ حربہ بھی کارگر نہیں ہو سکا۔ البتہ اس ضمن میں یہ بات ضرور سامنے آگئی کہ اس ولی عہدی کے مسئلہ نے حضرت حسینؓ کی سوچ کو بھی بہر حال اس راہ پر لگادیا ہے اور حضرت معاویہ کے بعد ٹکراؤ کی صورت پیش آجانے کے کافی امکانات ہیں۔

۶-ولی عہدی کے مسئلہ پر جو ایک روایت صحابیٔ رسول حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو ملزم ٹھہراتی ہوئی ملتی ہے، کہ یزید کی ولیعہدی کی تجویز دراصل ان کے دماغ سے نکلی تھی اور صرف اپنا عہدہ (کوفہ کی گورنری) بچانے کے لئے انہوں نے، یہ جانتے بوجھتے کہ اس کا انجام اسلامی جمعیت کے لئے تباہ کن ہو سکتا ہے، یہ تجویز دی تھی۔ اس روایت کی جانچ کی جاتی ہے تو یہ ایک انتہائی مہمل افسانے سے زیادہ کچھ نہیں نکلتی۔ جبکہ حضرت مغیرہ خود قرآن پاک کی رو سے ایسے درجے کے فضائل والے صحابی ہیں کہ کوئی مضبوط روایت بھی ہو تو ان آیتوں کے مقابلے میں اس روایت کو دیوار سے مار دینے کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہو گا۔

۷-حضرت معاویہؓ نے یزید کی ولیعہدی کے بارے میں مملکت کے ایک بڑے حلقے کا رسمی Formal اعتماد حاصل کر کے اپنے فیصلے کو قطعیت کا درجہ دے دیا مگر اس اعتماد کے ووٹ میں مکے اور مدینے کی کمی رہی۔ تب آپ نے وہاں کا ایک سفر کیا تا کہ اس کمی کو (خاص کر مدینہ منوّرہ کے اعتماد کی کمی کو) دور کیا جا سکے۔ جس کی نمائندگی عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ اور حسین بن علیؓ کی طرف سے مخالفت کی شکل میں ہو رہی تھی۔

اس سفر کا اور وہاں ان چاروں حضرات سے ملاقات وغیرہ کا جو قصہ تاریخی روایتوں میں مذکور ہے، اسکا بڑا حصہ نہایت مضحکہ خیز اور چاروں بزرگوں کے نام کو قطعی بٹہ لگانے والا ہے۔ البتہ اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح ہو گا کہ ایک طرف تو یہ چاروں حضرات ـــــ بشرطیکہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ بھی اس وقت زندہ رہے ہوں ورنہ باقی تینوں حضرات ـــــ اپنے موقف پر قائم رہے۔ اور دوسری طرف حضرت معاویہؓ بھی اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ یہ اختلاف ختم نہیں ہو سکے گا اور یزید کو اقتدار میں آنے پر اس مخالفت کا سامنا کرنا ہی ہو گا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی موت کا وقت آنے پر ان حضرات کے سلسلے میں یزید کو مناسب وصیتیں بھی فرمائیں جن میں حضرت حسین کے لئے ہر ممکن طور سے

حسنِ معاملہ کی تاکید تھی۔

۸-ولی عہد کی نامزدگی کے چار سال بعد (۶۰ھ میں) حضرت معاویہؓ نے انتقال فرمایااور یزید نے زمامِ خلافت ہاتھ میں لے کر حاکمِ مدینہ کو حکم بھیجاکہ عمائدین مدینہ خاص کر حضرت عبداللہ بن عمرؓ عبداللہ بن زبیرؓ اور حسین بن علیؓ جنہوں نے ولی عہدی کی بیعت نہیں کی تھی،ان سے اب خلافت کی بیعت لی جائے (چوتھے حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کااس وقت انتقال ہوچکا تھا) حاکمِ مدینہ نے اہل الرائے کے مشورے سے طے کیاکہ عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں تو کسی جلدی کی ضرورت نہیں ہے بے ضرر ہستی ہیں۔ البتہ باقی دونوں حضرات کے بارے میں عجلت اور چوکسی کی ضرورت ہے۔ مگر یہ دونوں حضرات کچھ حاکم کی نرمی اور کچھ اپنی حکمتِ عملی کی وجہ سے اس بیعت سے بچنے اور مدینے سے نکل کر مکے پہنچ جانے میں کامیاب ہوگئے۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا تو پیچھا بھی کرنے کی کوشش حکومت کی طرف سے کی گئی جو کامیاب نہ ہوسکی۔ مگر حضرت حسینؓ کے بارے میں کسی تعاقب کی روایت نہیں پائی جاتی۔

۹-شعبان ۶۰ھ کے پہلے ہفتہ میں مکہ معظمہ پہنچ جانے کے بعد ۸/ذی الحجہ تک حضرت حسینؓ کا قیام وہیں رہا۔اور اس درمیان میں رمضان المبارک سے اہل کوفہ کے وفود اور خطوط آپ کے پاس آنا شروع ہوگئے، جن میں کوفہ آکر ان لوگوں کی سربراہی سنبھالنے کی درخواست تھی اور یقین دلایا گیا تھا کہ سارا کوفہ آپ کے ساتھ ہے، جیسے ہی آپ آئیں گے یہاں کے یزیدی حاکم کو نکال کر باہر کردیا جائے گا۔ آپ نے پوری طرح اطمینان حاصل کرنے کے لئے اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کو کوفہ بھیجااور ان کی طرف سے اطمینان کا خط آنے پر حج سے ایک دن پہلے ،۸/ذی الحجہ کو، آپ کوفہ کے لئے روانہ ہوگئے لیکن ٹھیک اسی ۸/ذی الحجہ کو، جبکہ حضرت حسینؓ کوفہ والوں کے اعتماد پر سفر کا قدم اٹھارہے تھے، مسلم بن عقیل کوفہ والوں کی بے وفائی کا شکار ہوکر حاکم کوفہ عبیداللہ بن زیاد کی گرفت میں آچکے تھے۔اور دوسرے ہی دن ان کی زندگی کا چراغ بھی گل کردیا گیا تھا۔ حضرت حسینؓ کو اس کا پتہ راستے کی کافی منزلیں طے کرنے کے بعد چلا اس پر آپ نے واپسی کا ارادہ فرمایا۔ مگر برادرانِ مسلم کے جذباتِ انتقام آڑے آگئے۔(جو یہ چاہتے تھے کہ یا بدلہ لیں گے یا مر جائیں گے۔) چنانچہ آپ سفر جاری رکھنے پر مجبور ہوئے اور پھر دوسری بار جب آپ نے یہی ارادہ کوفے سے کچھ قریب پہنچ کر اس وقت کیا جب آپ کو اس بات کی مزید شہادت ملی کہ کوفہ تو پوری طرح عبیداللہ

بن زیاد (حاکمِ کوفہ) کی گرفت میں ہے اور آپ صرف گرفتار ہو کر ہی اندر جاسکتے ہیں، تب واپسی کیلئے کوئی گنجائش اور کوئی راہ باقی نہیں رہی تھی۔ آپ کی گرفتاری کے لئے فوجی دستے حرکت میں آچکے تھے، آپ نے اس وقت فوری طور پر ایک غیر معمولی فیصلہ کیا یعنی اپنا رخ یزید کے دار الخلافہ دمشق کی طرف موڑ دیا۔ مگر ان فوجی دستوں نے پیچھا کر کے آپ کو جلد ہی رک جانے پر مجبور کر دیا جو ابن زیاد کے حکم کے ماتحت چاہتے تھے کہ آپ کوفہ چلیں۔ یہی جگہ جہاں آپ کو قدم روک لینے پڑے اور جسے آپ کی شہادت گاہ بننا مقدر تھا کربلا کے نام سے جانی جاتی ہے۔

۱۰- فوجی دستوں کے سردار عمر بن سعدؓ بن ابی وقاص جن کے بارے میں روایتیں یہ تاثر دیتی ہیں کہ ان کے دل میں حضرت حسینؓ کے لئے نہایت نرم گوشہ تھا انہوں نے اندھادھند کوئی کارروائی کرنے کے بجائے معاملے کو پر امن طریقے سے سلجھانے کی کوشش میں حضرت حسینؓ سے رابطہ قائم کیا اور آپ کی طرف سے یہ خواہش سامنے آنے پر کہ آپ کی تین باتوں میں سے کوئی ایک قبول کر لی جائے۔ یعنی:

۱- واپس ہونے دیا جائے۔

۲- یزید کے پاس چلا جانے دیا جائے یا لے چلا جائے۔

۳- کسی مملکت کی سرحد پر بھیجدیا جائے جہاں آپ مقیم ہو جائیں اور جہادی مہمات میں حصہ لے کر عمر گزاریں۔

عمر بن سعد نے ابن زیاد (حاکم کوفہ) کو اس کی اطلاع اس طور سے بھیجی کہ جیسے یہ ایک نہایت عمدہ اور قابل قبول بات ہو۔ روایتوں کے مطابق ابن زیاد کو بھی اس صورتِ حال سے خوشی ہوئی، مگر شمرؔ جیسے مشیر ان نے اس کی رائے پلٹ دی بلکہ عمرو بن سعد سے بھی اسکو کچھ بدگمان کر دیا جس کے نتیجے میں شمر ہی کو بھیجا گیا کہ وہ عمر سے اصل حکم کی تعمیل کرائے۔ یعنی مفاہمت سے یا طاقت سے، جس طرح بھی ممکن ہو حسین اور ان کے ہمراہیوں کو زندہ یا مردہ گرفتار کر کے کوفہ لایا جائے۔ اور یہ چیز اس قتل و قتال کا موجب بن گئی جس نے کربلا کا نام امر کر دیا۔

۱۱- کربلا کے میدان کا واقعہ بہت سادہ اور بہت مختصر ہے اور جتنے قصے کہانیاں اس سلسلے میں بیان کی جاتی ہیں جب ان کی جانچ اس وقت اور ماحول کے امکانات و مواقع، روایتوں کے تقابل، انسانی فطرت اور حضرت سیدنا حسینؓ اور ان کے اہل بیت کے دینی شعور کی روشنی میں کی جاتی ہے تو

یہ تمام کے تمام قصے ایک ایسی من گھڑت داستان بن کے رہ جاتے ہیں جسے بس ابن سبا یہودی کے شیطانی منصوبے کے مطابق ہی گھڑا جا سکتا تھا۔

۱۲- کوفے کے دروازہ بند پا کر اولاً حضرت حسینؓ کی طرف سے خود اپنی کوشش کہ یزید کے پاس دمشق چلے جائیں اور اس میں رکاوٹ پڑنے کے بعد رکاوٹ ڈالنے والی کوفی فوج کے سردار عمر بن سعدؓ کو ان تین باتوں کی پیش کش جن میں سے ایک یہ تھی کہ آپ کو یزید کے پاس بھیجدیا جائے، اس کے بعد حاکمِ کوفہ کے لئے کوئی جواز باقی نہیں رہتا تھا کہ ان باتوں پر غور کرنے سے پہلے اپنی اطاعت قبول کرنے کی شرط عائد کرے اور کوئی بے جواز وجہ بھی حقیقت میں ایسی نظر نہیں آتی جس سے یہ سوال حل کیا جا سکے کہ جب بات یزید کے ہاتھ میں جا رہی تھی اور ایک بھاری مسئلہ بغیر قتل و قتال کے طے ہونے کے پورے امکانات پیدا ہو گئے تھے تو ابن زیاد نے ایک قتل و قتال کو دعوت دینے والی یہ شرط کیوں عائد کر دی؟ــــ لیکن اس کہانی میں یہی تنہا ایک مقام نہیں ہے جس کا عقدہ حل کرنے سے عقل عاجز رہی جاتی ہو۔ ہم نے حضرت حسینؓ کے اعزہ، واحباب اور خیر خواہ بزرگوں میں کتنوں ہی کو پایا ہے کہ وہ کوفے کی طرف آپ کے ارادۂ سفر سے حیران و پریشان ہیں اور ان کی بالکل سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ ارادہ کیسے ایک مناسب ارادہ ہو سکتا ہے؟ اور انہیں اس اظہار حیرانی پر کوئی ایسا جواب بھی نہیں ملتا کہ کچھ مطمئن ہو سکیں۔ (اور آج بھی آدمی خالی الذہن ہو کر پورے قصے کو پڑھے تو وہ حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، یہ الگ بات ہے کہ کوئی اس کے اظہار کو بے ادبی سمجھے)۔

حضرت حسینؓ اور یزید کے قصے پر غور کرنے والے اہلِ علم و فکر میں سے امام ابن تیمیہؒ نے بھی اس مشکل کو بڑی شدت سے محسوس کیا ہے اور پھر وہ یہ خیال پیش کر کے اسے حل کرتے ہیں کہ :

> "حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے لئے اللہ کے یہاں سعادت اور نیک بختی کا وہ بلند مرتبہ طے ہو چکا تھا جس کے لئے کسی نہ کسی طرح کی مصیبت سے گزرنا لازم ہے۔ مگر ان دونوں کو اپنے دیگر اہل بیت کے برخلاف اس کے مواقع حاصل نہ ہو سکے تھے ان کی زندگی اسلام کی اور عزت و عافیت کی گود میں بسر ہوئی تھی۔ بس اس لئے ہی ایسا ہوا کہ ایک بھائی کی موت زہر خورانی سے اور دوسرے کی مظلومانہ قتل سے ہوئی تاکہ اس کے صلہ میں وہ شہداء کا عیش اور اہلِ سعادت کی منزلت

پا سکیں۔"

یعنی اس نہ سمجھ میں آنے والے پورے قصے کار از ان کے خیال کے مطابق یہ تھا کہ حضرت حسین مرتبۂ شہادت پر فائز ہوں ورنہ یہ قصہ پیدا ہونے کی کوئی بات ہی نہ تھی۔ یا تو حضرت حسینؓ اپنے ہمدردوں کی رائے کے مطابق کوفے کے سفر سے رک گئے ہوتے اور یا پھر ابن زیاد بے وجہ کی ضد پر آمادہ نہ ہوا ہوتا۔

۱۳۔اس قتلِ ناحق میں یزید کا کیا کردار ہے؟ـــــ اگر بے لاگ انصاف کی نظر ڈالی جائے اور کم از کم شبہے کا فائدہ جو ہر ملزم کو دیا جاتا ہے یزید کو بھی دیا جائے تو اس کا کوئی کردار اس معاملے میں ثابت نہیں ہوتا۔ اور اس کی سب سے کھلی اور سامنے کی دلیل خود حضرت حسین کی آخری وقت کی یہ کوشش اور خواہش ہے کہ آپ کو یزید کے پاس پہنچ جانے کا موقع مل جائے! اگر آپ کے لئے ذرا بھی اس خیال و گمان کی گنجائش ہوتی کہ کوفے کی سرکار (انتظامیہ) کی طرف سے جو کچھ آپ کے ساتھ معاندانہ اور سنگدلانہ رویہ اختیار کیا جارہا ہے اس میں یزید کی مرضی شامل ہے، تو آپ کی طرف سے اس سرکارِ کوفہ کے نمائندوں کو یہ پیش کش بالکل ناقابل قیاس تھی کہ میں یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دینے کو تیار ہوں۔ ابن زیاد کے ہاتھ اور یزید کے ہاتھ میں یہ تفریق تو آپ اسی اعتماد کی بنیاد پر کر سکتے تھے کہ آپ کی طرف سے مصالحانہ رویہ سامنے آنے کے بعد یزید کی طرف سے کسی غیر شریفانہ رویہ کا سوال نہیں ہے۔

۱۴۔اور یہی حقیقت ان روایتوں کو محض خرافات ثابت کرنے کے لئے بھی کافی ہے جو بتاتی ہیں کہ سانحۂ شہادت کے بعد حضرت حسینؓ کا سر مبارک اور آپ کے باقیاتِ اہل بیت کو یزید کے پاس پہنچایا گیا تو اس نے توہین اور طعن و تشنیع کا رویہ اختیار کیا۔ ویسے یہ روایتیں فنی معیار پر بھی خرافات ہی ثابت ہوتی ہیں جیسا کہ متعلقہ باب میں ان پر کی گئی بحث سے بالکل صاف ظاہر ہو جاتا ہے۔

حرفِ آخر

کتاب کی تلخیص ختم ہوئی۔ لیکن چند باتیں اور اسی ضمن میں درج کر دینے کی ضرورت ہے۔

۱۔کربلا کے حادثے کے سلسلے میں ایک عام تصور یہ ہے کہ یہ حادثہ یزید کی مرضی سے پیش آیا اور اس کا کلیجہ اسکی خبر سے ٹھنڈا ہوا۔ آپ کے ہاتھ کی یہ کتاب، اسکے برعکس، جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا، یہ ظاہر کرتی ہے کہ واقعے کی ساری روایتوں کو، جو کہ بہت متضاد ہیں، اگر خالی الذہن ہو کر

(یعنی پہلے سے کوئی بات طے نہ کر کے) پڑھا جائے تو ایسا ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض قرائن سے اس کے رنجیدہ ہونے کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

متضاد روایتوں والے اس واقعے کی اصل حقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے، ہمارا کہنا صرف اپنے مطالعے کے نتیجے کے طور پر ہے، جسکا اظہار اس واقعے پر گفتگو کرتے ہوئے ایک علمی اور اخلاقی ذمہ داری تھی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ یزید سے ہمارا کوئی رشتہ ناتہ نہیں کہ اس کو بے قصور بنانے کی فکر کریں اور ان بہت سے لوگوں کی ناراضگی مول لیں جو ایک روایتی تصور کے خلاف بات نہیں سن سکتے۔ بلکہ اسے حسینؓ دشمنی (معاذاللہ) گردانتے ہیں۔

۲-دوسرا یہ ایک تصور بھی اس قصے میں اتنا ہی عام ہے کہ یزید سخت فاجر و فاسق قسم کا انسان تھا۔ اور یہی ایک بڑی بنیادی بات تھی کہ حضرت حسینؓ اور ان کے دوسرے ہم خیال اس کی خلافت تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔ ہمیں اپنے مطالعے میں اس کی کوئی ادنیٰ شہادت نہیں مل سکی کہ ایسی کوئی بات تھی جو اختلاف کی بنیاد بنی۔ اس لئے اس نتیجے کا اظہار بھی نہ صرف ایک علمی اور اخلاقی ذمہ داری تھی بلکہ اس ذمہ داری کا ایک دینی پہلو بھی تھا۔ جسکی بنا پر نہ صرف اسکا اظہار کرنا بلکہ زور دے کر اظہار کرنا ہمیں لازم تھا۔ اور وہ پہلو یہ تھا کہ اہل سنت وجماعت نے اصحاب نبی ﷺ کو ان کے مرتبوں کے ساتھ ساتھ عادل اور راست باز بلا تفریق مانا ہے اور یزید کو منصب خلافت کے لئے ولی عہد نامزد کرنے والے حضرت امیر معاویہؓ بلا اختلاف اصحابِ نبی ﷺ میں شامل ہیں۔ اس لئے اگر ہمارا مطالعۂ تاریخ ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ کم از کم حضرت معاویہؓ کی زندگی تک بلکہ حضرت حسینؓ کی زندگی تک بھی جو حضرت معاویہؓ کے بعد بس چھ مہینے اور تھی، یزید کے اندر فسق وفجور کہلانے والی بات کی شہادت نہیں ملتی(۱)۔ تب ہماری یہ ایک دینی ذمہ داری بھی ہے کہ اپنے مطالعے کے اس نتیجے کو پورے زور سے بیان کریں، تاکہ ایک صحابیٔ رسول ؐ کی عدالت اور راست بازی پر جو یہ حرف آرہا تھا کہ انہوں نے ایسے نالائق شخص کو منصب خلافت کے لائق ٹھہرا لیا، اس سے ان کا دامن صاف ہو جائے اور اصحابِ نبی کا جو مقام اہل سنت کے دل میں ہے اس میں بال نہ آنے پائے۔ کیونکہ ان کا یہ مقام ہی ہمارے دین کا پشتہ ہے۔ رہی یہ بات کہ حضرت معاویہؓ کا انتخاب عمومی مصلحت کے لحاظ سے کیسا تھا؟ اس میں گفتگو ہو سکتی ہے اور ہم نے بھی اس میں گفتگو کی

(۱) اور ہماری ساری گفتگو اسی وقت کے بارے میں ہے۔ اس کے بعد کا دور ہماری کتاب کے موضوع سے خارج ہے۔

ضرورت سمجھی ہے۔

۳-کتاب کی اولین اشاعت (۱۹۹۲ء) ہی پر مصنف کے وہم و گمان سے بھی بالاتر جو اہمیت اس کو بفضل خدا ملی اس کے پہلو بہ پہلو اس طرح کے تبصرے بھی، جو غیر متوقع ہرگز نہیں تھے، سامنے آئے کہ : اس میں یزید اور حضرت معاویہؓ کی طرفداری زیادہ ہو گئی ہے۔ ایسے تبصروں والے حضرات سے اگرچہ ہم باوجود خواہش کے یہ نہیں معلوم کر سکے کہ ان کا اشارہ کن باتوں کی طرف ہے، لیکن بظاہر انکا اشارہ کتاب کے انہی دو پہلوؤں کی طرف تھا۔ اور ان کے بارے میں ہماری پوزیشن یہی ہے جس کا اوپر اظہار کیا گیا، اسکو ہماری وضاحت سمجھا جائے یا ہماری معذرت!

۴-ایک بالکل غیر متوقع بات بھی سامنے آئی۔ اور وہ یہ کہ متعدد اصحاب نے یزید کے ذکر میں بے احترامی کا شکوہ کیا۔ یعنی یہ کہ واحد غائب کے صیغوں اور ضمیروں (تھا۔ نہیں تھا۔ اس اور جس) کا استعمال کیا گیا ہے۔ بلکہ ایک صاحب نے تو اس سے بھی بڑھ کر گرفت کی آپ نے یزید کے اولین خطبے کے حوالے سے جو یہ لکھا ہے کہ :

"رہا یہ کہ وہ کوئی بڑا متقی، پرہیزگار ہو، یہ اس خطبے سے نہیں نکالا جا سکتا۔ ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا۔ اور غالب گمان یہ ہے کہ ایسا نہیں تھا۔"(۱) تو اس "غالب گمان" کی کوئی دلیل دیئے بغیر آپ نے اس بدگمانی کا اظہار کیسے جائز سمجھا؟"۔(۲)

میرے پاس واقعی دلیل نہیں تھی۔ اسلئے اس (تازہ) ایڈیشن میں یہ غالب گمان والے الفاظ نکالنا اپنا فرض سمجھا اور اس ترمیم کا اظہار یہاں اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ یزید کی طرفداری کا احساس کرنے والے حضرات اس ترمیم کے پسِ منظر سے واقف ہو جائیں۔

۵-طرفداری کا احساس کرنے والے ایک صاحب نے نشاندہی کی کہ یزید کے ایک نائب حاکم مکہ عمر بن سعید العاص الاشدق کی طرف سے حضرت حسینؓ کے ساتھ نرمی اور بھلائی کا سلوک دکھا کر (ص ۱۷۰) تو آپ نے نتیجہ نکالا ہے کہ یہ بغیر یزید کی رضا کے نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر جب عبیداللہ بن زیاد حاکم کوفہ وہ سنگدلی اور سفاکی کرتا ہے جس سے آپ کو بھی انکار نہیں تو آپ کہتے ہیں کہ اس میں یزید کی رضا شامل نہیں تھی! یہ کیسے؟(۳) سوال بظاہر معقول تھا مگر مجھے یہ بھی

---

(۱) طبع اول ص ۱۳۱ (۲) یہ خط بھی اور اس سے قبل والے اعتراض کے خطوط بھی الفرقان کی جلد ۱۹۹۲ء کے بعض شماروں میں شائع ہو چکے ہیں۔ (۳) یہ اودھ کے ایک خاندان سادات سے تعلق رکھنے والے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے شعبۂ انگریزی کے ایک استاذ تھے۔

اطمینان تھا کہ میں نے کہیں دوہرا معیار نہیں برتا ہے۔ کہیں دانستہ ناانصافی نہیں کی ہے۔ اس لئے عرض کیا کہ سوال تو آپ کا معقول ہے مگر جواب میں کتاب دیکھ کر دے سکتا ہوں، میرے ذہن میں موقع کی پوری عبارت نہیں ہے۔ کتاب دیکھنے کا موقع ملا تو میں نے محسوس کیا کہ نہ ان صاحب نے غلط کہا نہ مجھ سے بے انصافی ہوئی۔ میرا قلم کوتاہی کر گیا۔ یعنی حاکم مکہ کے رویے سے متعلق عبارت میں چند الفاظ کی کمی رہ گئی جس کے نتیجے میں یہ سوال کسی بھی ناقدانہ ذہن والے قاری کے دل میں پیدا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اب یہ عبارت بریکٹ والے الفاظ بڑھا کر اس طرح کر دی گئی ہے:

"ہمارے خیال میں (یزید کے بارے میں حضرت حسینؓ کے سخت مخالفانہ رویے کے پس منظر میں) یہ بات نہیں سوچی جا سکتی تھی کہ مقامی حکام احترام، نرمی اور چشم پوشی کا رویہ مرکزی حکومت اور دارالخلافہ دمشق کی مرضی کے بغیر کر رہے ہوں۔"

اس ترمیم کے بعد امید ہے کہ کسی کو بھی ان دونوں جگہوں کا فرق سمجھنا مشکل نہ رہے گا اور وہ فرق یہ ہے کہ یزید کی بابت حضرت حسینؓ کے سخت مخالفانہ رویے کو، جو اس کی نامزدگی کے وقت سے چلا تھا، سامنے رکھا جائے تو یہ ممکن نہیں معلوم ہوتا کہ یزید کی حکومت کا کوئی حاکم بغیر اس کی مرضی جانے کوئی ایسا کام کھلے طور پر اور پھر مدت دراز تک کرے گا جس سے حضرت والا کے بارے میں اس کی نرمی اور چشم پوشی کا اظہار ہوتا ہو۔ لیکن سختی کا کوئی قدم ایسے حالات میں کوئی حاکم اٹھاتا ہے تو اس کے بارے میں یہ سمجھنا بالکل بھی ضروری نہیں ہوگا کہ اس خاص قدم کی بھی اوپر سے ہدایت ملی ہے۔ جبکہ وہ حاکم خاص طور سے حضرت حسینؓ کے خطرے سے نپٹنے ہی کے لئے مقرر بھی کیا گیا ہو۔ جیسا کہ ابن زیاد کا تقرر برائے کوفہ خاص اسی مقصد سے ہوا تھا۔ اس کے علاوہ حضرت حسینؓ کا ابن زیاد کے ہاتھ میں ہاتھ دینے سے انکار کرنا اور یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دینے کے لئے بخوشی تیار ہونا یہ خود اس بات کی کھلی علامت ہے کہ آپ ابن زیاد کے سخت رویہ میں یزید کی مرضی کا عکس نہیں دیکھتے تھے۔

۶- مذکورہ بالا اعتراض ایک درجہ میں معقول اعتراض تھا اور اس کا ذکر اسلئے مناسب سمجھا گیا کہ کسی اور کو بھی متعلقہ مقام پر یہ خیال گزرے تو اس کا دفعیہ ہو جائے۔ لیکن ایک اعتراض اور بھی تھا جو کتاب نکلتے ہی ایک ایسے صاحب کے قلم سے سامنے آیا جو نہ صرف خوب عالم و فاضل بلکہ ہماری ایک نامور علمی و دینی درسگاہ کے نظام تعلیم کے نگراں ہیں۔ اسکا ذکر عبرت کے لئے کرتا

مقصود ہے۔ کہ شیعیت نے ہمارے اچھے اچھوں کے دل ودماغ پر کیسا جادو کر رکھا ہے، کہ جب کربلا کے موضوع میں کوئی بات اس کے پھیلائے ہوئے تصورات کے برعکس آجائے تو ایسے لوگ بھی اپنی حیثیت اور اپنے منصب کے تقاضے بھول کر کیا کیا باتیں کرنے پر آجاتے ہیں! یہی کتاب جس کے بارے میں ابھی آپ نے پڑھا کہ اس پر ایک صاحب کو اعتراض ہوا کہ اس میں یہ کیسے لکھدیا گیا کہ "غالب گمان یہ ہے کہ وہ (یزید) کوئی بڑا متقی، پرہیزگار نہیں تھا۔" اور یہی کتاب جس میں مصنف حضرت حسینؓ کے عزیزوں، ہمدردوں اور خیر خواہوں کی وہ منتیں، سماجتیں، وہ فہمائشیں اور گزارشیں دیکھتے ہوئے جو آپ کے قصد کوفہ پر نظر ثانی کی طالب ہو رہی تھیں اور پھر یہ دیکھتے ہوئے کہ آپ اس وقت اگرچہ نہیں رکتے مگر ایک منزل پر راستے سے پلٹنے کا ارادہ فرماتے ہیں تو عجیب عجیب قسم کی رکاوٹیں حائل ہو جاتی ہیں اور پھر یہ دیکھتے ہوئے کہ آپ قضیہ ختم کرنے کے لئے از خود ایک مصالحانہ انداز میں یزید کے پاس چلے جانا چاہتے ہیں تو ابن زیاد کی بیجا ضد سدراہ ہو جاتی ہے (یہ سب دیکھتے ہوئے) اپنے آپ کو حیران و پریشان پاتا ہے کہ آخر ان تمام باتوں کی جو بظاہر نہیں ہونی چاہئے تھیں کیا توجیہہ کرے، اور پھر اس وقت جا کر اسے اطمینان کا سانس نصیب ہوتا ہے جب امام ابن تیمیہؒ کے یہاں اس کی توجیہہ اسے نظر پڑتی ہے، جو قارئین نے سب سے آخری باب (۱۲) میں پڑھی ہو گی (کہ یہ سب اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے انہیں شہادت کا مرتبۂ بلند دینے کی غیبی تدبیر تھی) اِسی کتاب کے بارے میں مذکورہ تبصرہ نگار نے لکھا کہ :

"کتاب کا مفترضہ تحقیقی نتیجۂ بحث (HYPOTHESIS) یہ ہے کہ یزید ایک مسلمان، خدا ترس، پاک سیرت، خلیفۂ برحق تھا............اور اس کے مقابلے میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ ایک ناعاقبت اندیش، شہنشاہیت کے طالب، بلاوجہ اپنے جان گنوانے والے شخص تھے۔"

کتاب کے کسی ایک جملے کا بھی سہارا لئے بغیر، کسی ایک حسبِ مطلب لفظ کی بھی نشاندہی کئے بغیر، یہ خالص افترا پردازانہ "نتیجۂ بحث" اس کے ذمے ڈالنے پر بھی تبصرہ نگار کی رگِ شیعیت سکون نہیں پا سکی۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر اس نے یہ بھی کہہ ڈالا کہ یہ حضرتِ حسینؓ کی مخالفت کے پردے میں دراصل رسول اللہ ﷺ سے عناد و عداوت کا اظہار ہے:

"وہ لوگ جو رسول اللہ ﷺ سے دل صاف نہیں رکھتے اور نہ ہی آپؐ سے بیزاری و کراہیت ظاہر کرنے کی جرأت رکھتے ہیں۔ وہ اس راستے سے اپنے دل کا بخار

نکالتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب مصطفیٰ ﷺ سے فرمایا:

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِیْ	ہم کو معلوم ہے کہ ان کی باتیں تم کو رنج
يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لاَ يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ	پہنچاتی ہیں۔ مگر یہ تمہاری تکذیب نہیں کرتے
الظّٰلِمِيْنَ بِآيَاتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ.	بلکہ ظالم خدا کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں۔

اسی طرح یہ لوگ سیدنا حسینؓ سے نہیں رسول اللہ ﷺ سے عناد کا اظہار کرتے ہیں۔"

یہ عبارت جو کبھی ایک دوسرے تنقید نگار نے ایک ایسے مصنف کے حق میں، اپنے برہم جذبات کے ماتحت لکھی تھی جس نے حضرت حسینؓ کی شہادت کو شہادت ماننے کے بجائے بغاوت کی شرعی سزا بتاتے ہوئے "قُتِلَ بِسَيْفِ جَدِّهٖ" (وہ تو اپنے نانا ہی کی تلوار سے قتل ہوئے) کے الفاظ استعمال کئے تھے۔ اسی عبارت کو یہ ہمارا تبصرہ نگار اس کتاب اور اس کے مصنف کے حق میں دوہرا رہا ہے جس میں کسی ایک لفظ تک کی نشاندہی بھی آج تک کسی ناقد کی طرف سے نہیں ہو سکی جو حضرت حسینؓ کی ادنیٰ شان کے بھی خلاف پڑتا ہو چہ جائیکہ (معاذ اللہ) ان سے عناد کا اظہار!(۱)

ہمیں یہ سمجھنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ کتاب کے بارے میں جو افترا پردازانہ بات تبصرے کے پہلے اقتباس میں ملتی ہے وہ افترا پردازی کی نیت ہی سے لکھی گئی ہے اور نہ ہی اس کے بعد والے مذکورہ بالا اقتباس کے حق میں یہ خیال ہے کہ یہ دانستہ طور سے محض مصنف کو بدنام کرنے کی ایک کوشش ہو۔ بلکہ یہ محض اس شیعیت کے جراثیم کی کارپردازی فی الواقع ہے جس کی رو سے حضرت حسینؓ وہ امام مامور من اللہ ہیں کہ ان کا قول وارشاد اللہ ورسول کا ارشاد ہے اور اس سے اختلاف اللہ ورسول سے جنگ وعناد۔ اور اس کتاب میں ظاہر ہے کہ حضرت حسینؓ کے حضرت معاویہؓ سے اختلاف اور پھر یزید سے اختلاف کا بیان اس شیعی عقیدے کی رعایت سے الحمد للہ بالکل خالی تھا۔ دوسرے فریق کی بات کو بھی سمجھنے کی کوشش کی گئی تھی اور حضرت حسینؓ کے اپنوں اور ہمدردوں نے آپ کی رائے سے جو اختلاف آپ کی خیر خواہی میں ظاہر کیا اسے بھی بیان میں لایا گیا تھا۔ اس لئے شیعیت کے جراثیم جس دل ودماغ میں پیوست ہوں اس کا ردعمل ایمانداری سے یہی ہونا چاہئے جو اوپر کے اقتباسات میں نظر آتا ہے۔ بلکہ اگر جرأت سے محرومی نہ ہوتی تو اس تبصرہ نگار نے کتاب کے مصنف سے بھی پہلے حضرت امام ابن تیمیہؒ کو ان تیروں کا نشانہ بنایا ہوتا۔ اس لئے کہ مصنف نے

---

(۱) صادر واقعہ یہ ہے کہ اصلاً جس مصنف کے حق میں یہ عبارت کسی نے لکھی تھی اس کی برہمی تو اس مصنف کے خلاف بجا تھی۔ مگر ان الفاظ میں اس برہمی کا اظہار قطعاً ناروا اور حدود شرعی سے قطعی تجاوز تھا۔ اللہ دونوں کو معاف فرمائے۔

تو کہیں نہیں لکھا کہ اس قضیے میں کون صحیح تھا کون غلط تھا۔ بلکہ فیصلہ قارئین پر چھوڑا۔ مگر امام ابن تیمیہ کا ایک اقتباس جو کتاب میں ضمناً آیا ہے اس میں انہوں نے حضرت حسینؓ کے موقف سے شرعا اختلاف کا اظہار بھی ان کو شہید بر حق ماننے کے ساتھ ساتھ لیا ہے۔ الغرض یہ حبِ حسینؓ کے قابل احترام پردے میں شیعیت ہے جو اس طرح کے ردّ عمل کو عین دین وایمان سمجھتی ہے۔

۷-اور اسی ضمن میں ایک خیال آتا ہے جس کے حوالے سے یہ مذکورۂ بالا حقیقت اور بھی روشن ہوتی ہے۔ وہ خیال یہ ہے کہ واقعۂ کربلا کو عام طور پر ہم سنیوں کے یہاں بھی ہر سال اس تصور کے ماتحت بطور ایک معرکۂ حق وباطل یاد کیا جاتا ہے کہ ایک فاسق وفاجر نے اسلامی تخت خلافت پر قبضہ کر لیا تھا جس سے اسے آزاد کرانے کی خاطر حضرت حسینؓ نے تلوار اٹھانے کی ٹھانی۔ مگر اسی میدان کا ایک اور مرد بھی، جس کا نام عبداللہ بن زبیرؓ ہے۔ جس نے یزید سے لیکر عبدالملک بن مروان تک کے اموی حکمرانوں کے خلاف بارہ برس تک تلوار چلائی۔ اور جب تک سر ہی تن سے جدانہ ہو گیا تلوار اس کے ہاتھ سے نہ چھوٹی۔ پر اس کی شہادت (جمادی الاولیٰ ۷۳ھ) کا دن آنے پر اسے اور اس کی معرکہ آرئیوں کو یاد کرنے کا دستور ہم نے کہیں نہیں دیکھا! اور پھر اسی کی معرکہ آرائیوں کے دور میں واقعۂ کربلا کے تین سال بعد وہ واقعۂ حرہ پیش آتا ہے جس میں بلا کسی اختلاف روایت کے یزید ہی کے حکم سے مدینہ منورہ (زادھا اللّٰہ تشریفا و تکریما) تاراج ہوا اور ساکنان مدینہ پر تین دن مسلسل قیامت ٹوٹی۔ مگر ہم نے نہیں دیکھا کہ جب وہ دن سال میں، عشرۂ محرم کی طرح، لوٹ کر آتے ہوں تو ان کی یاد میں بھی کوئی روتا ہو۔ اور ان دنوں کے حوالے سے بھی یزید کو فاسق و فاجر اور ملعون و مردود بتانے کے لیے جلسوں اور مجلسوں کا اہتمام ہوتا ہو! حالانکہ یہی وہ موقع تھا کہ اس کے حوالے سے یزید کو فاسق و فاجر وغیرہ کچھ بھی کہا جاتا تو اس کا جواز فراہم تھا۔ مگر وہ دن تو کسی کو بھی بھول کر یاد نہیں آتے۔ رہے شیعہ تو وہ کہاں اس کے یاد کرنے والے۔ اس سے تو ان کا کام بگڑتا۔ ہاں اگر حضرت علی بن الحسینؓ (زین العابدینؒ) کو خدانخواستہ اس قصے میں کچھ ہو جاتا تو بیشک یہ دن بھی محرم والا مقام پالیتے مگر ان کے بارے میں یزید کی اپنے کمانڈر کو سخت ہدایت تھی کہ کسی طرح کا گزند نہ پہنچے۔ سو الحمد للہ آپ عافیت سے رہے۔

پتہ نہیں ہم میں سے کتنے ہوں جو اس بہتر سالہ جواں مرد (عبداللہ بن زبیرؓ) کو کچھ ٹھیک سے جانتے بھی ہوں۔ وہ بذات خود کچھ کم صاحب فضائل آدمی نہ تھے۔ جہادی معرکوں سے تو کتاب

زندگی بھری ہوئی تھی ہی، ذوق عبادت کا بھی عالم یہ تھا کہ شہادت کی خبر پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بھی، جو ان کی یزید وغیرہ کے خلاف معرکہ آرائی کو پسند نہیں کرتے تھے "صدام و قوام" (شب زندہ دار اور دن کے روزہ دار) کے حوالے سے اظہار افسوس کیا ہے۔ رہا حسب و نسب تو باپ کی طرف سے آپ بیٹے تھے آنحضرت ﷺ کے پھوپھی زاد حضرت زبیر بن العوامؓ کے، جو حواری رسول کا لقب رکھتے تھے اور ان دس صحابہ میں سے ایک تھے جنھیں جنت کی بشارت ملی۔ اور ان کی طرف سے حضرت اسماء بنت ابی بکر الصدیقؓ کی اولاد، جو بنت صدیق ہونے کے علاوہ "ذاتُ النطاقین" کا وہ لقب بھی رکھتی تھیں جس سے آنحضرت ﷺ کے سفر ہجرت کی ایک خاص یاد وابستہ ہے۔ مردِ میدان ہونے کا عالم یہ تھا کہ بہتر سال کی عمر میں بھی بالکل اکیلے رہ جانے کے باوجود دشمن کی فوج قابو پانے سے عاجز تھی۔ اور اس لئے جب یہ شیر مرد پتھروں کی چوٹ کھا کر گرا۔ اور پھر دشمن قابو پا سکا تو یہ اتنی بڑی کامیابی دشمن کو لگی کہ نعرۂ تکبیر بلند ہوا۔ یاد آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر نے جب یہ تکبیر سنی اور وجہ معلوم ہوئی تو فرمایا کہ یہی وہ تھا جس کی پیدائش پر بھی مدینے میں تکبیر بلند ہوئی تھی۔ کیونکہ مہاجرین کے گھر میں یہ پہلی پیدائش تھی۔ اور غیر معمولی خوشی کا سبب یہ تھا کہ یہود مدینہ نے یہ شہرت دے رکھی تھی کہ اُن کے عاملوں نے مہاجر ماؤں کے رحم بند کر دئے ہیں۔

الغرض یہ تھے عبداللہ بن زُبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما جو ہمیں یزید دشمنی کے حوالے سے بھی کبھی یاد نہیں آتے۔ پھر بھی خبردار جو ہمیں شیعیت کا عیب لگایا، خبردار جو قصے کہانیوں سے پردہ اٹھایا۔

ع طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا

☆☆☆

اشاریہ

(INDEX)

نوٹ

یہ اشاریہ ہمارے محبّ و مہربان جناب قطب الدین ملّا صاحب (بیلگامی) کی محنتِ شاقّہ کا نتیجہ ہے۔ موصوف نے تو مذکورہ بالا عنوانات سے کہیں زیادہ عنوانات کے ماتحت مواد مرتب کیا تھا مگر ہمیں بس نہایت ضروری پر اکتفا کرنا پڑا۔

اشخاص

---

(۱) ان کے بارے میں تحقیق نہیں ہو سکی۔ بعض قرائن سے گمان ہے کہ شاید یہ ولید بن عقبہ ابی معیط ہیں، قرائن کے لئے دیکھئے الاصابہ۔ (ابن حجر)

مقامات و ممالک

(ا)، (ب)، (پ)، (ت)، (ث)

(ج)، (ح)، (خ)

(د)، (ذ)، (ر)، (ز)

۳-اقوام۔ طبقات۔ قبائل مسالک۔ فِرَق

(ا)

(ب)

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

۴۔ اہم متفرقات

بیعت، جنگیں، خروج، شرائط مصالحت، شہادت و قتل، صلح و فتح، ولیعہدی

☆☆☆

کتابیات

وہ کتابیں جن کا کوئی حوالہ اس کتاب میں دیا گیا ہے

۱- القرآن المجید

(الف)

۲-الاصابہ فی تمییز الصحابہ (عربی) از ابن حجر عسقلانی
۳-اسپرٹ آف اسلام (انگریزی) از جسٹس امیر علی

(ب)

۴- البدایہ والنہایہ (عربی) از حافظ ابن کثیر دمشقی

(ت)

۵- تاریخ ابن خلدون (عربی) از عبدالرحمٰن بن محمد بن خلدون
۶- تاریخ طبری (عربی) از ابو جعفر بن جریر طبری
۷- تاریخ کامل (عربی) از ابن اثیر
۸- تقریب التہذیب (عربی) از حافظ ابن حجر عسقلانی

(ج)

۹- جامع ترمذی (عربی) از امام ابو عیسیٰ محمد ترمذی

(ح)

۱۰- حیاۃ الامام الحسینؓ از باقر شریف قرشی
۱۱- حضرت معاویہ اور تاریخی حقائق (اردو) از مولانا محمد تقی عثمانی

(خ)

۱۲- خلاصۃ الکلام (عربی) شیخ زینی دحلان
۱۳- خلافت و ملوکیت (اردو) سید ابوالاعلیٰ مودودی
۱۴- خلافت معاویہ و یزید (اردو) محمود احمد عباسی

(د)

۱۵- الدرر السنیہ (عربی) از شیخ زینی دحلان

(ر)

۱۶- روح اسلام (اردو) از محمد ہادی حسن
۱۷- رجوم المدنیین از مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

(س)

۱۸- سنن ابوداؤد (عربی) از امام ابوداؤد سجستانی
۱۹- سیر اعلام النبلاء (عربی) از حافظ ذہبی

(ش)

۲۰- شرح نہج البلاغۃ (عربی) از ابن حدید
۲۱- شہید انسانت (اردو) سید علی نقی صاحب مجتہد
۲۲- شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ان کے خلاف پروپیگنڈہ (اردو) ـــــ از مولانا محمد منظور نعمانی

(ص)

۲۳- صحیح بخاری (عربی) از امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ
۲۴- صحیح مسلم (عربی) از امام مسلم قشیریؒ

(ع)

۲۵- العواصم والقواصم (عربی) از ابوبکر بن العربی

(ف)

۲۶- الفاروق (اردو) از مولانا شبلی نعمانی
۲۷- فتح الباری (عربی) از حافظ ابن حجر عسقلانیؒ

(ل)

۲۸- لسان المیزان (عربی) از حافظ ابن حجر عسقلانی

(م)

۲۹- مروج الذہب (عربی) از المسعودی
۳۰- مشکوٰۃ المصابیح (عربی) از خطیب تبریزی
۳۱- مصنف عبدالرزاق (عربی) از ابوبکر بن عبدالرزاق
۳۲- المعارف (عربی) از ابن قتیبہ
۳۳- معجم البلدان (عربی) از احمد بن یعقوب
۳۴- مقتل الحسینؓ (عربی) از عبدالرزاق موسوی المقرم
۳۵- مقدمہ ابن خلدون (عربی) از ابن خلدون
۳۶- منہاج السنۃ (عربی) از امام ابن تیمیہؒ
۳۷- مؤطا (عربی) از امام مالکؒ
۳۸- میزان الاعتدال (عربی) از حافظ ذہبی
۳۹- نہج البلاغۃ (عربی) از شریف الرضی

☆☆☆

یہ کتاب

ہندوستانی پاکستانی مبصرین کی نظر میں

''اردو تصنیفات میں تحقیق کی ہمیشہ شدید کمی محسوس کی گئی ہے۔ اور اگر اس تحقیق کا تعلق اسلامی تاریخ کے ایک ایسے المناک واقعہ سے ہو جس کے اندوہناک اثرات تنازع، اختلاف اور تشدد آمیز ردعمل کی صورت میں رونما ہوئے ہوں تو اس کی ضرورت اور اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ مولانا عتیق الرحمٰن نے اپنی اس تصنیف میں، جسے اُن کے وسیع مطالعہ کا شاہکار کہنا چاہئے، اِس علمی ضرورت کو پورا کیا ہے۔'' ....

''مولانا عتیق الرحمٰن کی کتاب فکر انگیز، پُر از معلومات اور تاریخ پر مبنی ہے۔ کربلا کے واقعہ پر تحقیق کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔'' (یونیورسل میسیج۔ کراچی۔ بابت جولائی ۹۲ء سے ترجمہ)

''اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اصحاب رسولؐ کے سلسلہ میں اُمّت کے اجماع عقیدۂ احترام و اعتبار کو قارئین کے ذہنوں میں راسخ کرانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے، اور یہی وہ ایک خدمت ہے جو انشاء اللہ اجرِ اُخروی سے خالی نہ ہوگی، کیونکہ واقعہ کربلا جیسے اہم نزاعی اور ہنگامہ خیز و ہنگامہ پرور عنوان پر قلم اٹھانے کے بعد ''سبائی اور خارجی'' دونوں فکروں سے دامن بچا کر اہلسنت کی معتدل فکر کو اپنا کر نباہ دینا، اور مقام صحابیت کے سلسلہ میں بنواُمیہ و بنوہاشم کے درمیان تفریق نہ برتنا، اور یک چشمی و کور باطنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بنوہاشم سے اظہار عقیدت کے لیے بنواُمیہ کو، یا بنواُمیہ سے اظہار عقیدت کے لیے بنوہاشم کو مطعون کرنے کی غیر معتدل بلکہ غیر اسلامی فکر سے عافیت کے ساتھ دامن بچا لے جانا ہی ایک بہت اہم اور لائق مبارک باد کارنامہ ہے''۔

(ماہنامہ البدر کاکوری، لکھنؤ۔ بابت اپریل ر مئی ۹۲ء)

''واقعہ کربلا اسلامی تاریخ کا ہمیشہ ایک نازک مسئلہ بنا رہا اس لیے اس پر قلم اٹھانا بڑا نازک بلکہ تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ اس لیے کہ یہ مسئلہ دو انتہاؤں کے درمیان ایک راہ اعتدال قائم کرنے کے ہم معنی ہے، اور جب کسی مسئلہ کے سلسلے میں دو انتہاؤں کے ماننے والوں نے اپنی بات کو حقیقت سمجھ لیا ہو تو پھر درمیانی راہ اختیار کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے .... مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نے اس کتاب میں تلوار کی دھار پر چلتے ہوئے بھی اپنے قلم کو بڑی حد تک انتہا پسندی سے بچائے رکھا ہے۔''

(ماہنامہ الرشاد اعظم گڑھ۔ بابت اپریل ۹۲ء)

''فاضل مصنف نے دو انتہاؤں کے درمیان ایک ایسی راہ اعتدال تک پہنچنے کی کوشش کی ہے جس سے نہ کسی صحابی رسولؐ کے کردار پر حرف آئے اور نہ بے جا تعصب سے کام لیا جائے۔ وہ یقیناً اس کوشش میں کامیاب رہے ہیں۔''

(ماہنامہ تدبّر لاہور۔ بابت مئی ۹۲ء)

DESIGNED BY FAISAL WAQAR

PRINTED AT : KAKORI OFFSET PRESS, LKO. PH. : 262961[illegible]